مختلف مضامین
۱۰

علّامہ نصیرالدّین نصیر ہونزائی

کے ٹرانسکرائب لیکچرز

تمہید

استادِ بزرگوار علامہ صاحب قبلہ نے اپنی صد سالہ عمرِ گرانمایہ میں اپنی زبانِ فیض بار اور قلمِ جواہر نگار سے کتابوں کے علاوہ آڈیو لیکچرز کی صورت میں ایک بیش بہا خزانہ عالمِ انسانیت کے لئے عطا کیا ہے۔ اِن لیکچرز کی اہمیت کے حوالے سے آنجناب خود فرماتے ہیں:

''ہمارے کیسٹوں میں جو تقاریر ہیں وہ بنیادی اور اساسی مواد کا کام دیں گے، یعنی اُن سے اسماعیلی مذہب پر ریسرچ میں بڑی مدد مل سکتی ہے۔ میرے نزدیک ہر کیسٹ کا مواد ایک کتابچہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس میں بڑی اہم باتیں ریکارڈ ہوئی ہیں۔ کیسٹوں کے قیمتی مواد کو محفوظ کر لینا ضروری ہے، کیونکہ یہ ہماری پیاری جمعیت کی دولت ہے، یہ ہمارے علمی سرمایے کا ایک اہم حصّہ ہے، اور ہم کو یقین ہے کہ مستقبل میں ہمارے ان علمی کاموں کی قدر و قیمت میں اضافہ ہونے والا ہے، ہماری تحریروں کے ایک ایک پُرزے پر ریسرچ ہوگی، کیونکہ ہماری نگارشات میں امامِ عالیمقامؑ کی نورانیت و روحانیت براہِ راست کارفرما ہے''۔ (غیر مطبوعہ)

استادِ گرامی قبلہ کی اِس روشن ہدایت کے پیشِ نظر اِن گرانمایہ دُرّ و مرجان کو ضبطِ تحریر میں لانے کا انتہائی اہم اور دقیق کام استاد بحر العلوم صاحب کی سرپرستی میں شروع کیا گیا ہے۔ اور آپ نے اِس سلسلے میں خانۂ حکمت کے تمام سینٹرز میں جا کر اس کام کی اہمیت کے حوالے سے آگاہی اور رہنمائی فرمائی ہے اور ناچیز کو اِن لیکچرز کو تحریر میں لانے اور منظم کرنے کی ذمہ داری دی ہے اس سلسلے میں کئی احباب انتہائی جانفشانی سے کام کر رہے ہیں۔ ان خزائن کو جماعت اور دنیائے انسانیت تک پہنچانے کے لئے محترم مصطفیٰ مومن صاحب نے اسے (ebook) کی صورت میں پیش کرنے میں ہماری مدد فرمائی ہے۔

ناچیز نسرین اکبر

مختلف مضامین ۔ ۳

فہرستِ مضامین

نمبر شمار	مضمون	لیکچر نمبر	صفحہ نمبر
۱	انسان کائناتی درخت کا پھل ہے، امامت سے متعلق چند قرآنی آیات	۲۱	۱
۲	قرآن اور اماموں کے ناموں میں نسبت (نقوشِ حکمت، ص۔۳)	۲۲ الف	۱۵
۳	قرآن اور اماموں کے ناموں میں نسبت (نقوشِ حکمت، ص۔۳)	۲۲ ب	۲۴
۴	صراطِ مستقیم اور اس کی چار منزلیں، ہر چیز دائرے میں	۲۳	۳۲
۵	علم حقیقی کی اہمیت، پیغمبروں کو ناحق قتل کرنے کی تاویل	۲۴	۴۵
۶	روح خدا کی قدرتِ کاملہ اور عالمِ خواب	۲۵	۵۴
۷	عالمِ خواب اور خواب کا ردِ عمل	۲۶	۶۷
۸	روحانی سلطنت اسماعیلیوں کی میراث	۲۷	۸۲
۹	روح اور روحانیت	۲۸	۹۷
۱۰	مومن کی صلاحیتیں، قصہ آدم کی چند تاویلات	۲۹	۱۰۷
۱۱	مقالہ: تین (۳) اعلیٰ سوال	۳۰ الف	۱۲۳
۱۲	مقالہ: تین (۳) اعلیٰ سوال	۳۰ ب	۱۳۷

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی[ق س] کا پُرحکمت بیان

عنوان: انسان کائناتی درخت کا پھل ہے، امامت سے متعلق چند قرآنی آیات اور اُن کی تشریح

[(۱۲:۳۶)(۲۴:۲۵)(۲۳:۲۱)(۱۲:۹)(۴۱:۲۸)]

کیسٹ نمبر: ۲۱   تاریخ: ۳۔۱۱۔۱۹۷۸، کراچی

Click here for Audio

ہم یہ چاہتے ہیں کہ کچھ علم کی باتیں ہوں تو اِس کے لئے آج ایک درخت کا نقشہ آپ کے سامنے آئے گا۔ درخت اِس کائنات میں بجائے خود ایک کتاب ہے درخت کی بہت بڑی اہمیت ہے دنیاوی طور پر بھی اور دینی طور پر بھی، دنیاوی طور پر درخت کی جو کچھ اہمیت ہے وہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ مادّی طور پر درخت کے کیا کیا فائدے ہوتے ہیں، دُنیا کی آبادی کا دارومدار درخت پر ہے۔ بہشت میں بھی درختوں کے ہونے کا ذکر ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ دین کی مثال درخت سے دی گئی ہے، دین کے اندر جو بڑی بڑی چیزیں ہیں اُن کو اُصول قرار دیا گیا ہے۔ اُصول کے معنی درختوں کی جڑیں اور دُوسرے درجے کی جو چیزیں ہیں دین میں اُن کو فُروع کہا گیا یعنی درخت کی شاخیں تو آپ جانتے ہیں اُصولِ دین اور فُروعِ دین، اُصولِ دین کے معنی جہاں دین کی مثال، دین کی تشبیہہ ایک درخت سے دی گئی ہے وہاں پر اُس دین کے درخت کی جڑیں اُصولِ دین ہیں اور اُس دین کے درخت کی شاخیں فُروعِ دین ہیں تو دیکھا آپ نے کہ درخت کی کیا اہمیت ہے۔ اِس کے علاوہ دُنیا میں جو درخت ہے ایک ہوشمند اُس کو پڑھ سکتا ہے، درخت ہی کو کتاب کے طور پر پڑھ سکتا ہے، اُس کا مطالعہ کرسکتا ہے اور درخت کی اِس کتاب کے پڑھنے میں بہت سی حکمتیں ہیں بہت سی فضیلتیں ہیں۔ اگر چہ یہ کائنات بذاتِ خود ایک کتاب ہے جس طرح کہا جاتا ہے کہ صفحۂ کائنات پر یہ تحریر ہے یا کہ یہ ثبت ہے تو کائنات کے کتاب ہونے میں کوئی شک نہیں۔

قرآن میں بھی اِس کے اشارے ہیں کہ کائنات میں خدا کی آیتیں ہیں، لیکن اِس عظیم اور عریض اور وسیع کائنات کو کس طرح پڑھیں؟ لہٰذا بہتر تو یہ ہے کہ کائنات کے اندر جو قریب کی چیزیں ہیں اُن کی (Study) کی جائے تو اُن میں سے ایک بہترین چیز درخت ہے۔ ابھی میں آپ کے سامنے درخت کے پڑھنے کا ایک اُصول پیش کرتا ہوں یعنی یہاں پر جو کچھ لکھا گیا ہے اِس کے بیان کرنے سے پیشتر میں یہ عرض کرنا مناسب سمجھتا ہوں کہ درخت کو کس طرح پڑھا جائے، درخت کو اِس طرح سے پڑھا جائے کہ درخت کے دو حصّے ہیں۔ درخت کا ایک حصّہ زمین کے نیچے چھپا ہوا ہے اور ایک حصّہ ظاہر ہے

[یعنی] سطح سے اُوپر ہے۔ یہ مثال ہے کہ ہر چیز اِسی طرح سے ہے انسان خود بھی اِسی طرح ہے انسان کی ایک حیثیت چھپی ہوئی ہے انسان کا ایک پہلو پوشیدہ ہے جس کو باطن کہا جاتا ہے، جس کو رُوح کہا جاتا ہے، جو رُوحانیت ہے، جو آخرت کی زندگی ہے اور انسان کا دُوسرا پہلو نمایاں ہے ظاہر ہے وہ اُس کی شخصیت ہے وہ اُس کا جسم ہے۔ تو سب سے پہلے درخت ہم کو یہ سکھاتا ہے کہ ہر چیز کے دو حصّے ہیں یا کہ ہر چیز کی دو حیثیتیں ہیں، ایک حیثیت اُس کی پوشیدہ ہے اور دُوسری حیثیت اُس کی نمایاں ہے تو درخت ہم کو سب سے پہلے یہ سبق دیتا ہے۔

درخت ہم کو دُوسرا (Lesson) یہ دیتا ہے کہ [کسی] چیز کا جو پوشیدہ حصّہ ہے وہی اصل ہے اور [کسی] چیز کا جو نمایاں حصّہ ہے وہ (Depend) کرتا ہے اُس کے پوشیدہ حصّے پر، جس طرح کہ درخت کا تنا اور اُس کی تمام شاخیں (Depend) کرتی ہیں جڑوں پر اور جڑوں ہی سے تنے کو اور شاخوں کو قوت ملتی ہے، غذا مہیّا ہوتی رہتی ہے دُوسرا (Lesson) ہم کو درخت نے یہ دیا۔

تیسرا (Lesson) یہ ہے کہ ہر چیز میں اگر ایک پہلو سے انتشار ہے تو پھر دُوسرے پہلو سے اُس میں اتحاد بھی ہے یعنی ہر چیز کی دو کیفیتیں ہیں، دو حیثیتیں ہیں۔ ایک طرح سے دیکھا جائے تو وہ چیز منتشر ہے اور پھر دُوسری طرف سے دیکھا جائے تو وہ چیز متحد ہے، جس طرح کہ درخت تنے میں متحد ہے، شاخوں میں اور جڑوں میں منتشر ہے اور اِس کے یوں ہونے میں حکمت ہے۔ اگر [درخت] ہمیشہ کے لئے متحد رہے اور اُس میں انتشار نہ ہو، جیسا کہ تنا تو اُس سے کچھ بھی نہیں بنے گا نہ پھل پیدا ہوگا نہ زمین سے کوئی قوت حاصل کی جاسکے گی۔ اِسی طرح حدود دِین ہیں اور دین کے لشکر ہیں امامؑ کے کام کرنے والے ہیں، رُوحیں ہیں، کائنات ہے، خدا کی بادشاہی ہے۔ تو اِس خدا کی بادشاہی کا ایک مرکز بھی ہے اور پھر اِس کی شاخیں بھی ہیں یعنی اِس میں کثرت بھی ہے اور وحدت بھی ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ اِس میں اتحاد بھی ہے اور انتشار بھی ہے اور صرف انتشار ہو تو کچھ نہیں ہو سکے گا اور صرف اتحاد ہو تو کچھ نہیں ہو سکے گا تو اِس میں انتشار بھی چاہئے اور اتحاد بھی چاہئے یہ سبق ہم کو درخت نے دیا۔

ایک اور چیز جو بہت اچھی ہے، ہم دیکھتے ہیں کہ درخت پر دو حالتیں گزرتی ہیں ایک خزاں، موسمِ سرما جس کو پت جھڑ کہتے ہیں یعنی پتے جھڑ جانے کا موسم اور دُوسرا موسمِ بہار، تابستان تو درخت دو مثالیں پیش کرتا ہے ایک فنا کی اور ایک بقا کی، ایک امیری کی اور ایک غریبی کی، فنا سے مُراد یہ ہے کہ موسمِ سرما میں، جاڑوں کے موسم میں درخت جو ہے وہ غریب ہو جاتا ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ وہ مر جاتا ہے اور موسمِ بہار میں یہ ہرا بھرا ہو جاتا ہے گویا زندہ ہو جاتا ہے۔ تو اِس مقام پر درخت سے ہم کو یہ سبق ملتا ہے کہ ہر چیز پر دو حالتیں گزرتی ہیں کہ کبھی وہ چیز مر جاتی ہے اور کبھی زندہ ہو جاتی ہے، کیونکہ مزا دونوں میں ہے اور چیز مری ہی رہے اور مرتی [ہی] رہے اور فنا کے سمندر میں ڈوبی رہے تو کوئی مزا نہیں ہے اور ہمیشہ جیتی رہے اور زندہ رہے تو بھی

کوئی مزا نہیں، تو کبھی وہ ہونا چاہئے کبھی یہ ہونا چاہئے۔ جس طرح کہ موسمِ سرما کے بعد جب موسمِ بہار آتا ہے تو ایک نئے لباس سے درخت آراستہ ہو جاتا ہے، اُس میں نئی کلیاں لگتی ہیں اور نئے پھول آتے ہیں اور نئے پھل پیدا ہوتے ہیں، اِسی طرح انسان بھی کبھی مر جاتا ہے تو کبھی زندہ ہو جاتا ہے۔ تو اِسی طرح خزاں اور بہار کا سلسلہ چلتا رہتا ہے یہ درخت سے ہم کو سبق ملا۔

اِس کے علاوہ ایک اور اچھا (Lesson) ہے درخت میں، وہ کیا ہے؟ ہم نے دیکھا کہ درخت میں پھل ہے اور پھل میں درخت ہے۔ درخت میں پھل ہے یہ تو بات مسلّمہ ہے سب جانتے ہیں لیکن پھل میں درخت کس طرح ہے؟ وہ اِس طرح سے کہ جس طرح درخت سے پھل اور اُس میں گٹھلی پیدا ہوتی ہے یعنی اُس کے اندر مغز ہے جو درخت کو اُگانے کی طاقت ہے اِسی طرح اُس گٹھلی کے اندر ایک چھوٹا سا درخت سویا ہوا ہے۔ تو اِس سے ہم سمجھ گئے کہ انسان جو اِس کائناتی درخت کا پھل ہے اُس میں اِس کائنات کو اُگانے یا پیدا کرنے کی قوت موجود ہے۔ میں نے جو کہا کہ انسان اِس کائناتی درخت کا پھل ہے وہ کس طرح؟ دیکھیں! دُنیا میں بہت ساری چیزیں پیدا ہوتی ہیں اور اِن تمام چیزوں کے نتیجے میں جو گرانقدر چیز پیدا ہوتی ہے وہ انسان ہے۔ مثلاً جمادات کے بعد اُگنے والی چیزیں ہیں جن کو نباتات کہا جاتا ہے، پھر حیوانات ہیں اور آخر میں انسان ہے یعنی دُنیا کی تمام چیزوں کے استعمال سے اور اِن کے سَر کرنے سے انسان بنتا ہے۔ تو اِس معنی میں مَیں نے کہا کہ جہاں کائنات ایک درخت کی طرح ہے وہاں انسان پھل کی طرح ہے۔ اِس کائناتی درخت کا پھل انسان ہے، انسان ہی کو پیدا کرنے کے لئے اور انسان ہی کو حاصل کرنے کے لئے خدا نے اِس کائنات کے درخت کو لگایا ہے اور خدا نے اِس کائنات کے درخت کو اِس لئے لگایا ہے کہ اُس میں سے انسان کے نام سے ایک پھل پیدا ہو جائے۔

<u>جب اِس معنی میں انسان اِس کائناتی درخت کا پھل ہے</u> تو انسان کے اِس پھل کے اندر اِس کائنات کو اُگانے کی قوت موجود ہے، یہ (Lesson) ہم نے کہاں سے سیکھا؟ ہم نے اِس باغ کے چھوٹے سے درخت سے سیکھا کہ درخت کے اندر جو بیج ہے جو گٹھلی ہے اُس میں درخت ہے اُسی سے وہی درخت پیدا ہو جاتا ہے۔ تو اِس لئے میں نے کہا کہ ہم آپ میں سے ہر ایک کے اندر اِس کائنات کو پیدا کرنے کی ایک قوت موجود ہے اور اُس کی تفصیل یہ ہے کہ انسان کی ترقّی نفسِ کُلّ تک ہے، (Universal Soul) تک ہے اور نفسِ کُلّ وہ ہے جس نے اِس کائنات کو پیدا کیا۔ اِس کے معنی یہ ہوئے کہ جب ایک انسان، ایک مومن نفسِ کُلّ کے درجے پر فائز ہو جائے گا تو وہ خالقِ کائنات بن جائے گا اور جب خالقِ کائنات بن جائے گا تو اُس وقت وہ ایک کائنات کو پیدا کرے گا۔ یہ بات صرف منطقی [ہی] نہیں ہے بلکہ حقیقی اور قرآنی بھی ہے، خدائے جلیل و جبّار نے حدیثِ قدسی کے انداز میں رسولؐ کی زبانِ مبارک سے ارشاد فرمایا ہے کہ: یَابْنِیْ اٰدَمَ اَطِعْنِیْ اَجْعَلْكَ مِثْلِیْ حَیًّا لَا تَمُوْتُ وَ عَزِیْزًا لَا تَذِلُّ وَ غَنِیًّا لَا تَفْتَقِر ، اے ابنِ آدم! میرا کہا مان تا کہ میں تجھ کو اپنی مانند بنالوں گا، ایسی حیاتِ جاویدانی عطا کروں گا کہ تو کبھی نہ مرنے والا بن جائے گا، ایسی عزت عطا کروں گا کہ تو کبھی ذلیل نہ ہوگا، ایسی

امیری بخشوں گا کہ تو کبھی غریب نہیں بنے گا، یہ ہوا مومن کا خدا سے مل کر خدا بن جانا۔ یہ بحث ذرا طویل ہے اِس لئے کہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ مومن خدا سے مل کر خدا کا جزو بن جائے گا یا ایک نیا خدا بن جائے گا یا یہ کہ خدا اُس پردے کو ہٹائے گا کہ جس کے ہٹانے سے بندۂ مومن کو یقین آئے گا کہ بندۂ مومن ازل سے یعنی ہمیشہ سے خدا کے ساتھ مل کر ایک ہے۔ یہ دو سوال سامنے آتے ہیں یعنی پہلے مرحلے پر تو ہم نے یقین کرلیا کہ یہ حدیثِ قدسی صحیح ہے اور سب مانتے ہیں کہ مومن کو خدا کے ساتھ ملنا ہے واصل ہوجانا ہے، اصل میں واصل ہوجانا ہے، فنافی اللہ ہوجانا ہے، کئی معنوں سے مانا جاتا ہے کہ بندۂ مومن کی رُوح خدا سے مل جاتی ہے لیکن کس صورت میں اور کس طرح سے؟ یہ سوال ہے، آیا یہ خدا کے ساتھ مل کر ایک خدا کا جزو ہوجاتا ہے یا ایک نیا خدا بن جاتا ہے، یا یہ کہ خدا کا جزو بننا ناممکن ہے اور دُوسرا خدا بن جانا بھی ناممکن ہے۔ لہٰذا یقیناً یہی بات ہے اور یہی حقیقت ہے کہ انسان کی حقیقت خدا کے ساتھ ہمیشہ سے ایک ہے اور اِس صورتِ حال یا کہ اِس حقیقتِ حال سے پردے کا اُٹھانا یوں ہے جیسا کہ خدا نے ہم کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ تو بہرحال درخت کے ایک (Lesson) کی تشریح کرتے کرتے ہم دُوسرے (Point) کی طرف چلے گئے اور وہ تشریح یہ تھی کہ درخت کے اندر یہ بات بھی ہے کہ جو کائناتی درخت کا پھل ہے یعنی انسان اُس میں کائنات کو پیدا کرنے کی قوت پوشیدہ ہے یہ بات ہے۔

تو بہرحال میں نے تو تمہید کے طور پر درخت کی اہمیت کے سلسلے میں کچھ باتیں بتائیں اصل جو موضوع ہے وہ کچھ اِس سے الگ ہے وہ یہ کہ قرآنِ مقدّس کے اندر بارہ (۱۲) آیتوں میں امامت کا ذکر ہے۔ آپ کو تعجّب ہوگا جو میں نے کہا کہ بارہ آیتوں میں امامت کا ذکر ہے، ایسا نہیں ہے۔ لفظِ امام بارہ دفعہ قرآن میں آیا ہے، ویسے تو قرآن کی کوئی آیت امامت کے موضوع سے خالی نہیں ہے، اگر قرآن کی آیتیں ۶۶۶۶ ہیں تو اُن میں سے ہر آیت کے اندر امامت کے تصوّر کا ذکر ہے، اسماعیلی مذہب کی تعریف وتوصیف ہے۔ لیکن اِس کے علاوہ قرآن کے اندر بارہ مرتبہ لفظِ امام جمع اور واحد کے صیغوں میں آیا ہے، لہٰذا ہم نے (Diagram) بنایا ہے [جس میں] اُن بارہ آیتوں کا (Reference) دیا ہے اور ایک درخت بنایا ہے جس کے اندر لفظِ امامت کی وضاحت کرنے کے لئے اُن بارہ آیتوں کا تھوڑا تھوڑا (Reference) دیا ہے (کتاب: نقوشِ حکمت، ص: ۳۷)۔

اب میں اِن بارہ آیتوں کی تھوڑی سی وضاحت کرتا ہوں گو کہ اِس پر ایک کتاب بھی لکھی گئی ہے جو امام شناسی کے نام سے ہے۔ امام شناسی کے حصّۂ اوّل میں یا حصّۂ دوم میں اِن آیتوں کا تذکرہ کیا گیا ہے، وہ ذرا لمبی چوڑی چیز ہے۔ مَیں چاہتا ہوں کہ مختصر طریقے سے آپ کو اِن آیتوں کا تھوڑا تھوڑا فلسفہ یا کہ تھوڑی تھوڑی حکمت بیان کروں۔ مَیں کس سرے سے شروع کروں، چلو جو اُوپر چوٹی پر شاخ ہے اُس میں جو آیت لکھی گئی ہے اُس سے شروع کروں، سب سے اُوپر لکھا گیا ہے وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ (۳۶:۱۲)۔ یہ آیت اتنی مشہور ہے کہ اسماعیلیوں کا بچہ بچہ بھی اِس کو جانتا ہے اور اِس کے جو مختصر معنی ہیں وہ بھی آپ کو معلوم ہے، وہ یہ کہ وَكُلَّ شَيْءٍ اَحْصَيْنٰهُ فِيْٓ اِمَامٍ مُّبِيْنٍ (۳۶:۱۲) اور ہم نے ہر چیز خواہ وہ

رُوحانی ہو یا مادّی ہر چیز امامِ مبین کی ذات میں محدود کر رکھی ہے۔

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ امامؑ ایک انسانِ کامل کا نام ہے، امام ایک شخصیت کا نام ہے، امام ایک ہستی کا نام ہے، امام ایک ذات کا نام ہے اور وہ ذات شخصیت میں ہے۔ تو کس طرح یہ ممکن ہے کہ کائنات کی ہر چیز امامؑ کی شخصیت میں محدود ہو؟ امام جب کہ ایک شخصیت ہے، امام جب کہ ظاہر میں ایک انسان ہے، ایک ہستی ہے جو خود اِس کائنات کے اندر محدود ہے تو [یہ] کس طرح ممکن ہے کہ اِس عظیم کائنات کی ہر چیز امامؑ میں محدود ہو؟ یہ ایک سوال ہے لیکن کوئی سوال اُس وقت کرتا ہے جب کہ جواب موجود ہو، یہ سوال اِس لئے بھی اُٹھا ہے کہ ہمارے عزیزوں میں سے اکثر یہ خیال کرتے ہیں کہ اِس آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہر علمی اور رُوحانی چیز امامؑ میں محدود ہے اور اِس میں چاند، سورج، آسمان، زمین، سمندر، پہاڑ اور ہر چیز کا ذکر نہیں ہے، کچھ لوگ ایسا خیال کرتے ہیں، کچھ اسماعیلی ایسا تصوّر رکھتے ہیں۔ لیکن یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے جب کہ یہاں کھلم کھلا فرمایا گیا ہے وَكُلَّ شَيْءٍ اور ہر چیز، خدا نے یہ نہیں کہا کہ رُوحانی چیزیں، خدا نے یہ نہیں فرمایا کہ علمی چیزیں، خدا نے حد نہیں بتائی، خدا نے کُلّی طور پر فرمایا۔ خدا نے ہر چیز کے لئے فرمایا تو ٹھیک ہے یہی صحیح ہے۔ ہر چیز خواہ وہ مادّی ہو یا رُوحانی، آسمان بھی، زمین بھی، سورج بھی، چاند، ستارے کوئی چیز امامؑ کے نور کے احاطے سے باہر نہیں ہے، امامؑ کا نور ہر چیز پر محیط ہے، امامؑ کی عقل ہر چیز پر حاوی ہے۔

دیکھیں! کسی چیز کے حاوی ہونے کے کئی معنی ہیں [جیسے] مادّی طور پر حاوی ہونا۔ اب اِس وقت یہ کمرہ یہ ہال، یہ جماعت خانہ ہم پر حاوی ہے، ہم سب جتنے بھی ہیں اِس کے اندر سموئے ہوئے ہیں، ہم اِس کی دیواروں میں محدود ہیں اور اِس جماعت خانے نے ہم کو گھیر لیا ہے اور ایک محیط ہونا یہ ہے کہ ایک کمانڈر ہے یا کوئی بادشاہ ہے یا کوئی صدر ہے وہ (Public) پر رعایا پر محیط ہے احاطہ کرنا اِس طرح سے بھی ہے۔ ایک شخص ہے، کوئی (Engineer) ہے، کوئی (Pilot) ہے اور کوئی ہنر مند ہے وہ اپنے ہنر پر محیط ہے اِس طرح سے بھی ہے، اِس کے علاوہ سورج کو دیکھیں کتنا بڑا ہے وہ بڑا تو ہے لیکن کائنات اُس سے بھی بڑی ہے اور سورج نے اپنی روشنی کے اندر ہر چیز کو ڈبو لیا ہے، گھیر لیا ہے۔ سورج کی جو شخصیت ہے وہ بھی اُس کی روشنی میں ڈوبی ہوئی ہے یعنی سورج کی جو ضخامت ہے، جو جسامت ہے، جو اُس کی مقدار ہے وہ بھی روشنی میں غرق ہے اور کائنات کی ہر چیز۔ اِسی طرح امامؑ کے نور نے اِس کائنات کو گھیر لیا ہے اِس معنی میں اور اِس کے علاوہ چیزیں تو تین قسم کی ہوتی ہیں یہ یاد رکھیں بہت اچھا اُصول ہے، عقلی چیزیں، رُوحانی چیزیں اور مادّی چیزیں۔ چیزیں تین قسم کی ہیں، تو اِن تین قسم کی چیزوں کو امامؑ کے نور نے گھیر لیا ہے۔ اب اگر تھوڑی سی نور کے بارے میں وضاحت کرنی ہے تو نور بھی تین قسم کا ہے وہ مادّی ہے اُس کے اُوپر رُوحانی ہے اُس کے اُوپر عقلی ہے، جو عقلی ہے وہی اصلی ہے اور وہی اعلیٰ اور افضل ہے۔ تو خداوندِ عالم کے اِس ارشاد کے مطابق امامؑ کے نور نے ہر چیز کو گھیر لیا ہے اور ایسا ہونا چاہئے، مادّی طور پر ہم دیکھتے ہیں،

مادّی طور پر بھی یہی بات ہے کہ ایک بڑی چیز میں تمام چیزیں سموئی ہوئی ہوتی ہیں۔

مثلاً آپ آسمانوں کے تصوّر کو مانیں اور اِس آسمان کے تصوّر کے سلسلے میں ایک بڑے آسمان کو ماننا پڑے گا جس کو فلک الافلاک کہا جاتا ہے [یعنی] آسمانوں کا آسمان اور قدیم حکماء کے نزدیک آسمان کا تصوّر اِس طرح سے ہے جیسے پیاز کے پردے ہیں یا اُن کو چھلکے کہیں کہ وہ اندر سے اندر چھوٹے سے چھوٹے ہوتے چلے جاتے ہیں اور باہر سے باہر پیاز کے چھلکے بڑے سے بڑے ہوتے چلے جاتے ہیں اور سب سے باہر کا جو پردہ ہے اُس نے تمام پیاز کے چھوٹے چھوٹے پردوں کو گھیر لیا ہے۔ اِسی طرح جو فلک الافلاک ہے آسمانوں کا آسمان اُس نے اِس پوری کائنات کو گھیر لیا ہے، اور نفس کُلّ نے یعنی (Universal Soul) نے اِس پوری کائنات کو اپنے اندر سمو لیا ہے اور عقلِ کُلّ نے نفس کُلّ بمائے کائنات اپنے اندر گھیر لیا ہے۔ اُس کی مثال ہماری شخصیت میں پائی جاتی ہے، ہمارے جسم کو رُوح نے گھیر لیا ہے، رُوح نے سنبھالا ہے، رُوح نے جسم کو قائم رکھا ہے، رُوح ہی اِس کو چلاتی ہے اور عقل رُوح پر حاوی ہے، عقل نے رُوح کو اپنے اندر سمو لیا ہے، رُوح نے جسم کو اپنے اندر سمو لیا ہے، حالانکہ رُوح کو ہم نہیں دیکھتے ہیں لیکن رُوح خول کی طرح، غلاف کی طرح [ہے]، ہم رُوح کے خول میں ہیں، رُوح کے غلاف میں ہیں۔

ایک اچھی بات مَیں بتاؤں جو سائنسی ہے جو جدید انکشاف ہے۔ آج کل سائنسدانوں نے (Aura) کا پتا لگایا ہے (Aura) انگریزی لفظ ہے۔ اِسے (Aura) یعنی ہالہ کہتے ہیں کہ ہر شخص کا (Aura) ہوتا ہے، کبھی آپ نے تھوڑے سے ہلکے سے بادلوں کے اندر جو چاند، کامل چاند ہوتا ہے اُس کے گرد اگرد ایک ہالہ کو دیکھا ہے۔ میں نہیں سمجھتا ہوں کہ لفظ ہالہ آپ سب جانتے ہیں اور شاید جانتے ہوں گے مجھے معلوم نہیں کہ گجراتی میں یا سندھی میں اِس ہالہ کو کیا کہتے ہیں، اِس کو انگلش میں (Aura) کہتے ہیں، فارسی اور اردو میں ہالہ کہتے ہیں، ایک حلقہ ہوتا ہے ایک (Ring) سا ہوتا ہے یعنی روشنی کا [ہالہ] لیکن یہ اُس وقت نظر آتا ہے جب کہ تھوڑے تھوڑے بادل بھی ہوں، کبھی یہ سورج کے گرد اگرد بھی ہوتا ہے اور کبھی چاند کے گرد اگرد ہوتا ہے اِس کو کہتے ہیں ہالہ اور جس کو انگلش میں (Aura) کہتے ہیں۔ اچھا! آیئے اِس مثال کے بعد اصل مطلب کی طرف، میں عرض کر رہا تھا کہ آج کل سائنسدانوں نے یہ انکشاف کیا ہے کہ ہر انسان کا نورانی ہالہ ہوتا ہے، (Aura) ہوتا ہے تو (Aura) کیا ہے؟ وہ ایک نکاس ہے، (Flaming) ہے، روشنی ہے، شعلہ ہے کس کا؟ رُوح کا جو گرد اگرد پڑتا ہے تو مطلب اِس کا یہ ہوا کہ گو کہ رُوح کا تعلّق اور گرفت اور لگاؤ شخصیت سے ہے اور وہاں سے جو شعلہ نکلتا ہے اُس شعلے میں انسان چھپا ہوا ہے۔ اِس معنی میں ہم نے جو کہا کہ ہمارے گرد اگرد رُوح کا غلاف ہے وہ صحیح ہے، ہماری ہستی اتنی سی ہے، ذرّے کی طرح ہے اور ہماری رُوح ہم سے بڑھ کر ہے اور ہم اپنی رُوح کے غلاف میں اپنی رُوح کے (Aura) کے اندر رہتے ہیں۔ اچھا! چلو مان لیا اور پھر اِس کے اُوپر ماننا پڑے گا کہ عقل کا (Aura) ہے جو اُس سے وسیع ہے، رُوح کا

(Aura)عقل کے(Aura)کے اندر ہے اور جسم رُوح کے(Aura)کے اندر یہ بات ہوگئی۔ پھر اِس کائنات کی بھی ایک رُوح ہے اُس کو کہتے ہیں عالم گیر روح(Universal Soul)اِس معنی میں یہ جو کائنات ہے یہ ایک آدمی کی طرح ہے اِس کو شخص کبیر کہا جاتا ہے، بڑا انسان، ہم آپ چھوٹے انسان ہیں، یہ دُنیا اور کائنات بڑا انسان ہے، تو اُس کی بھی ایک رُوح ہے، جب اُس کی ایک رُوح ہے تو اُس کا بھی ایک(Aura)ہے وہ نفس کُلّ ہے۔

تو یہ کائنات نور کے اندر ڈوبی ہوئی ہے، اپنے (Aura) کے اندر ڈوبی ہوئی ہے۔ تو اِس کائنات کی رُوح کے (Aura) کے اُوپر عقل کا (Aura) ہے، اِس معنی میں قرآن نے کہا کہ: رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا (۴۰:۷) خدایا! پروردگارا! تو نے علم اور رحمت میں ہر چیز کو سمو دیا ہے۔ علم، عقل اُوپر۔ رحمت، رُوح نیچے۔ تو میں نے شاید اِس کا بھی ایک (Diagram) بنایا ہے وہ یہ ہے، اِس میں آپ کو تین دائرے نظر آتے ہیں سب سے باہر کا جو دائرہ ہے وہ عقل کا (Aura) ہے، اُس کے بعد رُوح کا (Aura) ہے اور اُس کے بعد جسمانی کائنات ہے (کتاب: نقوشِ حکمت، ص: ۱۳)۔

مَیں اِس چیز کی وضاحت کر رہا ہوں کہ کس طرح امامؑ کے نور میں ہر چیز سموئی ہوئی ہے اُس کی وضاحت کر رہا ہوں اور اگر آیات چاہئیں تو میں آپ کو بتاؤں [ارشادِ باری تعالیٰ ہے]: وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (۲:۲۵۵) خدا کی کرسی نے کائنات کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔ لیکن اب یہ سمجھنا کہ کرسی کیا چیز ہے، کرسی یہ کرسی! [جس پر] آپ ہم بیٹھتے ہیں، یہ نہیں۔ کرسی (Dais)، کرسی (Stage)، کرسی چبوترا، آپ نے قصّہ کہانی میں یا کسی طرح سے آپ نے دیکھا اور آپ نے ماشاء اللہ امامؑ کی امامت کی مثال میں دیکھا ہے، پنڈال میں دیکھا ہے کہ ہموار زمین پر (Dais) بنایا جاتا ہے اور (Dais) پر تخت ہے تو (Dais) جو ہے وہ کرسی ہے اور تخت جو ہے وہ عرش ہے۔ تین چیزیں ہوگئیں، ہموار زمین پر (Dais) اور (Dais) پر تخت تو وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ (۲:۲۵۵) مطلب یہ ہوا کہ خدا کی جو کرسی (Dais) ہے، خدا کی جو نفس کُلّی ہے اُس نے اِس کائنات کو اپنے اندر سمو لیا ہے۔ ہمارے یہاں بھی ایک ہموار زمین ہے، ایک اُس پر (Dais) ہے، ایک اُس پر تخت ہے، ہموار زمین ہمارا جسم، (Dais) رُوح، تخت عقل، تو عقل سب سے اُوپر ہے، تخت سب سے بلند ہے لیکن اِس میں دنیاوی اور مادّی کرسی اور رُوحانی کرسی میں فرق ہے، [جس طرح] دنیاوی تخت اور رُوحانی تخت میں فرق ہے۔ رُوحانی کرسی اِس طرح سے ہے، یہاں جس طرح ایک دائرے نے دُوسرے دائرے کو اپنے اندر سمو لیا ہے اور سب سے باہر کا جو دائرہ ہے اُس نے تمام دائروں کو [اپنے اندر] سمو لیا ہے، سب سے باہر جو دائرہ ہے وہ عرش ہے اور اِس کے بعد اندر کا دُوسرا جو دائرہ ہے وہ کرسی ہے اور اُس کے بعد تیسرا چھوٹا جو دائرہ ہے اِن دونوں دائروں کے اندر وہ کائنات ہے۔

اِسی طرح امامؑ کی عقل عقلِ کُلّ، امامؑ کی رُوح (Universal Soul)، تو امامؑ کی عقل نے عقلِ کُلّ کی حیثیت

سے اِس کائنات کو اپنے اندر سمولیا ہے اور ہر چیز کو سمولیا ہے ۔ یہ تو بہت لمبی چوڑی وضاحت ہے، ابھی تک ہم نے صرف ایک آیت کی وضاحت کی لیکن میں چاہتا ہوں کہ کچھ مختصراً آپ کو بتاؤں اور درمیان درمیان سے بتاؤں وہ یہ کہ ایک آیت ہے: رَبَّنَا هَبْ لَنَا مِنْ اَزْوَاجِنَا وَذُرِّيّٰتِنَا قُرَّةَ اَعْيُنٍ وَّاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ اِمَامًا (۲۵:۷۴) یہ کچھ مومنین کی دُعا ہے ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو خود اماموں کی دُعا ہے، دُوسرے لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ مومنین کی دعا ہے اور یہ دُعا ایسی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اے پروردگار! ہمیں ہماری بیویوں سے اور ہماری ذرّیت سے آنکھوں کی ٹھنڈک دے دینا اور ہمیں پرہیزگاروں کا امام بنا دینا، یہاں پر امامت کے لئے دُعا مانگی گئی ہے ۔ظاہر میں دیکھا جائے تو اِس آیت کا تعلّق صرف اماموں سے ہے کہ یہ اُن ہی کی شان ہے کہ اُن کی نسل میں اُن کی ذرّیت میں امامت چلتی چلے اور اُن کی اولاد میں سے امام قائم رہے ۔لیکن کچھ دُور تک دیکھا جائے اور امامؑ کی عنایتوں کو اور اُس کی مہربانیوں کو پیشِ نظر رکھا جائے اور امام کے فرامین کو دیکھا جائے تو عجب نہیں کہ کسی زمانے میں مومن بھی امامؑ سے مل کر امام ہو جائے ۔جب کہ کچھ منٹ پہلے یہاں پر ایک حدیثِ قدسی کی روشنی میں [یہ بات] بتائی گئی تھی کہ انسان خدا سے مل کر خدا بن سکتا ہے، تو یقینی بات ہے اور بات آسان ہوگئی راستہ مختصر ہوگیا کہ جب انسان خدا سے مل کر خدا ہوسکتا ہے تو کیا اِس میں یہ بات ممکن نہیں کہ [وہ] امامؑ سے مل کر امام ہو جائے ۔

یہ وہ دُعا ہے کہ آگے آگے چل کر مومن بھی اپنی آنے والی نسل میں امامؑ بن سکتا ہے، یہ بات بڑی جرأت مندی کی بات ہے ۔ چونکہ اِس کا (Background) ہے، چونکہ یہاں پر بہت سی دلیلیں ہیں، نہیں تو معلوم نہیں کیا سمجھا جائے گا کسی کی جرأت ہوگی یا نہیں ہوگی کہ ایسی باتیں بھی کرے لیکن اس کی کوئی بات نہیں ہے ۔جب منصورؒ ''اناالحق'' کہتا ہے اور جب امام کہتا ہے کہ آخری تصوّر مونو ریلزم ہے، جب امام فرماتا ہے کہ: تم میری طرح ہو کے یہاں آنا ۔تم پنجتن کی طرح ہوسکتے ہو، سلمان سے بھی آگے بڑھ سکتے ہو (کچھ مندرا، ۲۸۔۱۱۔۱۹۰۳) ۔تو رُوحانی ترقّی کے لئے کوئی رکاوٹ نہیں ہے ۔مومن بہت آگے بڑھ سکتا ہے لیکن ذرا دُور کی بات ہے کیونکہ خدا کی بادشاہی کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے، زمانہ ایسا نہیں ہے کہ اُس کا خاتمہ ہو جائے زمانہ تو ہمیشہ سے ہے تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں اور انسان کی رُوح جو ہے وہ مرنے کے لئے نہیں ہے اور اگر موت ہے تو وہ بھی عارضی ہے، جس طرح ابھی ابھی درخت کی مثال میں، مَیں نے عرض کی تھی کہ موت ایک لحاظ سے دیکھا جائے [تو] موسمِ خزاں کی طرح ہے، موسمِ سرما کی طرح ہے لیکن موسمِ سرما کچھ دائمی تو نہیں ہے، کچھ وقت کے لئے ہے اور پھر وہ درخت زندہ ہو جاتا ہے ۔مری ہوئی زمین بھی دوبارہ زندہ ہو جاتی ہے، اسی طرح موت اگر ہے، زوال اگر ہے، پسماندگی اگر ہے تو وہ بھی وقتی ہے، مومن کی رُوح زوال کے لئے، موت کے لئے نہیں پیدا کی گئی ہے وہ تو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے قائم و دائم رہنے کے لئے پیدا کی گئی ہے ۔ اِس لئے یہ بات بہت ممکن ہے اور یہ دُعا

صحیح ہے کہ کسی سیارے پر اِسی زمین پر یا کسی اور زمین پر اِس کائنات کے اندر کتنی زمینیں بنتی چلی جاتی ہیں اور کتنی زمینیں مٹتی چلی جاتی ہیں، تو جس طرح انسان پیدا ہوتے ہیں اور مرتے چلے جاتے ہیں اِسی طرح سیارے پیدا ہوتے ہیں اور کئی کئی (Million) سالوں بعد سیارے بھی مٹائے جاتے ہیں لیکن خدا کی خدائی کبھی ختم نہیں ہوتی ہے: كُلُّ شَيۡءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجۡهَهٗ (۲۸:۸۸)۔ ہر چیز فنا ہوتی چلی جاتی ہے لیکن خدا کی ذات فانی نہیں ہے، اُس کو فنا نہیں ہے، خدا کی ذات ہمیشہ قائم رہنے کے لئے ہے تو مومن کا بھی ایک (Link) خدا کے ساتھ ہے اور جہاں مومن کا (Link) یعنی تعلّق، نسبت، لگاؤ خدا کے ساتھ ہے اُس لگاؤ میں مومن ہلاک نہیں ہوتا، مومن اِس شخصیت میں ہر وقت ہلاک ہوتا رہتا ہے لیکن جہاں خدا کے ساتھ اِس کا رشتہ ہے، جہاں اِس کی ایک انا، انائے علوی خدا میں ہے وہ کبھی فنا نہیں ہوتی ہے۔

اِس معنی میں ہر چیز اگر فنا ہوتی ہے تو کیا ہوا خدا کی ذات تو باقی ہے ہر چیز اگر فنا ہوتی ہے تو کیا ہوا مومن کا لگاؤ خدا کے ساتھ ہے، مومن کا رشتہ خدا کے ساتھ ہے۔ مومن خدا میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے زندہ ہے تو اِس کو فنا کا کوئی غم نہیں۔ اِس معنی میں یہ بہت بڑی بشارت اور خوش خبری ہے کہ امامت کے اِس ذکر کے ساتھ ساتھ مومنین کا بھی ذکر ہے۔ ایسی ہی آیت اور میں آپ کو بتلاؤں: وَجَعَلۡنَاهُمۡ اَئِمَّةً يَّهۡدُوۡنَ بِاَمۡرِنَا (۲۱:۷۳)۔ اِس آیت کے دو پہلو ہیں یہ بنی اسرائیل کے بارے میں ہے کہ بنی اسرائیل میں امام تھے اور دُوسرا پہلو اِس کا یہ ہے کہ بحیثیتِ مجموعی بنی اسرائیل سے کہا جاتا ہے کہ میں نے بنی اسرائیل کو امام بنایا۔ اِس کا مطلب یہ نہیں کہ گھر گھر میں ایک ایک امام تھا امام تو ایک ہی ہوتا ہے لیکن اُس امام سے مُریدوں کی جو وابستگی ہوتی ہے اور امام جو مُریدوں کا نمائندہ ہوتا ہے اور امام جو مومنین کی جان کی حیثیت سے ہوتا ہے، اُن کی اصل رُوح کی حیثیت سے ہوتا ہے اِس معنی میں امامت مومنین کے لئے ہے۔ مثلاً آج دُنیا میں اسماعیلیوں کی امامت ہے چونکہ امام اُن کا ہے چونکہ امام اُن کا رُوحانی باپ ہے، جب ہمارے باپ امام ہیں تو ہم امام ہیں، تو امامت ہمارے گھر میں ہے اور ہمارے سب سے معزز اور سب سے باعزت گھر میں ہے ہم اُس کے روحانی بچے ہیں۔

قرآن ہی یہ تصوّر دیتا ہے بنی اسرائیل میں ایک امام ہونے کی نسبت سے اُن سب کو خدا فرماتا ہے کہ ''ہم نے اُن کو امامت دی'' (۲۱:۷۳)۔ دنیاوی طور پر بھی کسی قوم کو کوئی صدارت، حکومت، سلطنت ملتی ہے تو وہ فخر سے کہتے ہیں کہ آج حکومت ہمارے ہاتھ میں ہے، صحیح ہے! اگر وہ صحیح بولتے ہیں تو یہ اُس سے بڑھ کر زیادہ صحیح ہے کہ آج امامت اسماعیلیوں میں ہے اور کائنات کی رُوحانی سلطنت اسماعیلیوں میں ہے، اِس لئے اسماعیلی خوش نصیب ہیں انہیں شکر گزار رہنا چاہئے۔ ایک آیت میں ہے: فَقَاتِلُوۡۤا اَئِمَّةَ الۡكُفۡرِ اِنَّهُمۡ لَاۤ اَيۡمَانَ (۹:۱۲) کہ مسلمانو! تم کفر کے سرداروں سے لڑو، کفر کے اماموں سے لڑو کیونکہ اُن کے لئے قسم کی کوئی اہمیت نہیں ہے، اِس میں یہ فلسفہ ہے کہ اگر کفر اور کافری سرداری کے بغیر نہیں ہوتی ہے

اور اگر کافروں کا بھی کوئی امام ہے یعنی سردار ہے اور کفر بھی خود از خود نہیں ہوتا جب تک کہ اُس کے لئے کوئی سردار نہ ہو جب تک کہ اُس کا کوئی پیشوا نہ ہو تو پھر دین اور ایمان کس طرح چل سکتا ہے، دین اور ایمان جو نہایت ہی قیمتی شئ ہے یہ خود از خود کس طرح ہو سکتا ہے اِس کے لئے امام کی ضرورت ہے۔

قرآن کے اندر (Direct) اور (Indirect) حکمتیں ہیں، (Indirect) سے میری مُراد یہ ہے کہ اگر خدا یہ فرماتا ہے کہ: کافروں کا بھی ایک سردار ہے (۱۲:۹) تو زبانِ حکمت سے وہ یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ مومنوں کا تو ہمیشہ کے لئے سردار ہے۔ جب کفر کا دارومدار کافروں کے سردار پر ہے اور سب کچھ وہی کرتا ہے تو اِس سے ظاہر ہے کہ ایمان بھی خود از خود کامل اور مکمل نہیں ہو سکتا ہے جب تک کہ ایمان [کے لئے] امام نہ ہو۔ ایک مثال میں آپ کو بتاؤں اگر کافروں کے درمیان بڑی بڑی ہستیاں نہ ہوں اور بڑے بڑے سردار نہ ہوں تو وہ کافر نہیں ہو سکیں گے۔ اِس کی مثال کچھ ایسے وحشی لوگوں کو لیں مثلاً افریقہ کے اندر کچھ لوگ ہیں وہ نہ تو کافر ہیں نہ مسلمان ہیں، وہ مویشیوں کی طرح ہیں، تو کیا مویشی بھی کچھ کافر ہوتے ہیں یا کچھ مسلمان ہوتے ہیں؟ یعنی سردار یا تو لوگوں کو اچھے سے اچھا بناتا ہے یا اُن کو بُرے سے بُرا بناتا ہے جو کچھ کرتا ہے سردار کرتا ہے، خواہ سردار کافروں کا ہو خواہ سردار مومنوں کا ہو تو اِس سے امام کی امامت کی اہمیت بڑھ جاتی ہے اور ہم کو یہ منطق ملتی ہے کہ سردار کی کیا اہمیت ہے۔ دُوسری مثال فرض کریں کہ دُنیا میں جب بڑے بڑے ظالم اور شیطان لوگ نہیں تھے تو لوگ کیا کرتے تھے درختوں کی پُوجا کرتے تھے، سورج کی پُوجا کرتے تھے وہ ڈرتے تھے [کیونکہ] انسان کے اندر فطری طور پر ڈر ہے، وہ ڈر کے مارے کسی کی پرستش کرتے ہیں کسی کو دیوا اور دیوی مانتے ہیں لیکن جب شریف لوگ پیدا ہو گئے اور انہوں نے ایسے غلط تصوّرات بنائے تو اُن کے نتیجے پر لوگوں میں کفر اور کافری کی ہمّت اور جرأت آ گئی یہ سب کافروں کے سرداروں نے کیا۔ اِس سے ظاہر ہے کہ انسان خود از خود کچھ بھی نہیں ہے وہ مال مویشی کی طرح ہے جب تک کہ اُس کا کوئی رہنما نہ ہو، رہنما ہی اُس کو جس سمت لے جانا چاہے لے جا سکتا ہے۔

تو مطلب یہ تھا کہ جہاں کافروں کے سردار ہوتے ہیں جس دُنیا میں اس دنیا میں مومنوں کے سردار بھی ہوتے ہیں، اِس جیسی دوسری آیت یہ ہے: وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ (۴۱:۲۸) ہم نے کافروں میں سے کچھ لوگوں کو ایسا بنایا جو کہ وہ آتش دوزخ کی طرف دعوت کرتے تھے، جہنم کی طرف بلانے والے بھی ہم نے مقرّر کئے۔ اِس سے ظاہر ہوتا ہے جہاں خدا نے جہنم کی طرف بلانے والوں کو مقرّر کیا ہے جس دُنیا میں اُس دُنیا میں اُس نے ضرور جنّت کی طرف دعوت کرنے والوں کو بھی بنایا ہے [یعنی] امام اور اُس کے حدود کو بنایا ہے۔ تو میں یہ کوشش کرتا ہوں کہ آپ کو یہ تصوّر دوں کہ آپ نہ صرف (Direct Method) سے قرآن سے حکمت سمجھیں بلکہ (Indirect) طور پر بھی قرآن سے اِن مطالب کو اخذ کریں کہ اُس میں امام کی تعریف ہے۔ مثال کے طور پر میں نے اپنی تحریروں میں یہ بھی لکھا ہے [جس میں] شیطان

سے مثال لی ہے حالانکہ شیطان کا ذکر کرنا لوگوں کے نزدیک بہت عیب بات ہے یا اُن کو ڈر لگتا ہے لیکن خدا نے جب قرآن کے اندر شیطان کا بار بار ذکر کیا ہے تو اِس میں بھی حکمت ہے اور سب سے بڑی حکمت شیطان کے پس منظر میں ہے۔

دُنیا میں کوئی کسی خزانے کو چھپانا چاہتا ہے تو وہ دیکھتا ہے کہ لوگ کہاں سے بھاگیں گے اور کس طرف لوگ زیادہ رُجوع کریں گے تو خزانہ اُس جگہ میں رکھتا ہے جہاں سے لوگوں کا گزر کم ہو۔ تو شیطان کے پس منظر میں بھی بڑی بڑی حکمتیں ہیں اِس معنی میں میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ شیطان لوگوں کے دلوں میں وسوسہ ڈالتا ہے، شیطان لوگوں سے باتیں کرتا ہے، شیطان لوگوں کو گمراہ کرتا ہے۔ ٹھیک ہے اِس سے کوئی انکار نہیں ہے، لیکن آپ سوچیں کہ خدا جس کی صفت عدل ہے، عدل جس کو پسند ہے جو انصاف چاہتا ہے اگر اُس نے دُنیا میں شیطان ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رکھا ہے جو مُضّل ہے گمراہ کر دینے والا، تو کیا عقل اِس بات کو قبول کرے گی کہ ہادیٔ برحق موجود نہ ہو کبھی غائب ہو کبھی حاضر ہو اور دُنیا ہادیٔ برحق سے کبھی کبھی خالی بھی رہے، جب کہ بُرائی کی طرف جو بُرائی کا سرچشمہ ہے اُس کو خدا نے بحال رکھا ہے۔ اُس کو اتنا (Power) دیا ہے کہ وہ دُور بیٹھے اپنے لوگوں کے دل میں وسوسہ اور بُرا خیال ڈال سکتا ہے، اُن سے باتیں بھی کر سکتا ہے۔ یہ انصاف نہیں ہے کہ ہم ایک طرف سے بات کو مانیں بلکہ انصاف یہ ہے اور یہ بات ہم کو اِس حکمت کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ جس طرح شیطان ہمیشہ ہے جو مُضّل ہے گمراہ کر دینے والا اِسی طرح ہادیٔ برحق بھی اُس کے مقابلے میں ہمیشہ ہمیشہ دنیا میں حیّ و حاضر ہے ایک بات۔ دُوسری بات جس طرح شیطان (Powerful) ہے کہ وہ لوگوں سے بات کر سکتا ہے اُن کے دل میں بُرے خیالات ڈال سکتا ہے اِسی طرح اُس کے مقابلے میں ہادیٔ برحق کو بھی یہ (Power) [حاصل] ہے کہ وہ اپنے دوستوں کے دل میں ہدایات کی روشنی ڈالیں اُن سے بات کریں اُن سے کلام کریں اُن کو توفیقات سے نوازیں، خدا کی خدائی اور اُس کا انصاف ایسا ہونا چاہئے۔ میں نے اپنے اقوال میں جگہ جگہ خصوصاً سوسوال کی کتاب میں اور امام شناسی میں اِس کا ذکر کیا ہے، تو بہرحال ابھی آپ تھک جائیں گے اِس میں بہت سی آیتیں باقی ہیں اور پھر اِس کا چارٹ بنا کر آپ کو دے دیں گے اور آپ اس کو دیکھ لینا (Study) کرنا یہ ایک اچھی چیز ہے ابھی آپ کو دیکھنے کے لئے بھی دیتے ہیں اور میرے خیال میں ہم ذرا رُکیں گے کیونکہ آپ تھکے ہوئے ہیں۔

سوال: آنحضرت نے کہا بھی ہے اور دُوسری ایک نعت میں بھی یہ کہا جاتا ہے جب بی بی فاطمۃ الزہراؑ نے آپ سے پوچھا کہ سب سے پہلے عورتوں میں کون جنّت میں جائیگی۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ ایک لکڑہارے کی بیوی جائیگی اُس کے بعد تم آؤ گی اور وہ جو ہے رسّی کے ساتھ پکڑ لے گی اور تم اُس پر سوار ہو جاؤ گی۔ اِس طریقے سے تم دونوں جنّت میں داخل ہو جاؤ گی اور وہ تم سے پہلے جنّت میں جائیگی۔ یہاں پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا آج تک حضرتِ موسیٰؑ کی ماں، بی بی مریم، زلیخا، بی بی ہاجرہ وہ ساری خواتین کہاں گئیں اور اُن کا کیا مقام ہے اور آج تک جتنے مرے ہیں وہ کہاں ہیں؟ کیا عالمِ

برزخ کے بارے میں جو بتایا جاتا ہے کہ تا قیامت وہ عالمِ برزخ میں رہیں گے اور صرف مسلمانوں کے لیے جنّت بنائی گئی ہے تو دُنیا میں جتنے انسان موجود ہیں جو اچھے لوگ مریں گے کیا اُن کو جنّت نہیں ملے گی؟ یہ میرا سوال ہے۔

آپ کا سوال بڑا اہم ہے لیکن جہاں تک میرا علم کام کرتا ہے اُس کے مطابق یہ ایک روایت ہے اور مستند کتابوں میں اِس سلسلے کا ذکر ہے، وہ کچھ اِس کے برعکس ہے وہ یہ کہ آنحضرتؐ نے فاطمۃ الزّہراؑ کو بہت بڑی فضیلت دی ہے اور بہت بڑی اہمیت دی ہے اور خصوصاً اُس وقت کہ حضرت عائشہ کے حوالے سے آنحضرتؐ نے اپنے آخری وقت میں فاطمہؑ سے کچھ کہا تو اُس وقت فاطمہؑ رونے لگیں یہ سرگوشی کے انداز میں تھا اور پھر دُوسری کوئی بات کہی تو پھر ہنسنے لگیں اور عائشہ نے جب اُن سے پوچھا کہ: آپ اپنے ابّا سے کچھ سرگوشی کی کچھ باتیں کرتیں تھیں پہلے آپ رونے لگیں پھر آپ ہنسنے لگیں اِس میں کیا بات ہے؟ تو فاطمہؑ کہنے لگیں کہ: میں اِس لئے رو رہی تھی کہ رسولِ خداؐ فرماتے تھے کہ بہت کم وقت رہا ہے کہ میں دُنیا سے رُحلت کرنے والا ہوں تو اُس پر مجھے رونا آگیا، جب انہوں نے فرمایا کہ سب سے پہلے ہمارے خاندان [میں] سے تم ہی آ کر مجھ سے ملو گی تو اُس پر میں ہنسی۔ یہ بہت ہی معتبر کتاب کی بات ہے اور اِس کے علاوہ جن کی شان میں آیۂ تطہیر (۳۳:۳۳) نازل ہوئی ہو اور جس کے اندر پانچوں حضرات کی پاکیزگی کا ذکر ہے کہ وہ پاکیزگی میں مساوی ہے اور جب آپ جانتے ہیں کہ پاکیزگی کے کیا معنی ہیں، پاکیزگی [کے معنی ہیں] دُنیا کی جہالت، عیب، کمزوری اور ہر چیز سے پاک و پاکیزہ ہونا ہے، تو اِس لئے حضرت فاطمہؑ کا جو مرتبہ ہے وہ بہت ہی اعلیٰ اور افضل ہے اور اب رہی روایت تو روایت ہوتی رہتی ہے اور معلوم نہیں کس کتاب کی روایت ہے، زبانی زبانی میں نے بھی یہ بات سنی ہے اور میں اِس کو اِس طرح (Accept) نہیں کرتا ہوں، ہوگی روایت لیکن ایک اسماعیلی کی حیثیت سے میں پنجتن کو دُنیا کے سب انسانوں سے افضل ترین قرار دیتا ہوں۔

واضح طور پر لکڑ ہارے کی بیٹی کے سلسلے میں کوئی بھی بات ہے کوئی نیکی ہے تو دیکھئے یہ کہنے والوں کی مبالغہ [آرائی] ہے کہ اللہ تعالیٰ جو کسی کو کوئی مرتبہ عطا کرتا ہے امامت، نبوّت اور اِس ضمن کی کوئی مرتبت تو وہ ایک دُنیا کی نیکی کے برابر کس طرح ہو سکتی ہے وہ بہت بالا اور اعلیٰ چیز ہے۔ بعض دفعہ روایات بیان کرنے والے افراد یا راوی کسی چیز کو اِس قدر بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں کہ خود اہلِ ظاہر کو بھی اِس میں اعتراض ہے کہتے ہیں کہ اتنی سی چھوٹی سی نیکی کی اتنی بڑی فضیلت یہ کس طرح ممکن ہے؟ پھر تو دُنیا میں کوئی بس اعمال ہی نہ کرے وہی کرے جس کی اتنی فضیلت ہے، کیونکہ جو اُصول ہے اُس کو دیکھا جائے اُصول ٹوٹ جاتا ہے، وہ اُس وقت ٹوٹتا ہے جب ایک چھوٹی سی نیکی کی بڑی اہمیت بنتی ہے۔ ایسی مثالیں روایات میں آپ کو ملیں گی لیکن اُصولات میں یہ بات آپ کو نہیں ملے گی، اُصول یہ ہے کہ مرتبہ حاصل کرنے کے لئے بہت کچھ چاہئے اور اُصول یہ ہے کہ انبیاء اور اولیاء اور اہلِ بیتِ اطہار کی جو عظمت و بزرگی ہے وہ بہت بڑی ہے تو آپ کے

سوال کا جواب کچھ اِس طرح سے ہے۔

انہوں نے شیطان کے بارے میں سوال کیا کہ آیا شیطان خدا کا کوئی مدِّ مقابل ہے یا اِس کی ضد ہے یا اُس کا جزو ہے یا ایسا کوئی سرکش ہے، جس کو خدا نصیحت نہیں کرسکتا ہے یا اُس کو ختم نہیں کرسکتا ہے یا سکھا نہیں سکتا؟ انہوں نے یہ سوال کیا۔ اِس کے لئے جواباً گزارش ہے کہ شیطان خدا کی قدرت کے سامنے ایک حقیر سی مخلوق ہے، ایک حقیر سی مخلوق ہے، قرآن نے خود ہی فرمایا ہے کہ شیطان کا جو فریب ہے شیطان کا جو مکر ہے وہ بڑا کمزور ہے تو خدا شیطان کا مدِّ مقابل نہیں ہے، شیطان ایک مخلوق ہے، خدا کا مخلوق کی صف میں اُتر کر اُن کے ساتھ مقابلہ کرنا خدا کی شان نہیں ہے، خدا شیطان سے اور اُس کے مدِّ مقابل سے برتر ہے۔ شیطان بُرائی کا سرچشمہ ہے اور ہادیٔ برحق نیکی کا سرچشمہ ہے، یہ دو سرچشمے خدا کے بنائے ہوئے ہیں اور یہ دو سرچشمے ایک دُوسرے کے مخالف اور برعکس ہیں لیکن خدا نے [اِن کو] اپنی حکمت سے اور اپنے ارادے سے بنایا ہے، اپنے ارادے سے شیطان کو بنایا ہے اُس میں حکمت ہے لیکن اِس کے باوجود جو شیطان کی وجہ سے دُنیا میں بُرائیاں سرزد ہوتی ہیں یا جو لوگ گناہوں کے مرتکب ہوجاتے ہیں اُن کے گناہ کی وجہ سے خدا پر کوئی اعتراض، خدا کے فعل پر، خدا کی حکمت پر کوئی اعتراض نہیں آسکتا، اگر شیطان کے پیدا کئے جانے کے سبب سے خدا کی قدرت پر کوئی اعتراض آتا تو تب کوئی کہہ سکتا کہ شیطان کو کیوں پیدا کیا گیا۔ زہر دُنیا میں لوگوں کو ہلاک کرتا ہے لیکن عمدہ قسم کی جراثیم کُش دوائیاں بھی زہر ہی سے بنتی ہیں، اِسی طرح شرّ اگر دُنیا میں نہ ہوتا اور شرّ کا سرچشمہ نہ ہوتا تو جہاد نہ ہوتا، نفس اگر نہ ہوتا تو ثواب نہ ہوتا، محنت نہ ہوتی امتحان جب نہ ہوتا تو فضیلت بھی نہ ہوتی، یہ سامان ہے شیطان کے پیدا کئے جانے کا، مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم شیطان کی پیروی کریں بلکہ مقصود یہ ہے کہ ہم اُس سے بچیں۔

شیطان کو پیدا کیا گیا ہے لیکن ہزار بار یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ تو ہے لیکن اِس کی بات نہیں ماننا، جب خدا نے یہ کہا کہ شیطان کی بات نہیں ماننا تو گویا خدا نے دلیل سے اُس کو ہلاک کردیا، ہمیں نہیں چاہئے کہ خدا نے جس کو ہلاک کیا ہے اور زمین کے نیچے دفنایا ہے اُس کے پاس جائیں اُس کو کُریدیں، اُس کو نکالیں، اُس کو سونگھیں، اُس کو کھائیں، ہم کو نہیں چاہئے، خدا نے جس سے منع کیا ہے تو اُس کے قریب نہیں جانا چاہئے۔ شیطان ہے اِس میں کوئی شک نہیں شیطان نہ ہوتا تو پھر امام بھی نہ ہوتا، امام نہ ہوتا تو لوگ کیا کرسکتے ہیں؟ شیطان نہ ہوتا تو امتحان بھی نہ ہوتا، میدان بھی نہ ہوتا، جہاد بھی نہ ہوتا، نفس بھی نہ ہوتا۔ فرشتہ ہے اُس کی کوئی فضیلت نہیں ہے، حیوان ہے اُس کی کوئی فضیلت نہیں ہے، دیکھئے! مخلوق (As a Whole Team) ہے، حیوان، انسان، فرشتہ۔ انسان میں دُوہری قوتیں ہیں، حیوان میں ایک قوت ہے کہ اُس میں نفس ہے اور وہ بُرائی کی طرف کھینچا ہوا ہے، فرشتے میں بھی ایک ہی قوت ہے عقلی قوت ہے وہ بھلائی کی طرف کھینچا ہوا ہے۔ حیوان بُرائی کی طرف کھینچا ہوا ہے چونکہ اُس میں نفس ہے اِس لئے اُس سے امتحان نہیں ہے کیونکہ

اُس کو اختیار نہیں ہے۔ جب امتحان نہیں ہے تو فضیلت نہیں ہے اور فرشتہ جو کچھ ہے وہ نیکی ہے اور بجائے خود ٹھیک ہے لیکن اُس کی کوئی فضیلت نہیں ہے کیونکہ اُس کے سامنے کوئی امتحان نہیں ہے، اِس لئے کہ اُس کا نفس نہیں ہے اور شیطان ہے اُس کا واسطہ نہیں پڑتا۔ انسان میں دُوہری قوت ہے حیوانی طاقت جو نفس ہے وہ بھی ہے اور ملکوتی قوت جو عقل ہے وہ بھی ہے۔ اِن دو قوتوں کے ہونے کی بدولت اِس کو اختیار کے نام سے ایک تیسری صلاحیت دی گئی ہے، اختیار اِن دونوں کا مرکّب ہے، نفس اور عقل، نفس کو [اپنانے] اختیار کرنے یا عقل کو [اپنانے] اختیار کرنے کے لئے اختیار دیا گیا ہے۔ اختیار پسند کو کہتے ہیں، اختیار خیر کی (Root) سے ہے، خیر کے مصدر سے ہے۔ اختیار کے معنی دو چیزوں میں سے کسی ایک کو اپنے لئے بہتر سمجھنا، عقل کو بہتر سمجھنا یا نفس کو بہتر سمجھنا۔ تو یہ اختیار اِن دو قوتوں کی وجہ سے ہے اور اگر اختیار نہ ہوتا تو انسان حیوانات سے اور فرشتوں سے افضل نہ ہوتا اور [انسان] فرشتوں کا مسجود قرار نہ پاتا اور خدا تک رسا نہ ہوتا تو کوئی بُری چیز امتحان کے لئے سامنے ہونی چاہئے اور امتحان بہت بڑی چیز ہے۔ اِس لئے شیطان کے ہونے سے براہِ راست فائدہ نہیں ہے، یعنی اُس کی اطاعت سے فائدہ نہیں ہے اُس سے بچنے سے فائدہ ہے اور اگر شیطان نہ ہوتا تو انسان کی یہ فضیلت نہ ہوتی۔ دُنیا میں اگر کافر نہ ہوتا تو مومن کو غازی نہ کہا جاتا اور وہ شہادت کی فضیلت حاصل نہ کرتا، کافر ہے تو کافر کی بدولت مومن کو غازی کہا جاتا ہے جب کہ وہ صحیح معنوں میں غازی بنتا ہے اور اُس کو شہید کہا جاتا ہے جب کہ وہ شہادت کا درجۂ عظمیٰ پاتا ہے تو یہ ہے شیطان کے ہونے میں حکمت اور خدا نے جانتے ہوئے شیطان کو امتحان کے طور پر دُنیا کے اندر رکھا ہے۔

ٹرانسکرائب: شمع گیلانی ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

Click here
for Audio

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدین نصیرؔ ہونزائی ق س کا پُر حکمت بیان
عنوان: قرآن اور اماموں کے ناموں میں نسبت (نقوشِ حکمت، ص۔ ۳)

کیسٹ نمبر: ۲۲۔ا ے　　　　تاریخ: ۱۹۷۸، کراچی

۶۔ علیؑ (۴۳:۴):

اپنی کلاس شروع کر رہے ہیں اور گزشتہ ہفتے [کتاب: نقوشِ حکمت، صفحہ ۳] میں ہم نے اِس ڈائیگرام میں سے ایک سے لے کر پانچ تک (Lesson) کیا تھا اور پانچواں جو اسم ہے وہ "اہلِ ذکر" ہے جس کی البتہ تشریح ہوئی تھی۔ اب اِس ڈائیگرام کے مطابق چھٹے نمبر پر قرآن کا نام علی ہے اور امامِ اوّل کا نام بھی علی ہے تو امامِ اوّل کے نام کے علی ہونے میں ذرا بھی کسی کو شبہ نہیں ہے، لیکن ہوسکتا ہے کہ یہ سوال ہو کہ قرآن کا نام کس طرح علی ہے؟ اِس سوال کے سلسلے میں گزارش یوں ہے کہ سورہ ۴۳ اور آیت ۴ میں ارشاد ہوا ہے کہ: وَاِنَّهٗ فِيْٓ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ اور وہ قرآن اُم الکتاب میں ہمارے نزدیک بڑا اعالی قدر ہے یا بلند و بالا ہے منزلت اور مرتبت کے لحاظ سے۔ اِس کے دو معنی ہو سکتے ہیں، ایک یہ کہ قرآن اُم الکتاب میں ہے اور جہاں پر قرآن اُم الکتاب میں ہے تو وہ اپنی پوری جلالت و بزرگی کے ساتھ ہے یعنی کہ وہ رُوحانی اور نورانی کیفیت میں ہے۔ اِس لئے قرآن علی بھی ہے اور حکیم بھی ہے کیونکہ وہ اُم الکتاب ہے۔ اُم الکتاب کے لفظی معنی ہیں کتابوں کی ماں یا کہ کتابوں کی اصل یعنی (Original) جہاں سے کہ آسمانی کتابیں نازل ہوا کرتی ہیں یعنی لوحِ محفوظ۔ تو آپ کو یہ اُصول معلوم ہوا کہ قرآن کے کئی مقامات ہیں، مثلاً قرآن کا سب سے اعلیٰ مقام کلمۂ کُن ہے اور دُوسرا مقام قلمِ الٰہی ہے، تیسرا مقام لوحِ محفوظ ہے، چوتھا مقام اسرافیل ہے، پانچواں مقام میکائیل ہے، چھٹا مقام جبرائیل ہے، ساتواں مقام آنحضرت صلعم ہیں، آٹھواں مقام اساس ہیں پیغمبر کے جانشین، تو یہ قرآن کے نورانی اور رُوحانی مقامات ہیں۔

جب فرمانِ الٰہی کا اشارہ قرآن کے کسی ایسے مقام کی طرف ہوتا ہے تو اکثر قرآن کی عظمت و بزرگی کی نشاندہی ہوتی رہتی ہے یہ سمجھانے کے لئے کہ قرآن جب لوحِ محفوظ پر ہے تو ایسا نہیں ہے جو ظاہری قرآن ہے، کیونکہ اُس حالت میں جب کہ قرآن لوحِ محفوظ پر ہے تو [وہ] نورانی کیفیت میں ہے اور وہ زندہ ہے، معجزات سے بھرپور ہے، خدائی تحریر میں ہے۔ اِس سے خداوندِ عالم یہ فرمانا چاہتا ہے کہ قرآن کی دو بڑی حیثیتیں ہیں ایک باطنی حیثیت اور ایک ظاہری حیثیت۔ ظاہری حیثیت آپ کے سامنے ہے جو قرآن ہے، جو انسانوں کی تحریر میں ہے اور وہ بولتا نہیں ہے۔ اگر دو مسلمان قرآن کے سامنے آپس میں اختلاف کریں یا جھگڑیں تو قرآن نہ تو اِس جھگڑے سے ممانعت کرے گا اور نہ اُن کے سوال کا کوئی جواب

دے گا کیونکہ وہ خاموش قرآن ہے، بولنے والا قرآن نہیں ہے۔ اِس کے برعکس جہاں قرآن پیغمبرؐ میں تھا یا علیؑ میں تھا اور ہے، جبرائیل، میکائیل، اسرافیل، لوحِ محفوظ اور قلمِ الٰہی میں تو وہاں پر وہ ایک بولنے والا قرآن تھا اور اب بھی ہے۔ اِس لئے اللہ کے اِس ارشاد میں بہت بڑی حکمت ہے کہ جب اللہ قرآن کے اُس مقام کو یاد فرماتا ہے یعنی اُم الکتاب کو تو اُس وقت قرآن کی تعریف کرتے ہوئے فرماتا ہے کہ: وَ اِنَّهٗ فِیْۤ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَیْنَا لَعَلِیٌّ حَكِیْمٌ (۴۳:۴) اور وہ قرآن اُم الکتاب میں ہمارے نزدیک عالیشان اور حکمت والا ہے۔ اِس آیت کے اندر ''لَدَیْنَا ہمارے نزدیک'' یہ لفظ بھی آیا ہے، گُویا خدا کے لئے ظاہری قرآن سے باطنی قرآن زیادہ نزدیک ہے اور یہ نزدیکی بھی مکانی اور جغرافیائی حیثیت سے نہیں بلکہ شرافت اور فضیلت کے اعتبار سے [ہے] یہ بھی فرق ہوا کہ جہاں قرآنِ حکیم اُم الکتاب میں ہے وہاں پر وہ قرآن خدا سے زیادہ نزدیک ہے۔

اب دُوسرا نکتہ اِس مقام پر یہ ہے کہ اُم الکتاب علیؑ ہے، اساس ہے۔ معتبر روایت ہے کہ ایک دن آنحضرتؐ اپنے صحابہ کو نماز پڑھا رہے تھے، نماز کے دوران حضورؐ کے پیچھے کسی شخص نے الحمد کو ''جہر'' سے پڑھا یعنی آواز سے پڑھا اور اُس شخص کے الحمد پڑھنے کی آواز آنحضرتؐ کے مبارک کان تک پہنچی۔ آنحضورؐ جب نماز پڑھانے سے فارغ ہوئے تو پوچھنے لگے کہ وہ شخص کون تھا جس نے میرے پیچھے اُم الکتاب پڑھی، تو کہنے لگے کہ: اُم الکتاب ظاہر میں الحمد ہے اور باطن میں اُم الکتاب علیؑ ہے اور فرمانے لگے کہ: دیکھو جب تمہارا امامؑ تمہاری طرف سے قرأت کرتا ہے تو تمہیں صرف سننا چاہئے اور پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تو اِس روایت سے فی الحال ہمارا مقصد یہ بتلانا ہے کہ اِس حدیث کے بموجب ہمارے نزدیک اُم الکتاب علیؑ ہے۔ اور قرآن کا یہ ارشاد کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی آخری کتاب جہاں اُم الکتاب میں ہے تو وہ علیؑ ہے۔ [اِس] کا مطلب جب یہ قرآن رُوحانی حیثیت میں اساس کے اندر ہے جو اُم الکتاب ہے تو قرآن کی شان دوبالا ہو جاتی ہے اور قرآن یقیناً علی کہلاتا ہے اور حکیم کہلاتا ہے۔ اِس لئے کہ امامؑ کی شان بلند ہے اور اِس لئے بھی کہ امامؑ کا نام علی ہے، تو یہاں پر میں نے سورہ کا حوالہ دیا ہے، آپ دیکھیں اور ہمارے پاس جو کتابیں مہیّا ہیں اُن میں قرآن کے چند نام ہیں جو معتبر ہیں، جو اہلِ سنّت کے نزدیک بھی مسلّمہ ہیں بلکہ انہوں نے خود قرآن سے قرآن کے یہ نام ثابت کئے ہیں اور فہرست بنائی ہے کہ قرآن کے کون کون سے نام ہیں۔ تو قرآن کے اور بھی بہت سے نام ہیں لیکن میں نے اُن میں سے چند ناموں کو لیا ہے اور ایک نام قرآن کا اور ایک نام امامؑ کا میں نے مقابلہ کرایا ہے اور اِن دونوں ناموں کے درمیان جو نسبت ہے، جو مناسبت ہے، جو رشتہ ہے اُس کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے میں نے یہاں یہ اسماء درج کئے ہیں۔

۷۔ رُوح (۵۸:۲۲) (۴۲:۵۲):

اب ہم [کتاب: نقوشِ حکمت، صفحہ ۳ کے] ۷ نمبر پر جاتے ہیں وہاں پر علی کا نام بھی رُوح ہے (۵۸:۲۲) اور

قرآن کا نام بھی رُوح ہے (۴۲:۵۲)۔اب دونوں کے حوالے الگ الگ ہیں [ارشادِ خداوندی ہے] كَتَبَ فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْاِيْمَانَ وَاَيَّدَهُمْ بِرُوْحٍ مِّنْهُ (۵۸:۲۲) امام کا نام کیوں رُوح ہے؟ ظاہر ہے کہ امام رُوح ہے اور امام وہی رُوح ہے جو آدمؑ میں پھونکی گئی تھی یعنی خدائی رُوح جس کی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور وہی روح نسلاً بعد نسل یہاں تک آئی ہے، تو مولانا مرتضیٰ علیؑ میں جو رُوح تھی وہ عام نہ تھی خاص تھی یعنی خدائی رُوح تھی۔

دُوسری دلیل یہ کہ آپ جب فلسفۂ قرآن کو پڑھیں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ نور کا دُوسرا نام رُوح ہے اور بڑی رُوح کا نام نور ہے۔عام انسانوں میں جو رُوح ہوتی ہے وہ البتہ نور نہیں کہلاتی ہے، وہ ایک چھوٹی سی رُوح ہوتی ہے لیکن انسانِ کامل میں جو رُوح ہوتی ہے وہ روشنی ہوتی ہے۔تو جب یہ بات مسلّمہ ہے کہ امامؑ میں نور ہے تو وہ لازماً رُوح ہے، بہت بڑی روح۔اِسی طرح قرآن کے ناموں میں سے ایک نام رُوح ہے، سورہ ۴۲ آیت ۵۲ میں یہ ذکر آیا ہے کہ: وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا قرآن کے ناموں میں سے ایک نام رُوح ہے۔اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ رُوح کونسی ہے اور کن معنوں میں ہے اور کس طرح ؟ آپ جانتے ہیں کہ رُوح ایک زندہ حقیقت ہوا کرتی ہے، رُوح جیسا کہ ابھی میں نے کہا کہ ایک روشنی ہوتی ہے لیکن کسی نے نہیں دیکھا ہے کہ اِس قرآن میں کوئی رُوح ہے، لیکن اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ قرآن کی رُوح ہے (۴۲:۵۲)۔تو ہم دینی ہدایت کی روشنی میں اِس بات کو اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ قرآن کی جو رُوح ہے وہ امامؑ میں ہے۔لہٰذا قرآن اور امامؑ کا یہ رشتہ بھی ہے کہ قرآن کی رُوح امامؑ میں ہے۔

اِس کے علاوہ اس آیت میں فرمایا گیا ہے کہ: قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (۵:۱۵)۔ ہم نے تمہارے پاس ایک نور اور ایک ظاہری کتاب بھیجی ہے۔تو یہ قرآن کے نور کا ذکر ہے یعنی جو نور قرآن پر روشنی ڈالنے کے لئے بھیجا گیا ہے وہی نور۔اب اگر قرآن کے ساتھ ساتھ ایک ایسا نور بھی ہے کہ اُس سے قرآن پر روشنی ڈالی جائے تو وہ نور بلا شک قرآن کی رُوح ہے یعنی قرآن کی رُوح اور قرآن کا نور دونوں باتوں کا مطلب ایک ہی ہے۔اِس سے ہمارے عقیدے کی تائید ہوتی ہے کہ امامؑ میں قرآن ہے۔امامؑ میں قرآن ہے تو یہ ظاہری قرآن امامؑ میں نہیں ہے قرآن کی رُوح امامؑ میں ہے۔آپ اِس بات کو قرآن کی رُوح کہیں یا کہ قرآن کا نور کہیں دونوں باتیں ایک ہی معنی رکھتی ہیں۔امامؑ میں جب قرآن کی روشنی ہے اور امامؑ میں جب قرآن کی رُوح ہے تو امامؑ میں قرآن ہے۔جب امامؑ میں بھی قرآن ہے اور قرآن بھی قرآن ہے تو دو قرآن ہوئے اور دونوں میں فرق یہ ہوا کہ ایک خاموش قرآن اور ایک بولنے والا قرآن ہے۔ جب قرآن دو ہیں ایک بولنے والا قرآن، ایک خاموش قرآن تو بولنے والے قرآن کو ہم خاموش قرآن کا معلّم بھی کہہ سکتے ہیں اور ظاہری بات ہے کہ قرآن کا معلّم بھی ہے۔اسلام میں یہ تصوّر کہ معلّمِ قرآن ہے، رسول اللہؐ کے زمانے میں آنحضرتؐ خود معلّمِ قرآن تھے، آنحضرتؐ خود بولنے والے قرآن تھے، لوگ رسولؐ کو چھوڑ کر قرآن سے رُجوع نہیں کرتے تھے جب کہ

آنحضرتؐ اُن کے درمیان تھے کیونکہ خداوندِ عالم نے یہ فرما کر قرآن نازل کیا تھا کہ رسولؐ تم کو قرآن سکھائے گا(۲:۶۲)۔حالانکہ یہ قرآن عرب کے مسلمانوں کی زبان میں تھااور اگر قرآن کو سمجھنے کے لئے کسی روشنی کی ضرورت نہ ہوتی اور لوگ خود از خود قرآن کو سمجھ سکتے تو سب سے پہلے یہ بات عرب کے مسلمانوں پر واقع ہوتی کیونکہ وہ اہلِ زبان تھے اور حالات و واقعات اُن ہی کے تھے،مسائل اُن ہی کے تھے،رسم و رواج اُن ہی کے تھے۔لہٰذا دُوسروں کی نسبت بہت ہی آسان تھا کہ وہ لوگ قرآن کو بغیر معلّم کے سمجھ سکتے۔رسولؐ کے اندر،رسولؐ کی رُوح میں،رسولؐ کے نور میں قرآن کی رُوح تھی،قرآن کا نور تھا اِس لئے آنحضرتؐ معلّمِ قرآن تھے،اِس معنی میں آنحضرتؐ لوگوں کو قرآن ظاہر میں اور باطن میں یعنی تنزیل اور تاویل دونوں لحاظ سے سمجھایا کرتے تھے،لہٰذا آنحضرتؐ روحِ قرآن بھی تھے اور نورِ قرآن بھی تھے۔

اِسی مطلب کو دُوسرے طریقے سے سمجھتے ہیں اور وہ یہ کہ جب قرآن آنحضرتؐ پر نازل ہوا تو وہ رُوحانی کیفیت میں تھا۔آنحضرتؐ نے قرآن کو کاتبوں کے ذریعے سے لکھایا،اُس کے باوجود بھی آنحضرتؐ کی ذات سے قرآن کی حقیقتیں،قرآن کی روشنی،قرآن کے اسرار،قرآن کی حکمت اور قرآن کی رُوح الگ نہیں ہوسکتی تھی۔وہ ایک رُوحانی کیفیت تھی،وہ ایک روشنی تھی،وہ ایک زندہ بولنے والی آواز تھی،وہ ایک گونج تھی جو ہمیشہ کے لئے زندہ تھی۔لہٰذا اُس کیفیت کو حضورؐ ظاہر نہیں کر سکتے تھے،رُوحانی واقعات کو ہو بہو پیش نہیں کیا جاسکتا ہے سوائے الفاظ کی ترجمانی کے،رُوح کو اور رُوحانیت کو کاغذ پر کس طرح منتقل کیا جاسکتا ہے۔آپ سورج کو کاغذ پر نہیں دکھا سکتے ہیں،سورج کے بارے میں کچھ کہہ سکتے ہیں، کچھ تشریح بھی کرسکتے ہیں لیکن آپ اپنے الفاظ کے زور سے،اپنی آواز سے اور اپنی تحریروں سے سورج کا کوئی کرشمہ نہیں دکھا سکتے ہیں۔ جب الفاظ کے زور سے،الفاظ کے ذریعے سے سورج کو سورج کی طرح ظاہر نہیں کیا جاسکتا ہے تو رُوحانیت کے معجزات کو اور قرآن کی رُوح کو کاغذ پر کس طرح منتقل کیا جاسکتا تھا اِس سے ظاہر ہے کہ اصل قرآن حضورِ انورؐ کی ذاتِ گرامی میں باقی اور قائم تھا اور صرف اُس کی ایک ترجمانی تحریر میں آئی تھی۔

اِس سلسلے میں شاید میں نے قرآن اور رُوحانیت میں یہ مثال پیش کی ہے کہ ایک شخص کسی (Movie) میں سے یعنی فلم میں سے،بہت اچھے اخلاقی قصّے کو دیکھتا ہے،وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔اُس کے اندر بہت سے حالات، واقعات اور مناظر ہیں اور بہت سی چیزیں وہ دیکھتا ہے،سُنتا بھی ہے،دیکھتا بھی ہے اور اُس میں اشارے ہیں،کنایے ہیں،بہت سی چیزیں ہیں۔اب وہ چاہتا ہے کہ دُوسروں کو اِس کا بیان کرے،وہ کیا کرتا ہے،وہ اپنے قلم سے یا زبان سے اُس کی ایک ترجمانی کرتا ہے اور الفاظ میں اُس واقعے کو اُس قصّے کو بیان کرتا ہے،اُس کی ایک کتاب مرتّب ہو جاتی ہے اور وہ پھر اپنے شہر میں اِس کو پیش کرتا ہے۔لوگ اِس کو پڑھتے ہیں،اب اُس نے جو کچھ دیکھا ہے وہ اُس کے ذہن میں ہے[اب] اُس کو لکھنے سے جو واقعات اُس کے ذہن میں ہیں،اُس کے دل میں ہیں اور اُن واقعات کے جو اثرات

دماغ میں مرتّب ہوئے ہیں وہ تو زائل نہیں ہو سکتے ہیں اور دُوسری چیز یہ بھی ہے کہ اِس لکھی ہوئی کتاب میں اور اُن چشم دید واقعات میں بڑا فرق ہے۔ اُس شخص نے جو تصویریں دیکھی تھیں اُن میں روشنی تھی وہ چلنے پھرنے والی، بولنے چالنے والی تصویریں تھیں اور وہ واقعات گویا زندہ تھے لیکن اُس نے جو اُن تمام چیزوں کو قلم بند کیا تو سب چیزیں خاموش ہوگئیں۔ اُن میں نہ تو حرکت ہے، نہ رنگینی ہے اور نہ روشنی ہے، نہ آواز ہے، کچھ بھی نہیں ہے، ایک خاموش تحریر ہے اور اِس کے سوا کچھ بھی نہیں۔ اِسی طرح قرآن جو نازل ہوا تھا وہ صرف آواز نہیں تھی، وہ صرف تحریر نہیں تھی قرآن میں نور تھا، روشنی تھی، اشارے تھے، حکمتیں تھیں اور بہت کچھ تھا۔ قرآن ایک روشن دُنیا بن کر نازل ہوا تھا آنحضرتؐ کے قلبِ مبارک پر اور وہ فرشتوں کی آواز میں، آسمان و زمین کے اشاروں میں اور ایک روشن دُنیا کی صورت میں تھا جس کو آنحضرتؐ نے قرآن کی تحریری شکل میں اور عرب کی زبان میں پیش کیا اور پیش کرنے کے بعد بھی وہ قرآن جو اصل تھا جو رُوح کی حیثیت میں تھا جو نور تھا وہ آنحضرتؐ میں قائم اور مخفی تھا۔ تو اِس معنی میں قرآن رُوح ہے اور اُس وقت یہ پیغمبر اور امامؑ میں ہے۔

قرآن کی رُوح ہونے کی دُوسری مثال جو آپ سے بہت ہی قریب ہے یہ بھی ہے کہ اگر ایک مومن امامؑ کی فرمانبرداری میں خصوصی عبادت سے دلچسپی لے اور عبادت و بندگی میں بہت آگے بڑھے، ترقّی کرے اور خدا اور رسولؐ اور صاحبِ امر یعنی زمانے کے امامؑ کی اطاعت کرے جیسا کہ قرآن کا ارشاد ہے کہ: یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ (۴:۵۹)۔ آخر اِس اطاعت کا کوئی نتیجہ ہونا چاہئے۔ فرض کریں ایک مومن کے لئے اِس آیت میں جو کچھ اطاعت اور فرمانبرداری [کا حکم] فرمایا گیا ہے اُس کے مطابق ایک مومن نے عمل کیا تو [گویا] خدا کی اطاعت، رسولؐ اور امامؑ کے وسیلے سے بجالائی گئی تو اُس کا کوئی پھل ہونا چاہئے اور وہ پھل یہ ہے کہ خصوصی عبادت کے بعد ایک مومن کے دل میں نورِ ایمان منوّر ہو جائے گا اور پھر اُس نور کے اندر قرآن کی حقیقتیں ہوں گی اور چونکہ قرآن ہر مقام پر رُوح ہے اور چونکہ خدا کی زبان حکمت ہے اور حکمت مشترک ہے سب کے درمیان اور خدا کو چاہئے کہ کوئی ایسی زبان استعمال کرے جو سب کے درمیان (Common) اور مشترک ہو نا کہ وہ صرف عرب کی زبان میں بولا کریں۔ میرا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک مومن اِس اطاعت و فرمانبرداری کے نتیجے میں رُوحانیت کے ایک اعلیٰ مقام پر پہنچ جائے تو اُس کو قرآن کی رُوح ملے گی، جو روشنی کی صورت میں ہوگی اور جو خدائی زبان میں قرآن کی رُوح ہوگی خدائی زبان یہ کہ وہ مومن اشاروں سے کنایوں سے اور اپنی زبان سے اُس کو سمجھتا ہے۔

یہاں پر ایک اور بات مجھے یاد آگئی وہ یہ کہ قرآن کے اندر ایک ارشاد ہے جس میں فرمایا گیا ہے: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا بِلِسَانِ قَوْمِهٖ (۱۴:۴)۔ اگر آپ اِس کا سوال بنا کر کسی عالم سے پوچھیں تو وہ آپ کو جواب نہیں دے سکے گا۔ سوال یوں بنتا ہے جو فرمایا گیا ہے کہ اللہ کسی بھی قوم میں رسول کو جب بھیجتا ہے تو اُس قوم کی زبان میں بھیجتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ

مسلمان ایک قوم ہیں خواہ وہ عرب میں ہیں یا ترک میں ہیں ہندوستان یا پاکستان میں ہیں اور جہاں کہیں بھی مسلمان ہیں وہ ایک قوم ہیں۔اب ہم اِس آیت کے معنی کو کس طرح سمجھیں گے یہ جو فرمایا گیا ہے کہ: خدا جس قوم میں کوئی نبی یا رسول بھیجتا ہے تو اُس قوم کی زبان میں بھیجتا ہے (۱۴:۴)۔اور حالانکہ ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان آنحضرتؐ کی قوم ہیں [مگر] اُن کی زبان ایک نہیں ہے۔اب اِس میں کس زبان کو اور کون سی زبان کو مرکز قرار دے کر کہیں کہ ہم سب فلان زبان کی قوم ہیں کیا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہم عرب کی قوم ہیں اور ہماری زبان عربی ہے۔اِس کو ہم کیسے سمجھیں؟ اب سوائے تاویلی حکمت کے ہمارے مسئلے کو کوئی چیز حل نہیں کر سکتی ہے۔وہ یہ کہ درست ہے کہ نبیٔ آخرین جو اللہ کے حضور سے دُنیا میں آیا ہے اُس تک ہم سب کی رسائی ہو اور آنحضرتؐ دُنیا بھر کے مسلمانوں کی مادری زبان میں بات کر سکتے ہیں، رُوحانیت میں یہ بات صحیح ہو سکتی ہے، تاویل میں یہ بات دُرست ہو سکتی ہے۔وہی بات ابھی میں کر رہا تھا اور کہہ رہا تھا کہ خدا کی عدالت کے لئے چاہئے کہ وہ سب کے لئے مساوات مہیّا کرے، ایسا نہیں کہ قرآن عربی میں ہو اور ہم مسلمان ہونے کے باوجود دُوسروں کی زبان کی طرف تلاش کریں رجوع کریں لیکن ظاہر میں انصاف البتہ نہیں ہو سکتا ہے۔حکمت میں اور باطن میں سب کچھ صحیح ہو سکتا ہے، ظاہر کے مقابلے میں باطن زیادہ حقدار ہے کہ عدل و مساوات وہاں پر ہوتے ہیں، ظاہر تو ظاہر ہی ہے۔لہٰذا ہمارا کہنا یہ تھا کہ قرآن کی جو رُوح ہے وہ نور ہے اور نور ہر زبان میں بول سکتا ہے۔

آپ کلامِ مولا کو لیں اور دیکھیں کہ مولا علیؑ کیا فرماتے ہیں؟ وہ فرماتے ہیں کہ: اَنَا الْمُتَکَلِّمُ بِکُلِّ لُغَتٍ فِی الدُّنیا (منقبت: ۳۴)۔میں ہر قوم کی زبان میں بول سکتا ہوں، وہ [علیؑ] قرآن کا نور ہیں، وہ قرآن کی رُوح ہیں، وہ آنحضرتؐ کے جانشین ہیں، وہ آنحضرتؐ کے نور ہیں، لہٰذا وہ دُنیا بھر کے مومنین کی زبان میں بات کر سکتے ہیں۔اور امامِ زمانؑ کی یہ رُوحانی ہدایت قرآن کی ہدایت ہے، رسولؐ کی ہدایت ہے، خدا کی ہدایت ہے ساری باتیں ایک ہیں۔لہٰذا دُرست ہے خدا نے جو فرمایا تھا کہ میں ہر قوم میں اُن کی زبان میں رسول بھیجتا ہوں یہ رُوحانیت کی بات ہے، رُوحانیت میں رسول ہم سے دُور نہیں ہیں، رسول کا نور ہمارے لئے رسول ہے، [یعنی] رسول کے جانشین رسول ہی کا کام انجام دیتے ہیں۔تو میں نے آپ سے بات کی کہ قرآن کس طرح رُوح ہے۔

۸۔ھادی (۱۳:۷) (۱۷:۹):

اب ہم ایک منزل آگے چلتے ہیں، دُوسرے خانے میں لکھا ہے کہ امامؑ ہادی ہے۔اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِکُلِّ قَوْمٍ هَادٍ (۱۳:۷)۔اور قرآن بھی ہادی ہے۔اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ یَهْدِیْ لِلَّتِیْ هِیَ اَقْوَمُ (۱۷:۹)۔دونوں کی آپس میں مناسبت ہے یہ بھی ہادی اور وہ بھی ہادی ہے۔لیکن ہم سوال کرتے ہیں کہ قرآن کس طرح ہادی ہے؟ قرآن اِس طرح ہادی ہے کہ یہ

ہادی کے اندر ہے یعنی امامؑ میں ہے تو مکمّل طور سے قرآن ہادی ہے اور امامؑ کے وسیلے سے ہے تو پھر بھی یہ ہادی ہے۔ کیونکہ امامؑ قرآن ہے، قرآن امامؑ ہے اور قرآن امامؑ میں ہے تو قرآن امامؑ ہے، امامؑ میں قرآن ہے تو امامؑ قرآن ہے۔ امامؑ ہادی ہے تو اِس نسبت سے قرآن ہادی ہے، امام کو کتاب بھی کہا گیا ہے اِس لئے کہ کتاب اُس کے اندر ہے، اِس لئے کہ وہ بولنے والی کتاب ہے۔ ہادی خدا کا بھی نام ہے، پیغمبر کو بھی ہادی کہا گیا ہے، قرآن بھی ہادی ہے، امام بھی ہادی ہے کیونکہ یہ تین چار مرتبے آپس میں مناسبت رکھتے ہیں۔

امام کا ہادی ہونا قرآن کا ہادی ہونا ہے، امام کا ہادی ہونا رسول کا ہادی ہونا ہے، رسول کا ہادی ہونا خدا کا ہادی ہونا ہے، نیچے سے جب اُوپر جاتے ہیں تو بھی وہی بات ہے۔ اب خدا کا ہادی ہونا یہ ہے کہ اُس نے رسول کو بھیجا، رسول کا ہادی ہونا یہ ہے کہ اُس نے اپنے وقت میں ہدایت کی اور آئندہ کے لئے ایک جانشین کو مقرّر کیا، امامؑ کا ہادی ہونا یہ ہے کہ وہ ہمیشہ ہادی ہے، وہ قرآن سے اور اپنی ذات سے ہدایت کرتے ہیں اور اُس کی ذات میں قرآن کی ہدایتیں ہیں۔ ہم کیسے باور نہیں کر سکتے ہیں جب کہ ابھی ابھی ہم نے مثال پیش کی کہ جب مومن بندگی اور عبادت کر کے روشنی کے مقام تک پہنچ جاتا ہے تو اُس کے دل میں روشنی آتی ہے، یہ روشنی کونسی ہے؟ قرآن اور امامؑ کے علاوہ کوئی روشنی ہو سکتی ہے یا یہ کس سرچشمے سے روشنی آئی؟ روشنی کا ایک ہی سرچشمہ ہے اِس مادّی دُنیا میں بھی ظاہری روشنی کا منبع اور سرچشمہ ایک ہی ہے جو سورج ہے خواہ وہ روشنی چاند میں ہو یا ستاروں میں ہو اِسی طرح اگر باطنی طور پر آپ کے دل میں تھوڑی سی روشنی ہے یا زیادہ روشنی ہے تو یہ نورِ قرآن میں سے ہے اور امامؑ کے نور میں سے ہے، جب آپ کے باطن میں اِسی طرح قرآن کے نور آنے کی امکانیت پائی جاتی ہے تو انسانِ کامل میں کیسے قرآن کا نور نہیں آسکتا ہے، جب کہ امامؑ میں قرآن کا نور آسکتا ہے تو امامؑ ہادی ہے اور قرآن ہادی ہے، دونوں کا مقصد ایک ہے۔

اِس کے علاوہ ایک بات یہ بھی ہے کہ رسولِ اکرمؐ نے اپنے آخری وقت میں اُمّت کے لئے یہ وصیّت کر دی تھی کہ وہ ثقلین کو پکڑیں۔ اِس حدیث کو دہرانے کی ضرورت نہیں ہے حدیثِ ثقلین بہت مشہور ہے [یعنی] قرآن اور امامؑ۔ اور فرمایا تھا کہ یہ آپس میں بٹی ہوئی دو رسیاں ہیں، جب لوگ دو رسیوں کو باہم ملاتے ہیں تو دو رسیوں کے آپس میں ملنے سے زیادہ مضبوطی ہو جاتی ہے اور وہ ایک دُوسرے کے ساتھ مل کر رہ سکتی ہیں، یہ کوئی مشکل نہیں ہے کہ دو رسیاں ایک ساتھ ہوں تو دو رسیوں سے تشبیہہ دی تھی اور کہا تھا کہ اِن دونوں کو پکڑنا اور یہ ساتھ رہیں گی۔ مطلب یہ ہے کہ ہم امامؑ سے قرآن میں جائیں تو اچھا ہے، قرآن سے امامؑ میں جائیں یہ مشکل ہے کیونکہ قرآن بولتا نہیں ہے لیکن امامؑ بولتا ہے، لہٰذا ہم امامؑ کے وسیلے سے قرآن کو لیں تو پھر بہت ممکن ہے کہ ہم کو روشنی ملے گی پھر قرآن کے وسیلے سے امامؑ تک پہنچیں گے۔ اگر ہم ایسا نہیں کرتے ہیں امامؑ کی معرفت کو چھوڑتے ہیں یا امامؑ کو نظر انداز کرتے ہیں اور صرف قرآن ہی کو لیتے ہیں تو [معرفت]

ممکن نہیں ہے کہ اگر چہ قرآن میں امامؑ کی معرفت ہے لیکن ممکن نہیں ہے کہ ہم اُس معرفت کو سمجھ پائیں۔ یعنی مطلب [یہ کہ] امام کے بغیر قرآن میں جانے کے معنی یہ ہیں کہ ہم امامؑ کو چھوڑ کر دُوسروں کے وسیلے سے قرآن میں جائیں، دُوسروں کی تفاسیر اور دُوسروں کو اپنے لئے مددگار قرار دے کر جب قرآن میں جائیں گے تو ہم امامؑ کی معرفت سے رہ جائیں گے۔

اگر ہم قرآن کو امامؑ کے وسیلے سے لیں تو رسولؐ کی اِس وصیّت پر عمل ہوگا اور یقیناً ہم قرآن میں سے امامؑ کی معرفتوں کو حاصل کریں گے، پھر ہم امامؑ کو زیادہ سے زیادہ پہچاننے لگیں گے اور جیسے ہی ہم امامؑ کو زیادہ سے زیادہ پہچاننے لگیں گے تو نتیجے کے طور پر ہم کو قرآن کی روشنی اور زیادہ ملے گی اور جب قرآن کی روشنی اور زیادہ ملے گی تو قرآن میں سے امامؑ کی معرفتیں اور زیادہ نظر آنے لگیں گی۔ اسی طرح ہمارا علمی سفر جاری رہے گا "امام سے قرآن" اور "قرآن سے امام" پھر امامؑ سے روشنی لے کر قرآن اور قرآن سے زیادہ معرفتیں لے کر امامؑ، تو یہی دائرہ اور یہی گردش جاری رہے گی۔ اِس لئے ہدایت کے یہ دو سرچشمے ہیں جو باہم مل کر ہیں اور اِن کی مثال دو رسیوں کی طرح ہے جو آپس میں بٹ کر اور زیادہ مضبوطی پیدا کرتی ہیں اور یہ حوضِ کوثر تک ایک دُوسرے سے جدا نہیں ہیں تو ہدایت کے لئے رسول اللہؐ نے یہی وسیلہ دیا ہے جو امامؑ اور قرآن ہے اور اللہ تعالیٰ کی منشاء سے یہ الگ نہیں ہے جیسا کہ خدا نے بھی فرمایا تھا کہ میں نے تمہارے لئے نور اور کتابِ مبین دونوں چیزیں بھیجی ہیں (۵:۱۵)۔ اِس کا مقصد یہ تھا کہ نور کی روشنی میں کتابِ مبین کا مطالعہ کیا جائے۔

اِس کے علاوہ بہت سی آیتیں ہیں جن میں وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ (۲:۶۲)، (۳:۴۸)، (۳:۱۶۴)، (۲:۱۲۹)، (۲:۱۵۱) کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ اگر چہ رسولؐ کے بارے میں ہیں کہ آنحضرتؐ لوگوں کو کتاب سکھایا کرتے ہیں اور حکمت سکھایا کرتے ہیں۔ دانشمند کے لئے یہ بات قابلِ غور ہے کہ کتاب کا ذکر الگ ہے اور حکمت کا ذکر الگ ہے اور ہمارے نزدیک کتاب سے قرآن کے ظاہری معنی یعنی تنزیل مُراد ہے اور حکمت سے تاویل مُراد ہے۔ اِس سے ہم کو [ایک] اور (Point) ملتا ہے [کہ] جہاں پر کتاب کو ظاہری طور پر پڑھنا بھی لوگوں پر نہیں چھوڑا گیا ہے، اعتماد نہیں کیا گیا ہے کہ لوگ خود از خود کم سے کم قرآن کے ظاہر کو پڑھیں اور باطن معلمِ قرآن اُن کو سکھائیں ایسا بھی نہیں ہے، ظاہر کے لئے بھی فرمایا گیا ہے کہ کتاب بھی رسولؐ ہی اُن کو سکھائیں گے، تو ہمارے نزدیک رسولؐ کا یہ مرتبہ ہمیشہ کے لئے ہونا چاہئے۔ جب دُنیا میں قرآن ہے تو معلّم قرآن اور نورِ قرآن، رُوحِ قرآن بھی اُس کے ساتھ ساتھ ہونا چاہئے۔ جب قرآن ظاہر ہے غائب نہیں ہوا ہے تو امامؑ کو بھی اپنے کام کے لئے ظاہر اور حاضر رہنا چاہئے۔

ہمارے کچھ بھائی کہتے ہیں کہ امام غائب ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کیوں غائب نہیں ہے؟ امام قرآن کے ساتھ ہے، رسولؐ نے فرمایا کہ قرآن سے امام جدا نہیں ہے۔ دونوں رسیاں ایک ساتھ ہیں، رسّی کا یہ جُزو دُنیا سے نہیں اُٹھایا گیا تو وہ جُزو کس طرح اُٹھایا جاسکتا ہے اور دُوسری بات کیا یہ کمی نہیں ہوگی کہ ہدایت کے ذریعے سے آدھا نصف اُٹھایا

گیااورنصف باقی ہے ایسے میں لوگوں کا ایمان کمزور نہیں ہوگا، خدا پر کوئی حجّت نہیں رہے گی، [کیا] لوگ کہہ نہیں سکیں گے کہ خدایا! رسولؐ کے زمانے میں تو ہر چیز مکمل تھی اور آپ نے کہا تھا کہ دین کامل اور مکمل ہوا ہے (۳:۵) پھر بعد میں دین میں یہ نقص آیا ہے لوگ کہہ سکیں گے اگر مانا جائے کہ امامؑ غائب ہیں۔ لیکن یہ بات نہیں ہے، امامؑ حاضر اور موجود ہیں جس طرح قرآن حاضر اور موجود ہے۔ تو میں نے ہدایت کے بارے میں کچھ بات کی۔

۹۔ اولی الامر (۵۹:۴)(۵:۶۵):

اب آگے چل کر اولوالامر اور امر۔ اولوالامر اماموں کا نام ہے، امر قرآن کا نام ہے۔ اماموں کے نام کے اولوالامر ہونے میں ذرا بھی شُبہ نہیں ہے اور وہ آیت آپ روزانہ پڑھتے ہیں جو سورہ نمبر ۴ اور آیت نمبر ۵۹ میں ہے، وَاُولِي الْاَمْرِ مِنكُم۔ لیکن قرآن کا نام امر کس طرح ہے اِس کے لئے آپ سورہ نمبر ۶۵ اور آیت ۵ کو لیں ذٰلِكَ اَمْرُ اللّٰهِ اَنْزَلَهٗٓ اِلَيْكُمْ ۚ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يُكَفِّرْ عَنْهُ سَيِّاٰتِهٖ وَيُعْظِمْ لَهٗٓ اَجْرًا وہاں پر قرآن کا نام امر آیا ہے۔ امر کے معنی فرمان اور حکم کے بھی ہو سکتے ہیں، اِس معنی میں دُرست ہے کہ قرآن امر ہے، فرمان ہے اللہ تعالیٰ کا اور اُس میں احکام ہیں ہدایات ہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ اماموں کو اولوالامر کہا گیا ہے اور قرآن کو امر، اگر قرآن امر ہے اور امامؑ صاحب امر ہیں تو دُوسرے الفاظ میں امامؑ صاحب قرآن ہیں۔ مطلب اِس کا یہ ہوا کہ اِس معنی میں قرآن امامؑ کو دیا گیا ہے۔

ٹرانسکرائب : سیما عظیم علی ٹائپ : اکبر علی پروف : نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان
عنوان: قرآن اور امام کے ناموں میں نسبت (نقوشِ حکمت، ص:۳)
کیسٹ نمبر: ۲۲۔بی تاریخ: ۱۹۷۸، کراچی

Click here for Audio

۹۔ اولی الامر (۴:۵۹)(۵:۶۵):

آپ کے کہنے کے مطابق آج اولوالامر کے باقی ماندہ حصّے پر بولتے ہیں اور شاید گزشتہ کلاس میں اولوالامر کے (Point) کے سلسلے میں کچھ بات چیت ہوئی تھی۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ اولوالامر کے بارے میں کچھ کہتے ہوئے وقت ختم ہو چکا تھا۔ اِس لیے تو گزارش یہ ہے کہ اولوالامر ائمّہَ اطہار علیھم السّلام کا نام ہے، یعنی صاحبانِ امر اور امر والے یہ صیغۂ واحد نہیں بلکہ جمع ہے اِس کا واحد ولیٔ امر ہے۔ ولیٔ امر یعنی امر کا مالک اِس کا حوالہ ہے یَآ اَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ (۴:۵۹)۔ اور اِس کے مقابلے میں قرآن کا نام بھی امر ہے، امر کے ایک معنی فرمان اور حکم کے بھی ہوتے ہیں۔ جہاں قرآن کے لیے امر کا اسم آیا ہے، امر کا نام آیا ہے اُس کا حوالہ ہے: ذٰلِکَ اَمۡرُ اللّٰہِ اَنۡزَلَہٗۤ اِلَیۡکُمۡ ؕ وَمَنۡ یَّتَّقِ اللّٰہَ یُکَفِّرۡ عَنۡہُ سَیِّاٰتِہٖ وَیُعۡظِمۡ لَہٗۤ اَجۡرًا (۵:۶۵)۔ تو اماموں کے نام اور قرآن کے نام کی اِس مناسبت کو ہم دیکھتے ہیں چنانچہ ائمّہَ اطہار علیھم السّلام کے نام اولی الامر اِس لیے آیا ہے کہ وہ امر والے ہیں اور خدا اور رسولؐ نے امر اُن کے اختیار میں دیا ہوا ہے۔ وہ حکم والے ہیں وہ فرمانے والے ہیں، وہ ارشاد کرنے والے ہیں اور خدا اور رسولؐ کے ارشادات بھی اُنہی کے ذریعہ سے ہیں۔ خدا اور رسولؐ کے احکامات اور ارشادات بھی اِنہی کے ذریعہ سے صادر ہوتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ کوئی سابقہ حکم ہو یا جدید ہر حالت میں وہ حکم اور وہ امر و فرمان اولوالامر کے ذریعے سے نافذ ہوتا ہے۔ جیسے خدا کے سب احکام رسولؐ کے ذریعے سے نافذ ہوتے ہیں، رسولؐ کی زبان سے، رسولؐ کے وسیلے سے، اِسی طرح سے خدا اور رسولؐ کے سارے احکامات امامِ زمانؑ کے ذریعے سے نافذ ہو جاتے ہیں۔

ہر حالت میں اولوالامر ایک ایسا نام ہے جو کہ دین کے تمام احکامات اِسی اسم کے تحت، انہی حضرات کے تحت آتے ہیں اور قرآن کا یہ نام کہ وہ امر ہے تو امامؑ صاحب امر ہے اور قرآن امر ہے، اِس معنی میں امامؑ صاحب قرآن ہوئے۔ دین کے جس مقام پر قرآن امر ہے اُسی مقام پر امامؑ صاحب امر ہے، لہٰذا نتیجتاً امامؑ یا کہ ائمّہ صاحب قرآن ہوئے

اور ویسے بھی شاید اگلی دفعہ بھی کہا گیا تھا، معلّمِ قرآن کے بارے میں بھی یہی بات بنتی ہے کہ معلّم، قرآن کے سکھانے والے ہوتے ہیں اور معلّم کو صاحبِ کتاب کہا جاسکتا ہے اور اسی طرح آنحضرتؐ کو بھی صاحبِ کتاب کہا جاسکتا ہے۔ اِس کے علاوہ جہاں خداوندِ عالم نے فرمایا ہے کہ اُس نے کتاب کے ساتھ ساتھ نور کو بھی نازل کیا ہے تو اُس معنی میں بھی نور معلّم ہے اور نور صاحبِ کتاب ہے (۵:۱۵)۔ لہٰذا اولوالامر کے معنی میں امامؑ کے صاحبِ قرآن ہونے میں اور صاحبِ احکاماتِ الٰہی ہونے میں کوئی تعجّب نہیں، کیونکہ امر بہت بڑا لفظ ہے۔

اسلام میں امر سے بڑھ کر کوئی بنیادی لفظ نہیں اور اِس سے اُوپر بھی کوئی لفظ نہیں۔ اِس کا ثبوت یہ ہے کہ جس وقت خدا نے ارادہ فرمایا کہ کائنات بنائی جائے تو اُس نے کُن کے امر سے اِس کائنات کا ایجاد کیا یعنی نیستی سے ہستی میں لایا۔ تو تخلیقِ کائنات کے لیے بنیادی حکم کا نام امر ہے، اور قرآن میں آیا ہے کہ جب خداوندِ عالم کے نزدیک کوئی امر طے ہو جاتا ہے تو خداوند اُس کو کُن فرماتا ہے (۳۶:۸۲) اور یہ کُن فرمانا امر ہے۔ اور جس وقت خداوندِ عالم اِس کائناتِ جسمانی کو رُوحانی عالم میں تبدیل کرنا چاہیں گے تو اُس وقت بھی وہ کُن فرمائیں گے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ اِس کائنات کا آغاز و انجام دونوں میں کُن ہی کارفرما ہے۔ چنانچہ خداوندِ عالم نے جب اپنے بعد اور اپنے رسولؐ کے بعد اماموں کو اولوالامر قرار دیا تو اُس وقت امر کے یہ تمام معنی خدا کی نظر سے پوشیدہ نہیں تھے، یعنی خدا کے نزدیک امر کے یہ سارے معنی امامؑ کے لیے دُرست تھے اسی لیے اُس نے اِن تمام معنوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے اماموں کو اولوالامر قرار دیا اور اِسی کے ساتھ ساتھ وہ صاحبانِ قرآن بھی ہوئے۔ اِس سلسلے میں ایک آخری نکتہ یہ بھی ہے کہ قرآن کا صحیح معنوں میں امر ہونا اُس وقت دُرست ہے جبکہ اِس کا صاحبِ امر کے ساتھ رابطہ ہو، کیونکہ صاحبِ امر وہی ہے۔ مثال کے طور پر اگر اولوالامر کو قرآن سے جس کا ایک نام امر ہے الگ کیا جائے تو قرآن صحیح معنوں میں امر نہیں ہوسکتا ہے کیونکہ اُس کا صحیح معنوں میں امر ہونا اِس بات پر منحصر ہے کہ وہ صاحبِ امر سے وابستہ رہے۔

۱۰۔ امامِ مبین (۳۶:۱۲) (۸۵:۲۱۔۲۲):

دُوسرا نکتہ جو نمبر ۱۰ پر ہے یہ ہے کہ صاحبِ امر کا ایک نام امامِ مُبین ہے جو سورۂ یاسین کی بارہویں آیت وَكُلَّ شَيْءٍ أَحْصَيْنَاهُ فِي إِمَامٍ مُّبِينٍ (۳۶:۱۲) میں ہے اور اللہ کی آخری کتاب کا نام ایک آیت کے مطابق قرآنِ مجید ہے۔ بَلْ هُوَ قُرْآنٌ مَّجِيدٌ فِي لَوْحٍ مَّحْفُوظٍ (۸۵:۲۱۔۲۲)۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ اِن دونوں ناموں کی مناسبت کس طرح سے دُرست ہوسکتی ہے۔ جہاں پر امامؑ کا نام امامِ مبین ہے تو اُس کے معنی ہیں کہ بیان کرنے والا امام، بولنے والا امام، ظاہر امام۔ مبین کے معنی ظاہر کے ہیں، مبین کے معنی بیان کرنے کے ہیں اور مبین کے معنی بولنے کے ہیں اور بَلْ هُوَ قُرْآنٌ

مَّجِيْدٌ فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ (۸۵:۲۱۔۲۲) کے مطابق قرآن کا ایک نام قرآنِ مجید ہے۔

جب قرآن لوحِ محفوظ میں ہے تو وہ بڑا با کرامت قرآن ہے، بڑا بزرگ اور معزّز قرآن ہے، مجید کے معنی بزرگی والا، عظمت والا، جلالت والا۔ آپ جانتے ہیں کہ قرآن کی قدر اور منزلت اُس وقت ہوتی ہے جبکہ یہ اپنے صحیح مقام پر ہو۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ جب قرآن لوحِ محفوظ پر ہے تو اُس وقت یہ اپنی مکمّل آن بان سے ہے اور اپنی جلالت اور بزرگی سے ہے۔ اسماعیلی نظریہ کے مطابق لوحِ محفوظ سے امامؑ کی رُوحانیت مُراد ہے، چنانچہ امامؑ نے خطبۃ البیان میں ارشاد فرمایا ہے کہ: ''اَنَا اللَّوحُ المحفُوظُ مَیں ہی لوحِ محفوظ ہوں''۔ ہمارے پیروں نے جو فلسفہ پیش کیا ہے اُس کے مطابق عقلِ کُلّی قلمِ الٰہی ہے اور نفسِ کُلّی لوحِ محفوظ ہے۔ دُوسرے الفاظ میں عقلِ کُلّی سے امامؑ کی عقل مُراد ہے اور نفسِ کُلّی امامؑ کی رُوح ہے۔ جب امامؑ کی رُوح لوحِ محفوظ ہے اور قرآن لوحِ محفوظ میں عظمت و بزرگی والا قرآن ہے [تو] اِس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کا معزّز اور با کرامت ہونا امامؑ کی وجہ سے ہے یعنی قرآن جب امامؑ کی رُوحانیت میں ہے تو وہ ایسا نہیں ہے جو ظاہری قرآن ہے وہ تو وہاں امامؑ کی رُوحانیت میں زندہ معجزات اور بولنے والی آیات کی صورت میں ہے۔

اِس سے ہم کو ایک بنیادی تصوّر ملتا ہے وہ یہ کہ ہمیں دیکھنا ہوگا کہ قرآن اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی کتاب ہے اور یہ آنحضرتؐ پر نازل ہوا اور حضورؐ ہی نے لوگوں کے سامنے پیش کیا، سمجھایا اور اُس کی مشکلات کی تحلیل کی اور اگر قرآن ایسا ہوتا کہ اُس میں پیغمبر کی مدد کی ضرورت نہ ہوتی اور خود بخود لوگ اُس کو سمجھ پاتے تو ہم کہہ سکتے کہ قرآن اِس طرح سے ٹھیک ہے، لیکن بہت سی مثالوں سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن کے ساتھ معلّمِ قرآن کا ہونا لازمی اور ضروری ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کی جتنی تعریف و توصیف کی گئی ہے مثلاً اُس کے اندر لوگوں کے لیے ہدایت ہونا، اُس میں حکمت ہونا، اُس میں علم ہونا اور اُس کا با کرامت ہونا وغیرہ وغیرہ تو یہ ساری تعریف و توصیف اُس وقت دُرست ہے جبکہ اُس کی وابستگی امامؑ کے ساتھ ہے۔ یہ بہت بنیادی بات ہے یعنی قرآن کی مکمّل شان اُس وقت ظاہر ہو جاتی ہے جبکہ وہ پیغمبرؐ کے ساتھ یا کہ امامؑ کے ساتھ ہو اور جب پیغمبرؐ اور امامؑ سے الگ ہو تو یہ صحیح بات ہے کہ قرآن کی شان گھٹ جاتی ہے۔ وہ اِس طرح سے کہ آج جن لوگوں نے ہادیٔ برحق کے وسیلے کے بغیر قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کا دعویٰ کیا ہے اور نتیجے کے طور پر جتنے اختلافات پیدا ہوئے ہیں جو جھگڑے ہوتے ہیں، مسئلہ حل نہیں ہوتا، خدا کے وعدے پورے نہیں ہوتے ہیں تو پھر اِس سے قرآن کی شان گھٹ جاتی ہے۔

ہم دعوے سے کہہ سکتے ہیں کہ رسول اللہؐ کے زمانے میں قرآن کی جو شان تھی یا علیؑ اور اولادِ علیؑ کے ائمہ کی تابعداری کرنے والوں میں قرآن کی جو شان تھی وہ شان اُن مختلف الخیال مسلمانوں کے درمیان نہیں ہے جنہوں نے ہادیٔ برحق کے دامن کو چھوڑ کر آپس میں اختلافات شروع کیے اور قرآن کے بھید اُن کو نہیں ملے۔ چونکہ وہ رسول اللہؐ کی اُمّت

تھے اور اہلِ قرآن تھے اُن کی کمزوریوں اور خامیوں کی وجہ سے قرآن کی شان گھٹ جاتی ہے، اِس کے برعکس قرآن کی تعلیمات کو معلّمِ قرآن کے وسیلے سے حاصل کرنے سے قرآن کی شان دوبالا ہو جاتی ہے۔

۱۱۔ مطہّر (۸۰:۱۳)(۵۶:۷۹):

اِس کے بعد امامؑ کا نام مطہّر ہے یعنی پاک اور پاکیزہ اور قرآن کا نام تذکرہ [نصیحت] ہے۔ اِن دو ناموں کی آپس کی مناسبت یہ ہے فِیۡ صُحُفٍ مُّکَرَّمَۃٍ (۸۰:۱۳) تو پاک صُحُف میں قرآن ہے۔ گویا ایک کتاب کے اندر ہے، یعنی وہی بات جو پہلے بتائی گئی تھی کہ امامؑ کی نورانیت اور رُوحانیت میں قرآن موجود ہے اور فرمایا گیا ہے کہ لَّا یَمَسُّہٗۤ اِلَّا الۡمُطَہَّرُوۡنَ (۵۶:۷۹) جہاں قرآن ایک چھُپی ہوئی کتاب کے اندر پوشیدہ ہے تو اُس تک کسی کی رسائی نہیں ہوتی ہے سوائے اُن حضرات کے جو پاک اور پاکیزہ ہیں تو یہ امامؑ کی رُوحانیت میں قرآن موجود ہونے کا ذکر ہے اور اُس تک اماموں کے بعد حجّتوں پیروں اور داعیوں کی رسائی کا ذکر ہے اور تذکرہ نصیحت کو کہتے ہیں، بیشک صحیح معنوں میں نصیحت جو سمجھنے کے قابل ہے وہاں پر قرآن ہے۔

قرآن صحیح نصیحت اُس مقام پر ہے جہاں امامؑ کی رُوحانیت اور نورانیت کا مقام ہے اور اُس تک ہر کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی ہے بلکہ اُن حضرات کی رسائی ہوتی ہے جو کہ ہر طرح سے پاک اور پاکیزہ ہیں۔ تو ایسے پاک اور پاکیزہ اہلِ بیتِ اطہار ہیں اور اُن کا ٹائٹل بھی طاہر اور مُطہّر اور اطہار ہے اور اُن کی پاکیزگی کی شہادت قرآن سے ملتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ بیت کو پاک اور پاکیزہ بنایا تھا (۳۳:۳۳)۔ اور اُن کو پاک اور پاکیزہ بنانے کا کوئی مقصد تھا اور وہ مقصد دینی قسم کا ہونا چاہیے۔ اُس مقصد کا تعلّق اُمّت سے اور جماعت سے ہونا چاہیے وہ یہ کہ جہاں اللہ تعالیٰ نے اہلِ بیت کو پاک اور پاکیزہ بنایا تو اُس کا اشارہ ہے کہ اہلِ بیت کے تمام اَئمہؑ اِس طرح سے پاک اور پاکیزہ ہیں اور اُن کے پاک اور پاکیزہ ہونے کا مقصد یہ ہے کہ وہ ہمیشہ نور سے وابستہ رہیں اور کتابِ الٰہی سے رُوحانی طور پر اُن کی رسائی ہو۔ کتابِ مکنون اُن کے سامنے ہو تاکہ اِس وسیلے سے قرآن کی رُوح اور رُوحانیت سے اُمّت کو فیض دلایا جا سکے۔

تو خداوندِ عالم نے اہلِ بیت کی پاکیزگی کی جو شہادت دی یا اُن کو جیسے پاک اور پاکیزہ بنایا اُس کا مقصدِ اعلیٰ یہ ہے کہ وہ ہمیشہ رُوحانی طور پر قرآن کی رُوح کے ساتھ رہیں اور قرآن کی رُوح اُن میں رہے تاکہ اِس سے ہدایت میں کوئی کمی واقع نہ ہو اور پھر وہ اُمّت کے اُن افراد کو پاک اور پاکیزہ بنائیں جو اُن کے تابعدار ہیں۔ کیونکہ پیغمبرؐ کے کاموں میں سے ایک اہم کام یہ بھی تھا کہ وہ افرادِ اُمّت کو پاک اور پاکیزہ بناتا تھا۔ قرآن میں کئی طرح سے اِس امر کا ذکر آیا ہے ایک وہاں پر جہاں زکات لینے، صدقہ لینے کا ذکر آیا ہے اِرشادِ خداوندی ہے: خُذۡ مِنۡ اَمۡوَالِہِمۡ صَدَقَۃً تُطَہِّرُہُمۡ وَ تُزَکِّیۡہِمۡ بِہَا وَ صَلِّ

عَلَيۡهِمۡ ؕ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمۡ (۹:۱۰۳) اے رسول آپؐ اصحاب کے، اُمّت کے اموال میں سے ایک صدقہ لے لیں تا کہ جس سے آپ اِن کو مالی اور جانی طور پر پاک اور پاکیزہ بنائیں، تو آپ جانتے ہیں کہ جو خود پاک اور پاکیزہ نہ ہو وہ دُوسروں کو کیا پاک اور پاکیزہ کرسکتا ہے۔ اسی طرح [ایک] اور ارشاد آیا ہے کہ: رسولؐ امّت کے تابعدار افراد کو کتاب سکھاتے ہیں اور حکمت سکھاتے ہیں اور اُن کو پاک اور پاکیزہ کرتے ہیں (۲:۶۲)۔ اِس سے معلوم ہوا کہ علمی طور پر بھی پاکیزگی ہوتی ہے۔ لیکن شرط یہ ہے کہ علم دینے والا خود پاک ہو تو بیشک وہ دُوسرے کو بھی پاک اور پاکیزہ کرسکتا ہے۔ اِس لیے امامؑ کا ہر طرح سے پاک اور پاکیزہ ہونا ضروری ہے، اِس لیے خداوندِ عالم نے اُن کی پاکیزگی کا ثبوت آیۂ تطہیر میں پیش کیا۔ آپ جانتے ہیں کہ دُنیا میں مادّی طور پر وہی پانی کسی کو پاک اور پاکیزہ کرسکتا ہے جو کہ خود پاک اور پاکیزہ ہو اور کوئی گندا پانی کسی کو پاک اور پاکیزہ نہیں کرسکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ امامؑ کو طاہر اور مطہّر کہا گیا ہے اور یہ ایک بہت ضروری عنوان ہے پاکیزگی، اور پاکیزگی کے بغیر دین کی عبادات ظاہری و باطنی اور علم و عمل کی کوئی چیز دُرست نہیں ہو سکتی ہے [اور] نہ خدا کی دوستی ہوسکتی ہے۔

۱۲۔ نور (۲۴:۳۵) (۴۲:۵۲):

اِس کے بعد نور آیا ہے۔ نور امامؑ کا بھی نام ہے اور نور قرآن کا بھی نام ہے دونوں کے ریفرنس الگ الگ ہیں اور امامؑ کا جہاں نام نور ہے وہ [حوالہ ہے] يَهۡدِى اللّٰهُ لِنُوۡرِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ (۲۴:۳۵)۔ ویسے تو بہت سی آیتوں میں امامؑ کے نور ہونے کا ذکر ہے لیکن یہ حوالہ اِس لیے ہے کہ خدا فرماتا ہے: يَهۡدِى اللّٰهُ لِنُوۡرِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ اللہ جس کو چاہے اپنے نور کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ تو نور خود بھی ہدایت ہے لیکن اِس سے پہلے بھی ایک ہدایت آتی ہے يَهۡدِى اللّٰهُ لِنُوۡرِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ سے دو قسم کی یا دو مرحلے کی ہدایت کا ذکر ہوتا ہے۔ ایک وہ ہدایت جو نور سے پیشتر ہے دُوسری وہ ہدایت جو نور تک پہنچنے کے بعد کی ہے۔ نور تک پہنچنے کے بعد کی جو ہدایت ہے وہ تقریباً آٹو میٹک ہدایت ہے اور اُس سے پہلے جو ہدایت ہے وہ مشکل ہدایت ہے۔ يَهۡدِى اللّٰهُ لِنُوۡرِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ خدا کے اختیار سے ہدایت ملتی ہے کسی کو اِس کا یہ اشارہ ہے کہ قرآن کی ظاہری تعلیمات یا کہ خدا اور رسولؐ کی ہدایات کے نتیجے میں جس کو امامؑ کی شناخت حاصل ہوئی تو یہ ہوا يَهۡدِى اللّٰهُ لِنُوۡرِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ۔ امامؑ نور ہے اور نور کی طرف ہدایت کرنا یہ ہے کہ خدا کے اور رسولؐ کے ارشادات کے وسیلے سے کسی کو نور ملے۔ جیسے اُن افراد کو نور کا رستہ ملا تھا جو رسول اللہؐ کے زمانے میں تھے، جو علیؑ کی شناخت رکھتے تھے یہ محض خدا اور رسولؐ کے ارشادات کے وسیلے سے تھا، ابھی تو علیؑ نے کوئی شکایت نہیں کی تھی تو یہ ہوا يَهۡدِى اللّٰهُ لِنُوۡرِهٖ مَنۡ يَّشَآءُ (۲۴:۳۵)۔

اب اِس میں نور کی ہدایت کا ذکر نہیں ہے صرف نور سے پہلے جو ہدایت ملتی ہے [یعنی] خدا اور رسولؐ کے اقوال

اور فرامین سے، تو اِس لیے نور کی شناخت کے لیے اور نور کی اہمیت کے لیے ہم نے یہ حوالہ یہاں دیا ہے۔ اب اِسی طرح قرآن کے ناموں میں سے ایک نام نور ہے یہ ذکر جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِیْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا (۴۲:۵۲) میں آیا ہے تو قرآن بھی نور ہے، لیکن دو نور نہیں ہو سکتے ہیں امامؑ الگ نور ہو اور قرآن الگ نور ہو یہ بات ہرگز نہیں ہو سکتی ہے۔ اگر قرآن کا نور ہونا ممکن ہوتا تو خدا یہ نہ فرماتا کہ: اُس نے ظاہر کتاب بھیجی ہے اور ساتھ ساتھ نور بھی بھیجا ہے (۵:۱۵)۔ یہ بات نہ ہوتی اور اُس کو یا تو نور کہا جاتا یا کتاب کے دو نام نہیں ہوتے۔ اور جب یہ بات دُرست ہے کہ کتاب خود نور نہیں ہے اِس لیے اُس کے لیے نور کی ضرورت ہوئی، یعنی معلّمِ قرآن کی ضرورت ہوئی جو نور ہے۔ تو پھر یہاں پر کتاب کو نور کہنے کے کیا معنی ہیں؟ اِس کے یہ معنی ہیں کہ جب قرآن امامؑ میں ہے اور امامؑ کی رُوحانیت میں ہے، امامؑ کی نورانیت میں ہے تو قرآن نور ہے۔

جس طرح کہ لوہا جب آگ کی بھٹّی میں ہے تو آگ ہے۔ جب لوہا آگ سے الگ ہے اور سُرخ انگارے کی طرح نہیں ہے ٹھنڈا ہے تو لوہا ہے۔ دُنیا کے اندر بہت سی چیزیں آپ کو ایسی ملیں گی جن کی دو دو حیثیتیں ہیں۔ پانی برف نہیں ہے پانی ہے لیکن جہاں پانی فریج میں رکھا جاتا ہے تو وہ برف ہے۔ سمندر بادل نہیں ہے سمندر ہے لیکن سمندر میں سے جو پانی ہواؤں میں ہے اور بادلوں کی شکل میں ہے تو وہ بادل ہے۔ اِسی طرح قرآن کی بھی دو حیثیتیں ہیں ایک یہ حیثیت جو ظاہر میں ہے آپ کے سامنے یہ نور نہیں ہے، اگر یہ نور ہوتا تو اِس کے پڑھنے والوں کے درمیان اختلاف نہ ہوتا اور اِس کے پڑھنے والوں کو کوئی اُلجھن نہ ہوتی۔ قرآن نور ہے اُس وقت جبکہ یہ امامؑ کے نور کے اندر ہے۔

جیسا کہ ہم نے گزشتہ مجلس میں سات نمبر کے نکتے میں قرآن کو رُوح ثابت کیا تھا اور اُس میں کہا گیا تھا کہ قرآن بیشک رُوح ہے لیکن امامؑ کی رُوحانیت میں، اِسی طرح قرآن رُوح ہے لیکن امامؑ کی نورانیت میں۔ امامؑ کی نورانیت میں قرآن نور ہے اور اِس کے علاوہ نہیں امامؑ کو بعض دفعہ کتاب کہا جاتا ہے امامؑ کی بھی دو حیثیتیں ہیں۔ ایک امامؑ کی لفظی حیثیت، معنوی اور کتابی حیثیت ہے جو قرآن ہے اِس معنی میں امامؑ کو کتاب کہا جائیگا اور امامؑ کی دُوسری حیثیت وہ ہے جو اُس کی شخصیت کے اندر ہے، اِس معنی میں امامؑ کو نور کہا جائے۔ امامؑ اور قرآن ایک دُوسرے کے اندر ہیں، امامؑ قرآن میں ہے [اور] قرآن امام میں ہے۔ جہاں امامؑ قرآن میں ہے تو کس طرح ہے؟ الفاظ، اسماء، معنی، تاویل، حکمت اِن حیثیتوں میں امام قرآن کے اندر ہے۔ مطلب اِس کا یہ ہوا کہ قرآن کی جو حیثیت ہے اُس حیثیت میں امام قرآن کے اندر ہے تب تو امام کو کتاب کہا جا سکتا ہے اور تاویل میں آپ جائیں گے تو امام کو کتاب کہا گیا ہے، اِسی سبب سے کہ وہ کتاب کے اندر ہے۔ اور قرآن امامؑ کے اندر کس حیثیت میں ہے؟ امامؑ چونکہ ایک نور ہے ایک رُوح ہے اور ایک بولنے والی شخصیت ہے تو جہاں قرآن امامؑ کے اندر ہے وہاں قرآن بولنے والا ہے، نور ہے، رُوح ہے وہاں قرآن کی ایسی حیثیت ہے۔

ایک اور نکتہ آپ ہمیشہ کے لیے یاد رکھئے گا وہ یہ کہ بعض دفعہ قرآن کو امامؑ کہا گیا ہے، آپ جانتے ہیں کہ امامؑ کے معنی سردار، امامؑ کے معنی پیشوا، امامؑ کے معنی رہنما۔ تو قرآن جب امامؑ میں ہے تو دُرست ہے امام، صحیح معنوں میں امام، مگر امامؑ کے بغیر نہیں۔ قرآن میں آیا ہے کہ آنحضرتؐ کی نبوّت اور رسالت کی گواہی دو طرح سے ملتی ہے۔ ایک یہ کہ وہ راہِ راست پر ہیں اور اُن کے ساتھ ساتھ اُن میں سے ایک ہستی، ایک شخصیت اُن کے پیچھے پیچھے جانشین اور خلیفہ کی حیثیت سے آرہی ہے جو علیؑ ہے اور اِس سے قبل کتابِ موسیٰؑ بھی گواہی دیتی ہے یعنی موسیٰؑ کی کتاب جو تورات تھی تو اِس معنی میں کتابِ موسیٰؑ سے مُراد ہارونؑ تھے۔ موسیٰؑ کی اصل کتاب جو اُس کی زندگی میں کام کرے اور اُس کے بعد بھی کام کرے ہارونؑ تھے اور ہارونؑ کے اندر تورات تھی۔ جہاں تورات ہارونؑ کے اندر تھی وہ امام تھی۔

اِس وقت یہاں پر ایک اور نکتہ بیان کرونگا، ہمارے بھائیوں نے، مسلمانوں نے یہ کہہ دیا کہ: اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوۡنَ (۹:۱۵) قرآن جس کا نام ذکر ہے، ذکر کو ہم ہی نے نازل کیا اور ہم ہی اِس کے نگہبان ہیں محافظ ہیں۔ اِس سے ہمارے مسلمان بھائی یہ پیش کرنا چاہتے کہ قرآن میں ذرّہ بھی فرق نہیں ہے کیونکہ خدا نے اِس کی حفاظت کی ضمانت دی ہے، جو کہتے ہیں ہم ہی اِس کے نگہبان ہیں تو کون اِس میں کیا کرسکتا ہے۔ قرآن میں تحریف یعنی تبدیلی ہوئی ہے یا نہیں ہوئی ہے ہم اُس سے بحث نہیں کرتے ہیں لیکن اِس آیت کے صحیح ترجمہ کرنے میں جو انہوں نے غلطی کی ہے اُس کی طرف کچھ اشارہ کرتے ہیں۔ وہ یہ کہ خداوندِ عالم نے فرمایا کہ ذکر ہم نے نازل کیا ہے اور اُس کے نگہبان ہم ہی ہیں۔ اِس کا مطلب یہ نہیں کہ دُنیا میں قرآن نازل ہونے کے بعد اِس کو کوئی کچھ نہیں کرسکتا ہے۔ اصل مطلب اِس کا یہ ہے کہ جہاں خداوندِ عالم نے اُم الکتاب سے قرآن کو نازل کیا اور جیسے اُس نے لوحِ محفوظ سے قرآن کو نازل کیا اور جس طرح وہ اب تک لوحِ محفوظ میں محفوظ ہے قرآن، اور جس طرح قرآن امامؑ میں ہے۔ اِن حفاظتوں اور ضمانتوں کی بناء پر خدا کہتا ہے کہ قرآن اور کہیں سے نازل نہیں ہوا ہمارے حضور سے جب نازل ہوا تو ہمارے پاس اُس کا ریکارڈ ہے، ہمارے پاس اُس کی کاپی ہے۔

دُنیا کا کوئی ادارہ جب کہتا ہے کہ کاپی، (Circular)، لیٹر ہم نے بھیجا تھا تو اُس کے نگہبان ہم ہی ہیں اِس میں لوگوں کی طرف سے ضمانت لینے کی کوئی بات نہیں ہے۔ لیکن اپنے ریکارڈ کو دُرست کرنے کی بات ہے کہ ہر کامیاب ادارہ یا دفتر یا (Person) جب کوئی (Circular) یا لیٹر یا کوئی تحریری چیز بھیجتا ہے تو البتہ اُس کا ریکارڈ اُن کے پاس موجود ہوتا ہے، اِس آیت کے اندر یہ اشارہ ہے، خدا قرآن کے دُوسرے ارشادات میں بھی اِس جیسے اشارے کرتا ہے۔ خدا کہتا ہے کہ وہ جس کو چاہے مِٹاتا ہے اور جس کو چاہے ثابت رکھتا ہے پھر کہتا ہے کہ اُس کے پاس اُم الکتاب (۳۹:۱۳) ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ اُم الکتاب سے کوئی چیز مِٹ نہیں سکتی جو لوحِ محفوظ ہے اور اُس کے باہر کوئی چیز مٹائی جاسکتی ہے۔ لوحِ محفوظ اِس معنی میں لوحِ محفوظ ہے کہ اُس کے اندر سب چیزوں کا ریکارڈ ہے۔ سب چیزیں محفوظ ہیں رُوحانی شکل وصورت

میں ہر چیز محفوظ ہے تو پھر دُنیا میں کوئی چیز بھُلائی جائے کوئی چیز منسوخ کی جائے ممکن ہے۔ خدا یہ بھی فرماتا ہے کہ: مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا (۲:۱۰۶)۔ اِس آیت کے اندر ناسخ اور منسوخ کا ذکر ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ جب ہم کسی آیت کو منسوخ کرتے ہیں یا کسی آیت کو فراموش قرار دیتے ہیں تو اُس جیسی آیت دُوسری لے آتے ہیں۔ خود ہی کہتے ہیں کہ کئی آیتیں فراموش کرائی گئیں، کئی آیتیں منسوخ ہو چکیں۔ آیۂ رجم کے بارے میں کہتے ہیں کہ آیۂ رجم منسوخ التلاوۃ ہوئی تھی۔ یعنی اُس کا پڑھنا اور اُس پر عمل کرنا منسوخ ہو چکا تھا، اِس واسطے داخلِ قرآن نہیں ہے۔ اور اگر یہ آیت اِس باب میں ہے کہ خدا اِس قرآن کی حفاظت چاہتا ہے، تو یہ قرآن اُس شکل میں کیوں نہیں ہے جس میں کہ لکھا گیا تھا۔ یعنی خدا جس چیز کو محفوظ کرنا چاہے گا اور جس کو وہ محفوظ رکھے گا اُس کو کُلّی طور پر محفوظ رکھے گا اور ذرّہ بھر اُس میں تبدیلی نہیں آئے گی۔

آج ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن کے زیر، زبر، پیش اور علامتیں پہلے نہیں تھیں اور تحریری شکل اور بہت ساری چیزیں وہ نہیں ہیں جو نزولِ قرآن کے وقت تھیں اور یہ نقطہ کہاں سے آئے۔ دُرست ہے ہم مانتے ہیں یہ قرآن کی ترقّی ہے تو اگر قرآن کی ظاہری تحریر میں ترقّی ہو سکتی ہے تو اُس کے معنی میں اُس کے تعمیل میں ترقّی کیوں نہیں ہو سکتی، اُس کی تاویل میں، اُس کی حکمت میں کیوں ترقّی نہیں ہو سکتی۔ بہر حال حفاظت اور ضمانت کی بات تھی تو خداوندِ عالم نے اگلی آسمانی کتابوں کی بھی حفاظت کی ہے اور وہ لوحِ محفوظ پر ہے اور وہ انبیاء اور ائمہ کی رُوحانیت میں ہیں نہ کہ ظاہر میں ہے۔

ٹرانسکرائب: سیما عظیم علی ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ق س کا پُرحکمت بیان

عنوان: صراطِ مستقیم اور اُس کی چار منزلیں، ہر چیز دائرے میں

کیسٹ نمبر: ۲۳ تاریخ: ۱۹۷۸/۹/۲۲، کراچی

Click here for Audio

صراطِ مستقیم اور اُس کی چار منزلیں:

آج ہماری علمی گفتگو جو ہوگی وہ صراطِ مستقیم کے بارے میں ہوگی اور اب اِس وقت آپ کے سامنے ایک نقشہ موجود ہے، یہ مثال کے طور پر صراطِ مستقیم کا نقشہ ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ رستہ چار حصّوں میں بٹا ہوا ہے اور درمیان سے اِس طرح دو حصّوں میں تقسیم ہے کہ شروع کی طرف اُوپر کا حصّہ زیادہ ہے اور نچلا حصّہ بہت کم ہے لیکن جیسے جیسے یہ رستہ آگے سے آگے جاتا ہے تو اُوپر کا حصّہ کم ہوتا چلا جاتا ہے اور نچلا حصّہ زیادہ سے زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ اُوپر کے حصّے کے شروع میں لفظِ تنزیل لکھا ہوا ہے اور اُس کے بعد ہر حصّے میں، ظاہر، ظاہر، ظاہر، ظاہر لکھا گیا ہے۔

اِس کے ساتھ ساتھ یہ بتانا تھا کہ یہ جو رستہ ہے وہ چار حصّوں میں کس طرح بٹ گیا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ رستہ جو چار حصّوں میں تقسیم ہوا ہے تو وہ پہلا حصّہ شریعت کا ہے، اُس کے بعد طریقت کا حصّہ ہے، پھر حقیقت اور آخر میں معرفت ہے۔ صراطِ مستقیم کے اِن چار حصّوں کو راہِ اسلام کی چار منزلیں کہا جاتا ہے اور مادّی طور پر جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ کہیں کوئی لمبا رستہ ہے تو اُس رستے کی منزلیں ہوا کرتی ہیں، منزل یعنی پڑاؤ اور اُترنے کی جگہ یا ٹھہرنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔

ویسے توجہ دلانے کے لئے میں کچھ زیادہ انگریزی جاننے والا نہیں ہوں اور زیادہ کی کیا بات ہے تھوڑی بھی نہیں جانتا ہوں لیکن آپ کو توجہ دلانے کے لئے کہ یہ جو شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت ہے اِن کو انگریزی میں (Four Stages of Islam) کہا جاتا ہے، آپ کو (Dictionary of Islam) میں یہ نام ملیں گے۔ اِس بات کا مقصد یہ ہے کہ یہ جو اصطلاحات ہیں شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت یہ اسلام میں مشہور ہیں اور خصوصاً تصوّف میں آپ کو اِن کا زیادہ تذکرہ ملے گا۔ ہر چند کہ شریعت والے جو اہلِ ظاہر ہیں وہ شریعت ہی کو مانتے ہیں اور اُس کے بعد طریقت، حقیقت، معرفت کو وقتاً فوقتاً الفاظ کے طور پر تو استعمال کرتے ہیں لیکن اِس طرح سے نہیں مانتے ہیں کہ اُن کو آگے بڑھنا ہے صراطِ مستقیم پر، وہ تو یہی خیال کرتے ہیں کہ شریعت جو ہے اُسی میں رہنے کا ہے، حالانکہ قرآنِ عظیم نے صراطِ مستقیم کا جو تصوّر دیا ہے وہ قابلِ غور ہے۔ اور وہ یہ کہ اسلام کی تشبیہہ اسلام کی تمثیل ایک رستے سے دی گئی ہے اور اُس کی مُراد یہ

ہے کہ لوگ سمجھ پائیں کہ راہِ اسلام پر آگے بڑھنا ہے اور ترقّی کرنی بھی ہے۔ رستے کا تصوّر ہمیشہ چلنے کے معنی دیتا ہے، آگے بڑھنے کے معنی دیتا ہے۔ میں آپ کو یہاں پر ایک بہت اہم (Point) بتاؤں گا جس سے کہ آپ خوش ہو جائیں گے اور اُس کے اندر ایسی مضبوط منطق ہو گی کہ آپ بالکل اُس سے مطمئن ہو جائیں گے وہ یہ کہ سب مسلمان روزانہ کئی مرتبہ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دُعا مانگتے ہیں جس کے معنی ہیں کہ اے پروردگار! ہم کو راہِ راست بتلا۔

میں نے ابھی اصل معنی نہیں بتائے، صرف اشارہ کیا بحث کے لئے، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ دُعا کن لوگوں کی طرف سے ہے۔ آیا اُن لوگوں کی طرف سے ہے جو راہِ راست پر ہیں یا کچھ ایسے لوگ یہ دُعا مانگتے ہیں جو کہ راہِ راست پر نہیں ہیں اور اُس سے باہر ہیں۔ چونکہ سب سے پہلے ہم کو چاہئے کہ لوگوں کی (Position) مقرّر کریں، پوزیشن کا تعیّن کریں۔ تو اگر یہ دُعا ایسے لوگوں کی طرف سے ہے جو رستے سے باہر ہیں تو اُس کے کچھ اور معنی ہوں گے اور اگر یہ دُعا اُن لوگوں کی طرف سے ہے جو کہ راہِ راست پر ہیں تو اِس کے کچھ اور معنی ہوں گے۔ یہ بہت اہم بحث ہے، بہت ضروری ہے آپ کے لئے۔ ہم الحمد میں دیکھتے ہیں، اِس دعا کے ماحول کو گرد و پیش کو دیکھتے ہیں تو اِس سے پتا لگتا ہے کہ یہ دُعا اُن لوگوں کی طرف سے نہیں ہے جو گمراہ ہو چکے ہیں۔ اس لئے کہ: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ ○ اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ○ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ○ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ (۱:۱۔ ۴)۔ اس اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ پر یقین آیا کہ یہ دعا کچھ ایسے لوگوں کی ہے جو کہ خدا کی عبادت کرتے ہیں، خدا کی وحدانیت کے لئے اقرار کر رہے ہیں اور صرف خدا کی ذات سے مدد مانگ رہے ہیں کسی اور سے نہیں، تو ایسے لوگ کس طرح کافر ہو سکتے ہیں اور کس طرح گمراہ ہو سکتے ہیں؟ خود ہی آگے چل کر کہتے ہیں کہ ہم کو انبیاء کا رستہ بتلانا اور اُن لوگوں کا رستہ نہیں بتلانا جو گمراہ ہو چکے ہیں یعنی جو لوگ گمراہ ہو چکے ہیں اُن کی قطار و شمار میں جانے سے ڈر رہے ہیں اور اُس سے پناہ مانگ رہے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ پیغمبروں کے پیچھے پیچھے چلیں، یہ دُعا کچھ ایسے لوگوں کی ہے۔ تو بات سمجھ میں آ گئی کہ یہ دُعا اُن کی طرف سے ہے جو راہِ اسلام پر ہیں۔

اب جب پتا چلا کہ یہ دُعا ایسے لوگوں کی طرف سے ہے جو کہ راہِ اسلام پر ہیں تو پھر: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (۱:۵)۔ کے معنی یہ نہیں ہوئے کہ خدایا! ہم کو راہِ راست کا پتا نہیں ہے، ہم گمراہ ہو چکے ہیں اور ہم کو راستہ بتلا کہ کہاں ہے؟ ہم نہیں جانتے ہیں، یہ اس مفہوم کی دُعا نہیں ہے۔ جب اِس مفہوم کی دُعا نہیں ہے بلکہ یہ دُعا اُن لوگوں کی ہے جو راہِ راست پر قائم ہیں، تو پھر اِس کا کیا مطلب ہے؟ وہ خود اِس رستے پر ہیں، مقصود کیا ہے جو کہا جاتا ہے کہ: اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (۱:۵) اِس کا مطلب یہ ہے کہ خدایا! ہم کو راہِ راست پر چلا، آگے سے آگے بڑھا اور ہم کو اِس رستے پر ترقّی دے، یہ مفہوم ہے اِس دعا کا۔ لیکن افسوس کی بات ہے کہ جو لوگ آج قرآن کا ترجمہ کر رہے ہیں یا تفسیر لکھ رہے ہیں اُن میں سے بہت تھوڑے لوگ ہیں جنہوں نے اِس لفظ کے ترجمے میں لکھا ہے کہ چلا، خدایا! ہم کو راہِ راست پر چلا یعنی اِس بحث کے نتیجے کے مطابق کہنا یہ

چاہیئے، سمجھنا یہ چاہیئے کہ خدایا! ہم کو راہِ راست پر چلا، کیونکہ دکھانے کے معنی کچھ اور ہوتے ہیں چلانے کے معنی کچھ اور ہوتے ہیں۔ دکھانے کے معنی میں یہ بات بھی آتی ہے کہ کچھ گمراہ لوگ تلاش کر رہے ہیں کہ اُن کو رستہ ملے، راہِ راست ملے، صراطِ مستقیم ملے، یہ معنی بھی ہیں اور اگر چلانے کے معنی کریں گے تو یہ بات صحیح ہوگی چونکہ یہ اُن لوگوں کی دُعا ہے جو کہ راہِ راست سے باہر نہیں ہیں راہِ راست پر ہیں، اب اُن کو چلنا چاہیئے اور اُن کو چلنے کی ضرورت ہے، لہٰذا اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ (۱:۵) سے چلنا مقصود ہے، اور جیسا کہ میں نے شروع میں کہا تھا کہ رستے کا تصوّر چلنے کے لئے ہے، آگے بڑھنے کے لئے ہے۔

آج الحمدللہ ہم اسماعیلی قرآن کی اِس حکمت کے بموجب راہِ راست پر چلتے چلتے یہاں تک پہنچے ہوئے ہیں۔ اِس رستے کا آغاز آنحضرت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے زمانے میں ہوا تھا اور وہیں سے لوگ منزلِ شریعت میں جمع ہوئے تھے وہ (Starting Point) پر جمع ہوئے تھے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کچھ مسافر کسی راستے پر جمع ہوتے ہیں اور چلنا شروع ہو جاتے ہیں تو شروع شروع میں وہ جمع ہوتے ہیں، جب (Start) ہوتا ہے، جب سفر کا آغاز ہوتا ہے تو اُن کے درمیان جو صلاحیت کا فرق ہے وہ نمایاں ہونے لگتا ہے کہ کوئی تو بیمار ہے، کوئی بوڑھا ہے، کوئی کمزور ہے، کوئی لنگڑا ہے اِس لئے چل نہیں سکتا ہے، لہٰذا تھوڑی دیر کے بعد یہ فرق نمایاں ہو جاتا ہے کہ وہ رستے میں پھیل جاتے ہیں لیکن شروع میں نہیں پھیلتے ہیں۔

اِس لئے جب رسول اللہؐ نے صراطِ مستقیم کے عنوان سے اسلام لایا اور لوگوں کو اسلام دیا، اُن کے سامنے رکھا اور اُن کو اکٹھا کیا تو اُس وقت رسول اللہؐ کے زمانے میں لوگ جمع تھے۔ گو کہ اُن کے اندر فرق و تفاوت کی صلاحیت موجود تھی کچھ کمزور تھے، کچھ طاقتور تھے، کچھ اِس قابل تھے کہ بہت جلد طریقت، حقیقت اور منزلِ معرفت کی طرف روان دوان ہو جائیں تو کچھ ایسے تھے کہ وہ شریعت ہی میں رہیں۔ تو اِس کے باوجود رسول اللہؐ کے زمانے میں بہت زیادہ فرق نہیں پایا جاتا تھا اور جیسے ہی زمانہ گزرتا گیا تو یہ فرق نمایاں ہوتا چلا گیا، حتیٰ کہ شریعت کے بعد طریقت کا زمانہ آیا اور تصوّف کے عنوان سے طریقت پر عمل ہونے لگا اور کچھ لوگ اسلام میں سے اُبھرے جو صوفی کہلاتے تھے اور تاریخی طور پر اُس کا ایک وقت تھا، وہ طریقت کا وقت تھا، طریقت کا زمانہ تھا۔ پھر اُس کے بعد حقیقت کا دَور آیا، چونکہ دُوسروں کی رسائی صرف منزلِ طریقت تک ہو سکتی تھی وہ وہاں پر رُکے اور پھر اِس کے بعد اسماعیلی ہی تھے جو طریقت سے بھی آگے بڑھے اور حقیقت کی منزل تک رسا ہو گئے، پہنچ گئے اور اِس بات کا ثبوت کہ وہ ایک منصوبہ تھا خدا اور رسولؐ کے نزدیک کہ آنحضرتؐ کے بعد کچھ لوگ شریعت سے طریقت میں اور طریقت سے حقیقت میں ترقّی کریں گے اور اِس منصوبے کا تھوڑا سا اشارہ میں آپ کو کرتا ہوں، وہ یہ ہے کہ رسول اللہؐ نے ایک دن مولا علیؑ کی شان میں فرمایا کہ: اِنَّ مِنْكُمْ مَنْ يُقَاتِلُ عَلٰى تَاوِيْلِ الْقُرْاٰنِ كَمَا قَاتَلْتُ عَلٰى تَنْزِيْلِهٖ (شرح الاخبار، الجزاء الرّابع، ص: ۳۳۷)۔ فرمایا کہ اے لوگوں! بے شک وہ شخص بھی تمہارے درمیان ہی

ہے جو کہ میرے بعد قرآن کی تاویل پر جنگ کرے گا، جہاد کرے گا، جس طرح کہ میں نے قرآن کی تنزیل پر جنگ کی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ اِن دو لفظوں کی وضاحت کی ضرورت ہو، جو کہ ایک لفظ پیغمبر کے لئے مقرّر ہوا اور دُوسرا لفظ علی کے لئے اور وہ تنزیل اور تاویل ہے۔ تو دیکھئے! تنزیل قرآن کے ظاہر کو کہتے ہیں اور تاویل اُس کے باطن کو کہتے ہیں۔ پیغمبر نے فرمایا کہ جس طرح میں نے قرآن کے ظاہری احکام منوانے کے لئے جنگ کی تھی اِسی طرح مولا علیؑ قرآن کے باطنی احکام پر عمل کرانے کے سلسلے میں جنگ کریں گے۔ اب یہ سوال الگ ہے کہ علیؑ نے کس قسم کی جنگ کی۔ یہ تو ظاہر ہوگیا کہ یعنی اسلام کی جدو جہد جاری تھی.

<u>ہر چیز دائرے میں:</u>

چونکہ ہماری مقدّس محفل کا یہ اُصول رہا ہے کہ اِس میں علم کی باتیں بھی ہوتی رہتی ہیں اور بے شک یہ ضروری ہے کہ محفل کے وقت کا ایک حصّہ علم کی باتوں میں گزارا جائے۔ اِس لئے کہ علم بہت ہی ضروری ہے، علم کے بغیر مومن کی ترقّی ناممکن ہے یعنی رُوحانی ترقّی کا ایک حصّہ علم کی صورت میں ہے یا یوں کہنا چاہئے کہ اگر ایک حصّہ عبادت و بندگی ہے تو دُوسرا حصّہ ترقّی کا علم ہے اور علم کے بغیر مومن آگے نہیں بڑھ سکتا ہے۔ قرآن میں بھی جب آپ دیکھیں گے تو علم کی سب سے بڑھ کر تعریف ملے گی، اِس لئے علم کی حکمت کی بڑی اہمیت ہے۔

چنانچہ ہم چاہتے ہیں کہ آج صفحۂ کائنات کے بارے میں کچھ باتیں بتائیں یعنی یہ جو کائنات اللہ کی ایک عملی کتاب کی حیثیت سے ہے اِس کے بارے میں کچھ باتیں کریں گے۔ کیونکہ کائنات اللہ تعالیٰ نے اپنی سنّت و عادت کے مطابق بنائی ہے اِس لئے اِس کائنات کے عمل سے اللہ کی سنّت و عادت ظاہر ہوتی ہے یعنی اللہ کا جو قانون ہے وہ اِس کائنات سے ظاہر ہے اور ایک ہوشیار مومن کو چاہئے کہ وہ اللہ کے قانون کو اِس کائنات کے عمل سے سمجھے۔ کہنا یہ ہے کہ یہ آسمان، سورج، چاند، ستارے، زمین، پہاڑ، دریا، ہَوا، بارش اور کائنات کی ہر چیز زبانِ حال سے اللہ کے قانون کی ترجمانی کرتی ہے، ہر چیز خدا کی قدرتوں کا ذکر کرتی ہے خدا کے عجائبات کے بھیدوں کو ظاہر کرتی ہے۔ اِس کائنات کے اندر جاننے کے لئے بہت سے بھید ہیں، بیان کرنے کے لئے بہت سی باتیں ہیں لیکن ہم ایک (Point)، ایک نکتہ بیان کریں گے جو بہت ہی اہمیت والا نکتہ ہے یعنی بڑا اہم ہے وہ اِس کائنات کی گول شکل ہے یعنی جو نکتہ اہم ہے وہ یہ ہے کہ اِس کائنات کی شکل گولائی میں ہے اور اِس کے یوں ہونے میں بہت بڑی حکمت ہے۔

بحیثیتِ مجموعی نہ صرف کائنات کی شکل گول ہے بلکہ اِس عالم میں جو بھی چیز پیدا کی گئی ہے جو چیز بنی ہے، جو کچھ پایا جاتا ہے، اُس کی شکل گول ہے، مثلاً سب سے پہلے آسمان کو لیجئے! کہ آسمان گول ہے اِس کائنات کے ایک گول غلاف

کی حیثیت سے ہے، آسمان کی نہ صرف شکل گول ہے بلکہ اُس کی گردش بھی گول ہے۔ سورج خود گول ہے، چاند بھی ایسا ہے، ستارے سب کے سب ایسے ہیں، زمین بھی ایسی ہے، ہَوا کی شکل بھی گول ہے کہ زمین کے گرد اگرد ہوا کا جو کُرہ ہے یا ہوا کا جو غلاف ہے وہ گولائی میں ہے۔

پانی بھی زمین کے گرد اگرد ایک ادھورے غلاف کی طرح ہے اور اُس کی شکل گول ہے۔ پانی کی گردش بھی گول ہے کہ سمندر سے بادل بنتے ہیں، بادلوں سے بارش برستی ہے جس سے ندیاں بنتی ہیں پھر دریا اور سمندر بھرتا ہے پھر سمندر سے وہی عمل گولائی میں جاری رہتا ہے۔ دن رات بھی گولائی میں واقع ہیں کہ ایک طرف سے زمین پر زمین کا اپنا سایہ رات کے نام سے چلتا ہے اور دُوسری طرف سے دھوپ یعنی سورج کی روشنی جسے دن کہا جاتا ہے چلی جاتی ہے یعنی دن اور رات ایک (Circle) پر گردش کر رہے ہیں، اور موسم، موسموں کی تبدیلی بھی گولائی میں ہے، سردی گرمی بھی آپس میں جو بدلتی ہیں اُن کا چکر بھی گولائی میں ہے۔ زمین سے اُگنے والی چیزیں اُگتی ہیں اور پھر واپس زمین میں فنا ہو جاتی ہیں، مثلاً گھاس پات اور دیگر چیزیں اور فصل وغیرہ زمین سے پیدا ہوتی ہیں اور فصل سے جو غذائیں بنتی ہیں یا جو کچھ کھانے کی چیزیں بنتی ہیں پھر وہ آخر کار مٹی ہو جاتی ہیں اور پھر مٹی سے ایسی چیزوں کے پیدا ہونے کی امکانیت ہے۔

درخت کا سایہ بھی گولائی میں چکّر کاٹتا ہے، درخت کی پیدائش بھی گولائی میں ہے کہ درخت سے پھل اور پھل کے مغز سے وہ درخت اور پھر درخت سے پھل اور پھل سے درخت یہ بھی ایک گول چکر ہے۔ جانور اور انسان کی پیدائش بھی گولائی میں ہے کہ بچّہ جو شروع میں بچّہ ہوتا ہے وہ والدین سے پیدا ہوتا ہے اور بچّے والدین بن جاتے ہیں تو انسانیت کی تخلیق کے اندر بھی ایسا ایک چکّر ہے ایسی ایک گولائی نظر آتی ہے، یا یوں کہنا چاہئے انسان دُنیا میں آتا ہے اور جاتا ہے پھر آتا ہے اور بار بار آتا جاتا رہتا ہے، یہ بھی ایک گول چکر ہے۔ مرغی سے انڈا پیدا ہو جاتا ہے اور انڈے سے پھر وہی مرغی بنتی ہے۔ فنا سے بقا بنتی ہے، بقا سے فنا ہو جاتی ہے، یہی وجہ ہے کہ خداوندِ عالم نے فرمایا کہ ہر چیز ایک دائرے پر گردش کرتی ہے: كُلٌّ فِيْ فَلَكٍ يَّسْبَحُوْنَ (۳۶:۴۰)۔ یہ سورۂ یاسین میں ہے، یہ ایک اُصول ہے یہ ایک کلیّہ ہے جو خداوند نے فرمایا کہ ہر چیز ایک دائرے پر گردش کرتی ہے۔

بادلوں سے بارش کا ایک قطرہ گرتا ہے تو وہ بھی گول ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ ہر چیز کسی نہ کسی طرح سے گول ہے یا شکل میں گول ہے یا فعل میں گول ہے یا گردش میں گول ہے یا دو تین طرح سے گول ہے یا ایک طرح سے گول ہے۔ ہر لحاظ سے چیزیں گولائی میں ہیں اور اُن کی شکل گول ہے۔ یہ کیوں ایسا ہے؟ دیکھئے! لاانتہائی یعنی کبھی ختم نہ ہونے کا تصوّر اسی گولائی میں ہے اِس لئے ہم مان سکتے ہیں کہ خدا کی سلطنت ہمیشہ سے ہے۔ یہ جو ہم سے کہا گیا کہ ایک وقت تھا جس میں کہ کچھ بھی نہیں تھا اور پھر کائنات پیدا کی گئی، ہم کو شروع میں یہ تصوّر دیا گیا ہے لیکن ہم کو سوچنا چاہئے کہ ہو سکتا ہے کہ اِس کچھ نہ

ہونے سے پہلے یہی کائنات اِسی طرح سے تھی اور جس کو خدا نے مٹایا تھا پھر اِس کو بنایا اور جب کبھی خدا اِس کو مٹائے گا اِس کو نیست و نابود کر دے گا تو پھر اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ کائنات ہمیشہ کے لئے نیست و نابود رہے گی۔ پھر اِس کو خدا بنائے گا، اِس کو شکل دے گا، اِس کو وُجود دے گا، اِس کو ہستی میں لائے گا۔ ہر چیز کے گول ہونے کے معنی یہ ہیں کہ فنا اور بقا بھی باری باری سے آتی جاتی رہتی ہیں دن رات کی طرح۔ دیکھئے! کہ بے شک رات محدود ہے اور دن بھی محدود ہے لیکن اِن دونوں کے تبادلے سے جو سلسلہ بنتا ہے وہ سلسلہ لامحدود ہے اور دیکھئے! کہ وقت زمانے کا آغاز ہے اور آغاز نہیں بھی ہے، دونوں باتیں صحیح ہیں۔ جزوی طور پر دیکھا جائے تو وقت کا آغاز ہے اور کُلّی طور پر دیکھا جائے تو وقت کی کوئی ابتدا نہیں اور وقت کی کوئی انتہا نہیں جس کو ازل اور ابد کہا جاتا ہے۔ ازل کسی ابتدا کا نام نہیں، ابد کسی انتہا کو نہیں کہتے ہیں بلکہ ازل لاابتدا کو کہتے ہیں جس کی ابتدا نہ ہو، جو ہمیشہ سے ہو، ماضی کی نسبت سے وقت کی لاانتہائی کو ازل کہتے ہیں۔ ماضی کی نسبت سے وقت کی لاابتدائی کو ازل کہتے ہیں، مستقبل کی نسبت سے وقت کے ختم نہ ہونے کو ابد کہتے ہیں۔

انگلش میں اِس کا ایک اچھا سا ترجمہ (Timelessness) ہے یعنی ایسا وقت، ایسا زمانہ جس کا پایان نہ ہو، جس کی ابتدا اور انتہا نہ ملے تو یہ وقت کی لاانتہائی دو چیزوں کے تبادلے سے ہے، دو چیزوں کے تبادلے سے لاانتہائی بنتی ہے جس طرح دن رات کے تبادلے سے لاانتہا وقت بنتا ہے۔ فی نفسہٖ دیکھا جائے تو رات ختم ہو جاتی ہے اور اسی طرح دن بھی ختم ہو جاتا ہے لیکن دونوں کے ملنے سے جو سلسلہ بنتا ہے وہ سلسلہ کبھی ختم نہیں ہوتا ہے۔ اسی طرح فنا اور بقا کو الگ الگ لیں تو ہم کو کوئی سرا ملتا ہے جب دونوں کو ملا کر سلسلے کا تصوّر کیا جائے تو کبھی بھی زمانہ ختم نہیں ہوتا۔ یہ سبق ہم نے کائنات سے سیکھا ہے، کائنات نے ہم کو بتایا کہ جس میں کہ اللہ کی عادت ہے جس میں کہ اللہ کی سنّت ہے۔ تو اسی طرح یہ لازمی بات ہے کہ انسان بنتا ہے اور بگڑتا ہے شخصیت کے لحاظ سے۔ انسان کی رُوح کو دیکھا جائے تو وہ ایک حال پر ہے، جسم کو دیکھا جائے تو بنتا ہے اور بگڑتا ہے۔ خدا کے مرتبے کو دیکھا جائے تو وہ ایک حال پر قائم ہے، انسان کی ہستی کو دیکھا جائے تو انسان کی ہستی مٹتی ہے اور بنتی رہتی ہے لیکن انسان کا ایک سرا خدا میں ہے، انسان کی بقا یا کہ انا کا ایک سرا خدا میں ہے اور ایک سرا شخصیت میں ہے، جسم میں ہے۔ انسان اُس سرے کے اعتبار سے جو خدا کی طرف ہے ہمیشہ قائم و دائم ہے بلکہ خدا ہے اور اِس سرے کی نسبت سے یہ ہر وقت فنا اور بقا کے دروازوں سے گزرتا رہتا ہے یا کہ بنتا اور مٹتا رہتا ہے۔

یہ باتیں میرے نزدیک انقلابی ہیں اور اِن باتوں کے جاننے سے ہمارے سابقہ بہت سے نظریات متأثر ہو جاتے ہیں تو متأثر ہونے دیجئے اسی کو کہتے ہیں انقلاب، انقلاب کے بغیر ترقّی نہیں ہوتی ہے۔ کسی مملکت میں، کسی علم میں، کسی تعلیم میں انقلاب کے بغیر کوئی ترقّی نہیں ہوتی ہے اِس لئے کائنات کا یہ سبق ہے اور کائنات نے ہم کو یہ سکھایا کہ جس میں کہ اللہ کی عادت ہے، اللہ کی سنّت ہے۔ ہم نے سیکھا ہم نے جانا کہ انسان ہمیشہ سے ہے، آتا جاتا رہتا ہے اور اِسی آنے

جانے میں بڑی رحمت ہے کہ اگر انسان صرف آتا تو یہ بات اچھی نہیں تھی اور اگر جا کر نہیں آتا تو یہ بھی اچھی بات نہیں تھی، یعنی انسان اگر ایک طرف کا ہوتا تو اُس کو آدھی نعمت میسّر آتی چونکہ دُنیا میں آنا بھی نعمت ہے اور یہاں سے چلے جانا بھی نعمت ہے تو دونوں نعمتیں جفت ہیں۔ خدا نے بڑے خوبصورت الفاظ میں سورۂ یاسین کے اندر ارشاد فرمایا ہے کہ تمام چیزیں جوڑوں میں ہیں سُبْحٰنَ الَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا مِمَّا تُنْۢبِتُ الْاَرْضُ وَمِنْ اَنْفُسِهِمْ وَمِمَّا لَا یَعْلَمُوْنَ (۳۶:۳۶) کوئی چیز جوڑے کے بغیر نہیں سوائے ذاتِ خدا کے۔ اِس کا مطلب یہ ہوا کہ دُنیا میں آنا بھی ہے اور جانا بھی ہے پھر آنا بھی ہے اور جانا بھی ہے۔

جب دن رات جوڑے ہیں تو اِن کے جوڑے ہونے سے سلسلہ چالو رہتا ہے اِسی طرح انسان کا دُنیا میں آنا اور دُنیا سے جانا جوڑے ہیں، جفت ہیں جو کہ ہمیشہ کے لئے جاری ہے اور یہ اِس لئے کہ خدا کی نعمت کبھی ختم نہیں ہوتی ہے اور خدا کی نعمت اِس طرح سے واقع ہے کہ انسان دُنیا میں آئے اور جائے۔ اِس لئے کہ دُنیا آخرت کی کھیتی باڑی ہے اور اگر دُنیا آخرت کی کھیتی ہے تو کھیتی باڑی ایک دفعہ کے لئے نہیں ہوا کرتی ہے بلکہ وہ ہمیشہ کے لئے ہوتی ہے اور سال بہ سال کھیتی باڑی اور فصل سے فائدہ اُٹھایا جاتا ہے اِس لئے ایک بار آنے سے مقصد پورا نہیں ہوتا ہے۔ لہٰذا بار بار آنا پڑتا ہے گو کہ جلدی سے نہیں آیا جاتا، اُس میں کافی وقت لگتا ہے لیکن بہر حال آنا پڑتا ہے اور دیکھئے! ایک اور چیز میں آپ کو بتاؤں جو بہت اچھی بات ہے وہ یہ کہ انسان کے اندر جو جائز تقاضا ہے وہ تقاضا اِس لئے ہے کہ وہ ایک دن پورا ہوگا یعنی انسان اپنے بچپن کو چاہتا ہے اُس کو یاد کرتا ہے، جوانی کو چاہتا ہے انسان کا بچپن کو چاہنا یا گزرے ہوئے اوقات کو یاد کرنا اور اُن کو چاہنا اِس معنی میں ہے اور اِس لئے ہے کہ مدّتوں کے بعد اور زمانوں کے بعد پھر انسان کسی نہ کسی طرح سے دُنیا میں آجائے گا تا کہ خدا کی رحمت لاانتہا ہو، خدا کی مہربانی ختم نہ ہو اور مزا اِسی میں ہے کہ انسان ہمہ گیر ہو جائے۔

ایک لحاظ سے وہ جہاں خدا کے مرتبے میں ہے وہ قائم رہے اور ایک لحاظ سے جو اُس کی شخصیت ہے وہ دُنیا میں آئے لیکن ہاں! میں یہ بھی کہوں گا کہ آسمان گھومتا ہے وہ اپنی جگہ کو نہیں چھوڑتا پر گھومتا ہے اور اِسی گھومنے کے ساتھ ساتھ آسمان ہر جگہ پر ہے۔ اِس طرح ہم آخرت میں بھی ہیں اور دُنیا میں بھی ہیں ہم خدا کے حضور میں بھی ہیں اور شخصیت میں بھی ہیں بلکہ دیکھا جائے جب کسی کو نفسِ کُلّ کا درجہ دیا جائے گا تو وہ ہر جگہ پر خود کو پائے گا۔ سورج کی روشنی کو لیں! کہاں نہیں ہے؟ سب جگہ پر ہے، ہَوا کو دیکھیں! کہاں نہیں ہے ہر جگہ پر ہے، ہَوا کے اندر کتنے کتنے ذرّات ہیں لیکن اُن کی ایک (Unity) ہے اُن کی ایک وحدت ہے، ہَوا ایک چیز ہے، ایک بہت بڑی چیز ہے وہ ایک بہت بڑی چیز ہے اِس لئے وہ ہمہ گیر ہے، وہ ہمہ رس ہے، وہ (Overall) ہے۔ اسی طرح انسان کی رُوح (Omnipresent) ہے، وہ ہر جائی ہے، وہ ہر جگہ پر ہے جب وہ ہر جگہ پر ہے تو جس طرح وہ بہشت میں ہے، اِس طرح وہ دُنیا میں آتی جاتی رہتی ہے۔

اب میں نے جو آپ کو نفسِ کُلّ کا تصوّر دیا نفسِ کُلّ ایک شخص ہے، نفسِ کُلّ ایک ہستی ہے، نفسِ کُلّ ایک جان ہے،

نفسِ کُلّ ایک رُوح ہے جو ہر جگہ پر ہے۔ خدا کے تصوّر کو لیں خدا کے متعلّق کہا جاتا ہے کہ وہ ہر جگہ پر ہے لیکن خدا کے لئے ہر جگہ حاضر ہونا، حاضر رہنا کوئی بڑی بات نہیں ہے یہ تو رُوح کی صفت ہے، رُوح بسیط ہے رُوح کے متعلّق آپ تصوّر کریں کہ اِس کائنات کی کوئی جگہ نہیں ہے جہاں پر کہ رُوح نہیں ہے، جب ہم نفسِ کُلّ میں مل جائیں گے اُس کے ساتھ ایک ہو جائیں گے تو اُس وقت ایک کے بجائے ہزاروں ہوں گے، لاکھوں ہوں گے لیکن ہمارے اندر (Unity) ہوگی، ہم ایک ہوں گے اور لاکھوں ہوں گے۔ یعنی لاکھوں ہونے کے باوجود ہماری (Unity) ایک ہوگی، جس طرح کہ اب اِس وقت بھی ہمارے جسم کے بہت سے ذرّات ہیں، ہمارے اندر لاتعداد روحیں ہیں لیکن اُن کی ایسی (Unity) ہے کہ اِس (Unity) کی وجہ سے ہم کو پتا نہیں چلتا ہے کہ بہت ساری رُوحیں ہیں۔ ہماری یہ لاتعداد رُوحیں منظّم ہیں، متّحد ہیں، (United) ہیں اِس لئے پتا نہیں چلتا ہے کہ ہمارے اندر الگ الگ رُوحیں ہیں۔ ہمارے اعضاء جسم کے حصّے بھی الگ الگ ہیں، ہم کو پتا نہیں چلتا ہے کہ ہمارا کوئی عضو الگ ہے چونکہ سب اعضاء جسم سے وابستہ ہیں، جسم سے منسلک ہیں۔ اسی طرح ہماری سب رُوحیں، لاتعداد رُوحیں ایک انا سے منسلک ہیں، اسی طرح کل کو جب ہم ایک بڑے درجے تک پہنچیں گے اور نفسِ کُل سے وابستہ ہو جائیں گے تو اُس وقت نہ صرف ہم نفسِ کُل سے منسلک ہو جائیں گے، وابستہ ہو جائیں گے بلکہ کائنات بھر کی رُوحوں سے ہمارا اتحاد ہو جائے گا۔ اور فرض کریں سمندر کو اگر شعور ہوتا تو سمندر کہتا کہ پانی کا احاطہ جہاں سے جہاں تک ہے یعنی پانی کی جو جو چیزیں بنتی ہیں، اُگنے والی چیزیں جنہیں نباتات کہا جاتا ہے، جانور اور تمام چیزیں جن میں رطوبت، جن میں تری پائی جاتی ہے، تو اُن تمام چیزوں میں پانی ہے یہاں تک کہ ہَوا کے اندر بھی پانی کا ایک حصّہ ہے یعنی نمی ہے، ہَوا میں بھی پانی کا ایک عنصر ہے۔ اب سمندر کہتا ہے کہ ندّی بھی میں ہوں، طوفان بھی میں ہوں، بارش بھی، بادل بھی، چشمے بھی، برف و باران بھی اور دریا بھی، نباتات، جانور، پھل، فصل اور ہر چیز میں ہوں یہ سمندر دعویٰ کرتا ہے تو اِس کا یہ دعویٰ کرنا صحیح ہے۔ ایک قطرہ دعویٰ کرتا ہے یا پورا سمندر دعویٰ کرتا ہے تو ایک ہی بات ہے۔

اسی طرح جو رُوح کا ذرّہ کُل سے ملے گا تو وہ ذرّہ ہر بات کا اور ہر چیز کا دعویٰ کرے گا، یعنی عالمگیر رُوح کے حدود جہاں سے جہاں تک ہیں رُوح کا وہ ذرّہ اُن تمام حدود میں خود کو پائے گا۔ اِس لئے کہ اِس کے باوجود رُوح کے آنے جانے کا جو مسئلہ ہے وہ اپنی جگہ پر صحیح رہے گا، اِس لئے بعض صوفیوں نے جلال میں آ کر عجیب و غریب دعوے کئے ہیں۔ مولائے رُوم کی مثنوی ہے، آپ ذرا اُس کو پڑھ کر دیکھیں کہ وہاں پر بعض دفعہ کسی صوفی کی طرف سے، کسی بزرگ کی طرف سے ترجمانی ہوتی ہے اور وہ کتنے کتنے دعوے کرتا ہے۔ یہاں تک کہ بعض دفعہ کوئی صوفی خود کو خدا بھی قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ سب کچھ میں ہوں۔ تو یہ اِس لئے ہے کہ اِس کائنات کے اندر ایک (Unity) ہے، یہاں تک کہ خدا اور مخلوق کے اندر بھی (Unity) ہے یعنی خدا اور مخلوق کے آپس میں بھی وحدت ہے۔ وحدت ایک ایسی چیز ہے کہ اُس سے کوئی چیز باہر

نہیں جاسکتی ہے یعنی (Unity) ایک ایسی چیز ہے۔ یہ سب باتیں ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو عقل سے بالاتر ہیں یہ سب عشق کی باتیں ہیں اور عشق جو ہے وہ عقل سے اُوپر ہے۔ عقل کو ادب کا لحاظ رہتا ہے، عقل ڈرتی بھی ہے، عقل نارسا بھی ہے، عقل (Limited) بھی ہے، محدود بھی ہے، لیکن عشق کے مرحلے پر جانے کے بعد عشق میں کوئی خوف نہیں ہے، عشق میں کوئی بڑائی، چھوٹائی نہیں ہے، کوئی دُوئی نہیں ہے، کوئی بیگانگی نہیں ہے، کوئی قانون نہیں ہے اور چونکہ جو حقیقی عشق ہے وہ خدا اور مخلوق کو آپس میں ملا دیتا ہے، اُن کو ایک ثابت کرتا ہے، اُن کو ایک کر کے دکھاتا ہے۔ تو یہ کائنات کی گولائی اِس لئے ہے کہ جو چیز جہاں سے آئی تھی وہاں پر جاتی ہے۔ اِس گولائی کے یہ معنی ہیں کہ اگر ہم خدا سے آئے ہیں حکم کی صورت میں، امر کی حیثیت میں خدا کے منشا کے طور پر جس طرح سے بھی آئے ہیں، خدا سے آئے ہیں لیکن ہم خدا میں واپس جانے والے ہیں اور ایسا ہی بننے والے ہیں جیسا کہ پہلے تھے۔ گول چیز کے یہ معنی ہیں اور گولائی سفر کے یہ معنی ہیں اور لاانتہائی اسی طرح سے ہے۔

آپ دو شکلیں فرض کریں، ایک شکل ہے لکیر کی طرح اُوپر سے نیچے یا دائیں سے بائیں کو، ایک شکل ہے دائرہ یعنی گول۔ آپ ایک خط یا کہ ایک لکیر پر سوال کا جواب نہیں دے سکیں گے، خدا کا تصوّر نہیں کرسکیں گے، کوئی بھی بات اُس لکیر پر دُرست نہیں ہوسکے گی یعنی لکیر سے میری مُراد ہے کہ فرض کریں (Blackboard) پر اُوپر سے نیچے کو ایک لکیر کھینچیں اور اُوپر کے سرے کو آپ ازل قرار دیں اور نچلے سرے کو آپ ابد قرار دیں۔ اور جہاں پر ازل ہے اُس پر تخلیق فرض کریں اور جہاں پر نچلا سرا ہے اُس کو ابد کا تصوّر قرار دیتے ہوئے ہر چیز کی فنا کو مانیں تو کیا یہ بات صحیح ہوسکتی ہے، یہ نظریہ، یہ تصوّر دُرست ہوسکتا ہے؟ ہرگز دُرست نہیں ہوسکتا ہے۔ کیا خدا مخلوق کے بغیر رہے گا کہ اُس نے ایک چیز یکا یک جو پہلے نہیں تھی پیدا کی اور پھر اُس کا خاتمہ کر دیا اور پھر یوں ہی سلطنت کے بغیر، حکومت کے بغیر، فعل کے بغیر، صفات کے بغیر بیٹھ گئے، ایسی خدائی بے معنی ہو جاتی ہے، اِس کے کچھ معنی نہیں۔ حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہؑ نے ''آپ بیتی'' کے (Chapter) ''اسلام میرے مورثوں کا مذہب'' میں یہ فرمایا ہے کہ ایک دفعہ یکا یک کائنات کا پیدا کرنا یہ یہود کا تصوّر ہے، یہودیوں کا تصوّر ہے، اسلام کے مطابق خدا ہمیشہ تخلیق کرتا ہے، اور ہر وقت کرتا ہے (صفحہ نمبر۔ ۱۶)۔ لوگ اِس طرح سوچتے ہیں جیسے خدا کا کوئی وقت گزر چکا ہو لیکن خدا کا ماضی نہیں ہے، خدا کا مستقبل نہیں ہے، بس سارا وقت خدا کے لئے حال ہی حال ہے اور رُوح کے لئے بھی ایسا ہے۔

آپ لامکان کا تصوّر کریں یعنی ایسی کیفیت جس میں کہ سب کچھ تو ہے لیکن مکان نہیں ہے، (Place) نہیں ہے، (Placeless)، جب لامکان ہے تو اُسی کے ساتھ ساتھ لازمان بھی ہے۔ لازمان ایک ایسا تصوّر جس میں کہ وقت نہیں ہے، جس میں کہ وقت کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ وقت نہ ہونے کے یہ معنی ہیں کہ وہاں حال، مستقبل، ماضی ایک ہیں۔

انسان کو خدا نے کچھ اِس طرح سے پیدا کیا ہے کہ انسان کے اندر سب کچھ ہے۔ آپ عالمِ خواب کی مثال لیں، جب آپ نیند میں جاتے ہیں تو خواب دیکھتے ہیں تو خواب کیا ہے؟ کوئی خواب لازمان بھی ہے اور لامکان بھی ہے، لامکان اِس معنی میں ہے کہ وہ کوئی (Place) نہیں ہے، رُوح کی ایک کیفیت ہے۔ آپ ہی بتائیں، سوچ کے بتائیں کہ وہ کون سی جگہ ہے، کون سی دُنیا ہے، کون سا مقام ہے؟ جس میں کہ آپ خواب دیکھتے ہیں وہ لامکان ہے وہ کوئی جگہ نہیں ہے پھر آپ یہ بھی بتائیں کہ خواب میں جو وقت کا تصوّر ہوتا ہے وہ کیسا ہے؟ وہ ماضی ہے یا مستقبل ہے یا حال ہے یا وہ ایک مخلوط کیفیت ہے؟ اُسی میں ماضی بھی ہے، اُسی میں حال بھی ہے اور اُسی میں مستقبل بھی ہے۔ اِس کا ثبوت یہ ہے کہ بعض دفعہ آپ اپنے بچپن کو دیکھتے ہیں، بعض دفعہ آپ اُن لوگوں کو دیکھتے ہیں جو کہ وہ مر چکے ہیں ماضی میں، جیسے ہی آپ بچپن کو دیکھتے ہیں تو ماضی کو دیکھتے ہیں، جیسے ہی اُن گزشتہ لوگوں کو دیکھتے ہیں تو ماضی کو دیکھتے ہیں اور بعض دفعہ آپ آنے والے وقت کو دیکھتے ہیں۔ آنے والے وقت میں جو کچھ واقع ہوتا ہے یا جیسی بات ہونے والی ہے اُس کو آپ مستقبل کو حال کے طور پر دیکھتے ہیں تو یہ ہوا لازمان کا تصوّر۔ اور لامکان کے معنی یہ ہیں کہ آپ خواب میں جو بھی جگہ دیکھتے ہیں وہ دُنیا کی کوئی جگہ نہیں ہے، آسمان زمین کی کوئی جگہ نہیں ہے، وہ لامکان ہے وہ لازمان ہے تو آخرت اور بہشت کا تصوّر بھی ایسا ہے۔

کچھ انجان لوگوں نے پوچھا کہ بہشت کہاں ہے؟ بہشت لامکان ہے اُس کے لئے کسی جگہ کی کوئی ضرورت نہیں کوئی مادّی چیز ہو تو اُس کے متعلّق مکان کا سوال پیدا ہوتا ہے جو چیز مادّی نہ ہو اُس کے لئے مکان اور زمان کی ضرورت نہیں ہے رُوح مکان اور زمان سے بالاتر ہے اِس معنی میں۔ آپ اِس کائنات کو فرضی طور پر اُٹھائیں، اِس کو مٹائیں تو اُس وقت لامکان اور لازمان کی کیفیت ہوگی چونکہ زمان اور مکان کا تصوّر اِس کائنات سے ہے۔ چلئے! اچھا ہوا کہ ابھی "سوسوال" کتاب آنے والی ہے اُس میں ایسی باتیں ہیں اُن کے جاننے کے لئے یہ باتیں مفید اور ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہیں۔ تو ہم نے کائنات سے شروع کیا تھا اور کہا تھا کہ کائنات سب سے بڑی کتاب ہے اِس کائنات کو پڑھنے کے لئے ہم نے کوشش کی یا اِس کے ایک اہم نقطے کو لیا جو اِس کی گول شکل تھی تو اِس گول شکل میں بہت سے بھید ہیں، بہت سے معنی ہیں۔

آپ نے کبھی پرکار پر ایک دائرہ کھینچا ہوگا، دائرہ گول شکل کو کہتے ہیں تو پرکار سے دائرہ بنانے کے بعد پتا نہیں چلتا ہے کہ اِس کا (End) سرا کہاں ہے، شروع کہاں ہے، آخر کہاں ہے، آغاز کہاں ہے، انجام کہاں ہے۔ ایک گول چکر پر دو آدمی چلتے ہیں، برابر برابر میں کھڑے ہیں، اب بتائیں کہ کون کس کے پیچھے ہے؟ کون کس کے پیچھے بھاگ رہا ہے؟ کوئی کسی کے پیچھے نہیں ہے۔ اگر مانا جائے تو وہ اِس کے پیچھے ہے تو یہ اُس کے پیچھے ہے، ایک کے پیچھے ایک اُس وقت ہوتا جب کہ دائرے کی بجائے لکیر ہوتی لمبی سی تو اگلے والا آگے قرار پاتا اور پچھلے والے کو کہا جاتا کہ یہ اُس کے پیچھے بھاگ رہا ہے۔ جب دائرہ ہے تو دائرے میں کوئی ایک آگے کوئی ایک پیچھے نہیں ہے، ہاں یہ بات ہے کہ قریب قریب دوڑیں تو شاید کہا جا سکے

گا کہ ایک کی پشت پر دُوسرا ہے مگر دائرے کے برابر برابر نصف نصف پر کھڑے ہو جائیں اور اسی انداز سے بھاگیں تو پتا نہیں چلے گا۔

اسی طرح بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کا ایک جواب نہیں ہے دو جواب ہیں جیسا کہ اِس دائرے پر بھاگنے والے دو آدمیوں کو آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ اِس کے پیچھے ہیں تو یہ اُس کے پیچھے ہے اور آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ کوئی کسی کے پیچھے نہیں ہے۔ بعض باتیں ایسی گول گول ہیں کہ آپ اُن کو ایک اعتبار سے نہیں کئی اعتبار سے اُن کی ترجمانی کر سکتے ہیں، جو اُونچی حقیقتیں ہیں وہ ایسی ہیں اِس معنی میں کہا کہ جو اُونچی حقیقتیں ہیں وہ تراشے ہوئے نگینے کی طرح ہے اُس نگینے کے کئی پہلو ہوتے ہیں، ایک لعل، ایک ڈائمنڈ جس کے کئی پہلو ہیں۔ تو جب ایک باحقیقت انسان، ایک حکیم جب کہتا ہے کہ ایک ہی مطلب کی کئی تشریحات کرتا ہے تو اُس وقت آپ کو شک پڑتا ہے، آپ کہتے ہیں کہ استاد کبھی یہ کہتا ہے، کبھی وہ کہتا ہے، کبھی کچھ کہتا ہے، کبھی کچھ کہتا ہے۔ ایسی بات نہیں ہے وہ حقیقت کے مختلف پہلوؤں کی مختلف تشریحات کرتا ہے۔ کسی حقیقت کے دو پہلو ہو سکتے ہیں تو کسی کے چھ ہو سکتے ہیں، کسی کے بارہ بھی ہو سکتے ہیں، کسی کے اِس سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں، چوبیس بھی ہو سکتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کے اندر بھی ایک ہی مطلب کو طرح طرح سے پیش کیا گیا ہے۔ ایک ہی مطلب کی مختلف تشریحات کی گئی ہیں، ایک ہی مثال کو پھیر پھیر کر پیش کیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ ایک ہی چیز کی کئی تاویلیں ہوا کرتی ہے اور ایک اصحاب کو امام جعفر الصادقؑ نے تاویل کی کوئی باتیں کہی کچھ دیر کے بعد اُسی مطلب کی کچھ اور تاویل بتائی تو اُس صحابی نے عرض کی کہ یا حضرت! ابھی ابھی اِس مطلب کی آپ نے کچھ اور تاویل بتائی تھی اب اِس کی کچھ اور تاویل بتاتے ہیں، تو فرمانے لگے کہ ہاں! مَیں اِس کی سات تاویلیں بھی بتا سکتا ہوں تو صحابی کو تعجّب ہوا عرض کرنے لگا کہ یا حضرت اِس کی سات تاویلیں! تو امامؑ نے فرمایا: ہاں! ستّر تاویلیں بھی بتا سکتا ہوں۔ تو اُس کو ورطۂ حیرت میں ڈالا اور ستّر تاویلیں تک بتائیں۔

تو یہ کہ حقیقت ایک ڈائمنڈ کی طرح ہے جو اُونچی حقیقت ہے یا جو اُونچی حقیقتیں ہیں وہ پہلو دار ہوا کرتی ہیں ہر پہلو سے ایک تشریح ہوتی ہے تو پہلو دار حقیقت بھی ایک لحاظ سے گول ہے اور اُس کے پہلو بھی گولائی میں ہیں۔ جس پہلو کو آپ آگے کریں گے اُس پہلو پر سورج کی ایک روشنی پڑے گی اور اُس پہلو سے ایک نئی چمک دمک پیدا ہو گی تو حقیقت ایک ایسی چیز ہے۔ اِس لئے جو بڑے دانشمند ہیں وہ بیان اُونچی حقیقتوں میں اِس طرح سے کرتے ہیں کہتے ہیں کہ ایک اعتبار سے یہ ہے اور پھر دُوسرے اعتبار سے یہ ہے۔ اِس کو کہتے ہیں اعتبارات تو اعتبارات سے یا لحاظ سے ایک لحاظ سے یہ ہے اور دُوسرے لحاظ سے یہ ہے، اِس طرح بتاتے ہیں۔ لیکن یہ بہت بلندی کی باتیں ہیں اور اِس میں تضاد نہیں ہوتا ہے بلکہ اِس میں بعض چیزیں ایسی ہیں کہ کُل اور جُزو کے لحاظ سے کہا جاتا ہے، کُلّی طور پر دیکھا جائے یہ ہے، جُزوی طور پر دیکھا

جائے یہ ہے۔ مثلاً اگر جزوی طور پر دیکھا جائے تو انسان کا ایک ہی جسم ہے، ایک ہی ہستی ہے اور اگر کُلّی طور پر دیکھا جائے تو انسان سب کچھ ہے اور دُنیا کو اگر جزوی طور پر دیکھا جائے تو دُنیا چپٹی ہے اور کُلّی طور پر دیکھا جائے تو دُنیا کا نہ تو کوئی مشرق ہے اور نہ کوئی مغرب ہے اِس کا کوئی سرا نہیں ہے۔ آج کی باتیں کائنات سے متعلّق تھیں جو جنرل باتیں تھیں شاید ہوسکتا ہے کہ اِس میں کوئی بات مشکل لگی ہو اور اگر کوئی بات مشکل لگی ہو تو آپ آرام آرام سے سوال کرنا ہمیں اِس سوال کے جواب دینے میں خوشی ہوگی، میں اب یہاں آ کر رُکتا ہوں اور شاید کہ ہمارا کیسٹ بھی بھر گیا ہوگا۔

تو اِس کے لئے ایک (System) ہے، وہ (System) یہ ہے کہ آسمان کے بہاؤ کے (Against) اُس کو نہیں اُڑاتے ہیں، آسمان کے بہاؤ یا گردش کے موافق اُس کو اُڑاتے ہیں مجھے اندازہ ہے اور جس طرف کو آسمان گھومتا ہے اور اُس طرف کو چھوڑتے ہیں تاکہ جو آسمان یا کہ ایتھر کی جو لہر ہے یا جو بہاؤ ہے وہ اپنے ساتھ اُس راکٹ وغیرہ کو گھمائے۔ میں یہ سمجھتا ہوں لیکن مجھے اِس سلسلے میں پھر بھی ایک طرف سے اگرچہ یقین ہے تاہم اس میں احتیاط بھی ہے۔ مجھے بھروسہ اِس سلسلے میں آسمان کے نظام پر زیادہ ہے لیکن سائنس کے اُصول پر کم ہے یعنی یہ میرا اندازہ ہے اور ایسا میں نے دیکھا بھی ہے کہ ہمیشہ جو راکٹ چلتا ہے آسمان پر وہ مغرب سے مشرق کی طرف چلتا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ آسمان کی گردش جو ہے وہ اِس طرف کو ہے، ہم کو لگتا ہے کہ سورج آگے کو گیا سورج آگے کو نہیں آتا ہے بلکہ آسمان اُس کے استقبال کو جاتا ہے تو پھر سورج اُس طرف رہتا ہے۔ یعنی آسمان کی گردش مغرب سے مشرق کی طرف ہے جب مشرق سے مغرب کی طرف ہے تو ہم کو لگتا ہے کہ سورج چلتا ہے مغرب کی طرف حالانکہ سورج نہیں چلتا ہے زمین چلتی ہے اور آسمان چلتا ہے۔

جیسے ہم ریل گاڑی پر جب سفر کرتے ہیں تو زمین ریل گاڑی کے (Against) میں چلتی ہے قریب اور دُور کی زمین، قریب کی زمین جلدی جلدی چلتی ہے اور دُور کی زمین جو ہے وہ آہستہ آہستہ چلتی ہے۔ چاند جب کچھ ادھورے بادلوں میں ہوتا ہے تو ہماری نگاہ کے مطابق چاند بہت تیزی کے ساتھ بھاگتا ہے ایسا نہیں ہے اُس کی رفتار میں کچھ فرق نہیں آتا بلکہ وہ بادل ایسے ہی ہوتے ہیں۔ بادل دوڑتے ہیں اِس سے لگتا ہے کہ چاند دوڑتا ہے، اِسی طرح بہت سی چیزیں ہیں جن کا جاننا ضروری ہے لیکن جو نظر ہے ہماری نظر، یہ ہمیشہ فریب میں آتی ہے دھوکہ کھاتی ہے اِس کو فریبِ نظر کہتے ہیں، اِس طرح عقل کو بھی فریب ہوتا ہے اور ہمارے جتنے حواس ہیں اُن سب کو ''التباس'' یعنی فریب ہوتا ہے۔

اِن کا کہنا ہے کہ انسان جب دُنیا میں آتا ہے تو آیا اُس وقت اُس کو پتا لگتا ہے کہ میں دوبارہ آیا ہوں؟ ایک عام انسان کو اِس کا پتا نہیں چلتا ہے، اِس کا پتا چلتا ہے اُس شخص کو جو علمُ الیقین جانتا ہے اور اُس کو جو عینُ الیقین یا حقُ الیقین تک پہنچا ہے تو اُس کو پتا چلتا ہے ورنہ نہیں۔ ابھی علمُ الیقین کی روشنی میں جو باتیں بتلائی گئیں اُس سے یقین آسکتا ہے کہ انسان بار بار آتا ہے اور جیسے ہی ہمارے علمُ الیقین میں اضافہ ہو جائے گا تو ہمارا یقین اِس معاملے میں محکم سے محکم تر ہو

جائے گا اور جب ہم عینُ الیقین کی روشنی میں دیکھنے لگیں گے تو پتا چلے گا کہ ہم دُنیا میں آتے جاتے ہیں قرآن میں بھی ایسے اشارے ہیں اور سب سے نمایاں اشارہ وہاں پر ہے جہاں جنّت کے رزق کا ذکر آیا ہے. كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِیْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ (۲:۲۵)۔ جب جنّت کے رزق سے اُن کو دیا جائے گا تو وہ اُس رزق کو کھا کر یقین کریں گے کہ اُن کو پہلے بھی یہ رزق دیا گیا تھا۔

یہ بالکل واضح بات ہے کہ علم اور رُوح کی شناخت جو رزق ہے بہشت کا اِس کے دینے کے بعد بھروسہ آتا ہے، علم جو جنّت کا رزق ہے حقیقی علم، علمُ الیقین تو اِس علمُ الیقین کے پیش کرنے کے بعد باور آتا ہے کہ ہم پہلے بھی جنّت میں تھے اور یہ علم پہلے بھی ہم کو دیا گیا تھا۔ خدا نے کوئی نیا کام نہیں کیا، خدا کوئی نیا کام نہیں کرتا ہے، اُسی عمل کو دُہراتا ہے جس کو اُس نے کیا ہے۔ خدا کے لئے کوئی نئی بات نہیں ہے، خدا کے سامنے اگر کوئی نئی بات ہو تو خدا ایک نیا ہو گیا، ایک نیا خدا بن گیا۔

ٹرانسکرائب: سیما عظیم ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

Click here for Audio

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ق س کا پُرحکمت بیان
عنوان: علمِ حقیقی کی اہمیت، پیغمبروں کو ناحق قتل کرنے کی تاویل

کیسٹ نمبر: ۲۴ تاریخ: ۱۹۷۸/۱۰/۶، کراچی

عزیزانِ من! میرا دل چاہتا ہے، میرے دل میں یہ خواہش ہے، میری یہ آرزو ہے کہ میں آج آپ کو کچھ اہم باتیں بتاؤں، کچھ مفید باتیں بتاؤں لیکن معلوم نہیں کہ کس طرح بتاؤں اور کیا باتیں بتاؤں، میرے پاس کوئی منصوبہ نہیں ہے، میرے پاس کوئی مقرّر موضوع نہیں ہے۔ میں نے نہیں سوچا ہے کہ آج اپنے عزیزوں کو یہ بات بتاؤں لیکن پھر بھی میرا دل یہ کہتا ہے، مجھ کو یہ خواہش ہے کہ آپ کی اِن کوششوں کو دیکھ کر میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کو کچھ مفید باتیں بتا دی جائیں، علم کی مفید باتیں، رُوحانیت کی، نورانیت کی مفید باتیں اور اِس کا دارومدار خداوند کی رحمت پر ہے وہ جو چاہے وہی ہوگا اور وہ جس طرح سے چاہے اُس طرح سے ہوگا۔ ہمارے چاہنے سے کچھ نہیں بنتا ہے، ہم تو چاہتے رہتے ہیں، ہم کب نہیں چاہتے ہیں کہ آگے بڑھیں، ہم تو چاہتے ہیں کہ ترقّی ہو، ہماری خواہش ہر وقت لگی رہتی ہے ہماری چاہت ہر وقت موجود ہوتی ہے۔ لیکن عجیب بات ہے کہ ہم کو اپنے دائرے میں کچھ اختیار دیے جانے کے باوجود اُسی کا اختیار چلتا ہے۔ اِس سے میری مُراد یہ نہیں ہے کہ ہم مجبور ہیں، ہم مجبور بھی نہیں ہیں اور اُس کا اختیار کسی چیز کا پابند بھی نہیں ہے اِس لئے کہ ہمارے اختیار کا ایک سِرا اُس کے اختیار کے ساتھ لگا ہوا ہے اِس لئے یہاں سے جنبش ہوتی ہے، وہاں سے حرکت ہوتی ہے، وہاں سے تحریک چلتی ہے۔ لہٰذا ہمارے اپنے اختیار کے عنوان سے ایک لہر آتی ہے اُس لہر کے متعلّق کہا جاتا ہے کہ یہ تمہارے اختیار میں سے ہے۔ ہم صحیح معنوں میں نہیں کہہ سکتے ہیں کہ یہ لہر اُسی کے اختیار سے چلتی ہے یا ہمارے اختیار سے۔ تو ایک لحاظ سے یہ کہنا صحیح ہے کہ یہ اُسی کے اختیار سے ہے، تو دُوسرے لحاظ سے یہ بھی صحیح ہے کہ یہ تحریک، یہ جنبش، یہ لہر خود ہمارے اختیار سے ہے۔ چونکہ ہمارے اختیار کا ایک سِرا خدا کے اختیار میں جا ملا ہے، جا ملا نہیں ہے بلکہ ازل سے وہیں پر موجود ہے۔

بہر حال میں یہ کوشش کرتا ہوں کہ سب سے اعلیٰ سطح کی باتیں ہوں، خواہ وہ دو باتیں ہوں یا ایک بات ہو لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہ باتیں ایسی ہوں کہ اُن میں سے ہر بات کئی کئی کتابوں کے برابر ہو، اُس میں بنیادی حقیقتیں موجود ہوں ایسی باتیں میں بتلانا چاہتا ہوں۔ اِس لئے کہ اگر ہم خداوند کی توفیق و یاری سے اُونچی سطح کی باتیں کرنے میں کامیاب

ہو جائیں اور ہم علم کی معراج تک پرواز کر سکیں۔ ہمارے تصوّرات ونظریات ازل اور ابد کی بلندیوں تک پہنچ جائیں تو یہ اُس کی مہربانی ہوگی اور درین صورت کوئی شک نہیں کہ ہم کو اِس بلندی سے جو بھی چیزیں ملیں گی وہ بہت ہی اعلیٰ اور بہت ہی گرانقدر ہوں گی۔

میرے عزیزوں! یاد رکھنا کہ ہم اسماعیلی مذہب میں پیدا ہوئے ہیں اور مولا کی رحمتوں سے ہم آپ ایک ایسے مقام پر ٹھہرے ہوئے ہیں جو کہ علم کے لحاظ سے بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ لہٰذا یاد رکھنا! اِن باتوں کو بہت ہی اہمیت دینا اور اِن میں بوقتِ فرصت غور وفکر کرنا۔ امامؑ ہی کی یہ شان ہے کہ وہ ہمیشہ اپنوں کے درمیان رہتا ہے، گو کہ سب مومنین اُس کے اپنے ہیں اور ایک لحاظ سے سب دُنیا والے اُس کے ہیں لیکن نہیں! اِس میں اختصاص صرف اختصاص پایا جاتا ہے۔ یعنی جن کی کوششیں زیادہ ہیں، جنہوں نے زیادہ محنت کی ہے وہ دُوسروں کے مقابلے میں آگے ہو سکتے ہیں، وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ○ اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ (۵۶:۱۰۔۱۱)۔ جو سبقت لے جانے والے ہیں وہ تو دُوسروں سے آگے ہیں اور وہی سبقت لے جانے والے لوگ خدا کے حضور سے زیادہ قریب ہیں اور یہ سبقت قربانیوں کی بنیاد پر ہو سکتی ہے۔ قربانیاں!! کتنے پیارے الفاظ ہیں قربانیاں، قربانی، کتنا عمدہ تصوّر ہے اگر عزیزوں کی قربانیاں ہیں تو اِس کے ذکر کے چھیڑتے ہی اُن کے دل میں گرمی پیدا ہو جاتی ہے، شکرگزاری کا تصوّر پیدا ہوتا ہے کہ اِس عنوان سے اُن کی خدمتوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ کس قدر ضروری ہے قربانی دین میں رُوحانیت کے لحاظ سے، امامؑ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے قربانی، قربانی ہی سے کسی کو قربِ خدا کا مرتبہ حاصل ہو سکتا ہے کیونکہ قربانی کے معنی ہی ایسے ہیں۔

میرے عزیز بچوں! میں تو یہ چاہتا ہوں کچھ عمدہ باتیں ہوں، رُوحانیت کی، بلندی کی باتیں ہوں، نورانیت کی باتیں ہوں اور علمُ الیقین کی بلندیوں کی باتیں ہوں، علمُ الیقین، اُس کے بعد عینُ الیقین آتا ہے۔ تو کتنی اچھی بات ہے کہ اگر ہم کو اِس زندگی میں علمُ الیقین کی باتیں ملتی ہوں، علمُ الیقین جس سے کہ ہمارے شکوک وشبہات کا ازالہ ہو جائے۔ شکوک وشبہات بیماریاں ہیں، شکوک وشبہات جہالت کا نام ہے، شکوک وشبہات آلودگی ہے، میل ہے اور ایک طرح سے نجاست، رُوح کی پاکیزگی ناممکن ہے جب تک کہ شکوک وشبہات کا ازالہ نہ ہو جائے۔ پیغمبر اور آنحضرتؐ کے جانشین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن کا ارشاد ہے فرمایا گیا کہ: وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ (۲:۱۲۹)۔ مومنین کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دی جاتی ہے تاکہ اُن کو پاک و پاکیزہ بنایا جائے اِس پاکیزگی کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پیغمبر اور امامؑ اپنے مُریدوں کو پانی میں دھو لیتے ہیں اور اِس سے مُراد یہ بھی نہیں ہے کہ اِس سے مومنین کی جسمانی پاکیزگی مقصود ہو، پس ظاہر ہے کہ یہاں علمی پاکیزگی کا ذکر ہے اور علمی پاکیزگی کی بحث میں جہالت کا ذکر آتا ہے، نادانی کا اور شکوک وشبہات کا ذکر آتا ہے۔

چنانچہ علمُ الیقین سے رُوح کی، دل کی اور باطن کی پاکیزگی ہو جاتی ہے اور پھر اِس پاکیزگی کے نتیجے میں کوئی خوش نصیب مومن عینُ الیقین کے مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں وہ اپنے دل کی آنکھ سے زندہ حقیقتوں کا مشاہدہ کرتا ہے وہ اُس وقت علم وعرفان کی ایک جیتی جاگتی دُنیا کو آنکھوں کے سامنے دیکھتا ہے اِس لئے علمُ الیقین بہت ہی ضروری ہے اور علمُ الیقین کا پھیلاؤ اِس کا دائرہ بہت ہی وسیع ہے۔

رُوحانیت کے مشاہدات کا تذکرہ، دُوسروں کے لئے علمُ الیقین کی حیثیت رکھتا ہے ایک کامل استاد نے رُوحانی طور پر جو کچھ مشاہدہ کیا ہے جو کچھ اُس نے رُوحانی معجزات کے نتیجے میں دیکھا ہے وہ جب عزیزوں سے بیان کرتا ہے، اُن چیزوں کی وضاحت کرتا ہے تو وہ عینُ الیقین اُن عزیزوں کے لئے علمُ الیقین بن جاتا ہے۔ جیسے پانی جب بادلوں میں ہے تو بادل کہلاتا ہے، جب بادل سے قطرے بنتے ہیں تو یہ پانی بارش کہلاتا ہے، جب وہ بارش کی صورت میں زمین پر پڑتا ہے تو تب پانی کہلاتا ہے چیز کا نام ہر مقام پر بدلتا جاتا ہے۔ اِس لئے حقُ الیقین جب نیچے کی طرف آتا ہے تو پہلے وہی حقُ الیقین، عینُ الیقین کی حیثیت اختیار کرتا ہے اور جب اُس سے بھی نیچے کو آتا ہے تو پھر علمُ الیقین بن جاتا ہے۔ اِس سے آپ کو علمُ الیقین کی اہمیت کا اندازہ ہوگا کہ کس قدر عالی ہے۔ لہٰذا یکسان ہے کہ آپ رُوحانیت میں جائیں اور بڑے کام میں کامیاب ہو جائیں اور ذاتی طور پر مشاہدہ کریں یا یہ کہ آپ ایک کامل استاد سے رُوحانیت کی باتیں سُنیں اور اُن پر ایسا باور کریں جیسا کہ آپ نے خود دیکھا ہے۔ اِس قدر اِس علمُ الیقین کو اہمیت دینی چاہئے، جب ہی تو شکر گزاری کا تصوّر ہوگا اور تب ہی وہ خوشی اور سکون حاصل ہوگا اور جیسا کہ چاہئے باور کیا جا سکے گا۔ تاہم اِس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آپ علم کے اسی (Stage) پر بس کریں اور قناعت کر کے بیٹھے رہیں۔ جس طرح سے میں نے علمُ الیقین کی وضاحت کی اُس کا مقصد یہی ہے کہ آپ اِس علم کی اہمیت کو سمجھیں اور ہمیشہ اِس کے حصول کے لئے کوشش کرتے رہیں۔

اب میں ایک خاص موضوع کی طرف متوجّہ ہوتا ہوں وہ یہ ہے کہ خداوندِ عالم کی رحمتوں کا ایک خاص اُصول یہ ہے کہ علم اور حکمت عطا ہو جانے کے بعد بھی خدا کے قبضے میں رہتی ہے اور یہ بات بہت ہی عجیب ہے، بہت ہی عجیب ہے۔ دُنیا کی کوئی چیز ایسی نہیں ہے کہ کوئی بادشاہ یا کوئی امیر وہ چیز کسی کو دے دے اور پھر اُس کے قبضے میں بھی ہو کیونکہ دُنیا کی کوئی چیز جب کسی سے ایک بار ملتی ہے تو مل ہی جاتی ہے اور اُس پر قبضہ جمایا جا سکتا ہے۔ اگرچہ بعض مثالوں میں مشکل ہے کیونکہ کوئی بادشاہ کسی مہربانی کو واپس بھی کر سکتا ہے لیکن اِس سے کہیں زیادہ مضبوطی کے ساتھ خدا کی دی ہوئی رحمت ہے پھر بھی خدا کے قبضے میں ہوتی ہے اور یہ بہت تعجّب کی بات ہے۔ اِس مثال کی وضاحت یہ ہے کہ جب امامؑ اپنے کسی خادم کو، کسی غلام کو یا کہنا چاہیے کسی مومن کو علم اور حکمت دیتا ہے تو اُس کی حالت ایسی نہیں ہوتی ہے کہ وہ مومن یا وہ غلام جب بھی چاہے اُس کو (Use) کرے اور پھر خدا کے قانون کو نظر میں نہ لائے۔ بلکہ ہمیشہ یہ اندیشہ ہوتا کہ خدا کا دیا ہوا علم مومن میں

کام کرتا ہے یا نہیں کرتا ہے، زبان چلتی ہے یا نہیں چلتی ہے، دماغ کھلتا ہے یا نہیں کھلتا ہے، ہر بات ذہن میں آتی ہے یا فراموش ہو جاتی ہے، پھر علم نتیجہ خیز ہوتا ہے یا نہیں ہوتا ہے، لوگوں کی طرف سے قدر دانی اور حوصلہ افزائی ہوتی ہے یا نہیں ہوتی ہے، سننے والوں کے دل روشن ہو جاتے ہیں یا کہ مزید الجھنوں میں پڑتے ہیں یہ سب کچھ خداوند کے اختیار میں ہے، پروردگار کا یہ قانون صرف ایک فرد سے متعلّق نہیں ہے، بلکہ اُمتّوں کے لئے بھی یہی اُصول ہے۔

کبھی میں نے اپنے کسی عزیز کے ساتھ اِس موضوع کو چھیڑا تھا کہ قرآنِ کریم میں فرمایا گیا ہے کہ: اہلِ کتاب کے ہاتھ میں کوئی فضل نہیں ہے (۵۷:۲۹)۔ کوئی فضیلت نہیں ہے یعنی یہود و نصاریٰ کو جب کہ وہ صحیح راستے پر تھے اور جب کہ وہ اپنے پیغمبروں کو اُن کے زمانے میں مانتے تھے اُن کی اطاعت کرتے تھے تو اُس وقت اُن کو جو فضیلتیں عطا کی گئیں تھیں اُن کے بارے میں ارشاد ہے کہ وہ اِس طرح سے عطا نہیں ہوئی تھیں کہ ہمیشہ وہ لوگ اُن فضیلتوں پر قابض رہ سکیں۔ بلکہ قانون کچھ اِس طرح سے ہے کہ ہر فضیلت کا ایک سِرا خدا کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور دوسرا سِرا بندے کے ہاتھ میں ہوتا ہے پھر جب کبھی بندہ ناشکری کرتا ہے یا نافرمانی کرتا ہے تو خداوند جس کے ہاتھ میں پہلے سے فضیلت کا سِرا موجود ہے، اُس کو واپس چھین لیتا ہے اور خداوندِ حکیم نے اپنے علم سے کسی بھی فضیلت کو کُلّی طور پر اِس لئے کسی کو دے نہیں رکھی تھی کہ ہو سکتا ہے کہ بندہ ناشکر گزار ہو جائے۔ پس یہی سبب ہے کہ ہمارے پیر بزرگ ہر وقت خدا سے رُجوع کرتے تھے اور ڈرتے تھے۔ یہ ایک تشریح ہے خوفِ خدا کی جو قرآن کا ایک بہت بڑا موضوع ہے، خوفِ خدا خدا سے ڈرنا۔ خدا سے ڈرنے میں سب کچھ ہے، خدا سے ڈرنے کا مطلب تقویٰ، خدا سے ڈرنا علم کی روشنی میں دُرست ہے۔ کوئی نادان خدا سے ڈر نہیں سکتا ہے کیونکہ خدا سے ڈرنے کی جو کیفیت چاہیے یا جو شرط ہے وہ حقیقی علم کے بغیر پوری نہیں ہو سکتی ہے۔

میرے عزیزو! میں چاہتا ہوں کہ اِس قسم کی راز کی باتیں ہوں اور رُوحانیت کی بلندی کی باتیں ہوں تا کہ آپ بہت کم وقت میں زیادہ سے زیادہ علم حاصل کر سکیں۔ میرا اُصول ہی یہی ہے کہ میں کوشش کرتا ہوں کہ بہت بلندی کی باتیں اپنے عزیزوں کو سمجھاؤں تا کہ ذیلی قسم کی باتوں سے بے نیاز ہو کر اور نچلے درجے کی تعلیمات کو چھوڑ کر بلندی کی باتیں سمجھ لی جائیں، یہ اسماعیلی مذہب کی مہربانی ہے۔ کاش آپ کو وقت ہوتا، کاش ہم کو وقت ہوتا، کاش ہماری کوئی منظّم کلاس اِس وقت بھی ہوتی اور کاش ہمارے سامنے اِس قسم کی تعلیم کا کوئی بڑا منصوبہ ہوتا لیکن بہر حال ناشکری نہیں ہے جتنے بھی ہم کو شاگرد ملے ہیں اُن کے بارے میں اگر کوشش کی جائے اُن کے لئے اور اگر اُن کو خداوند حوصلہ عطا کرے، ہمت دے، توفیق عنایت کرے تو ہو سکتا ہے کہ ہماری اِس ناچیز سی کوشش سے جماعت کو بہت کچھ فائدہ ہو اور جب بھی یہ ہماری حقیر کوشش کامیاب ہو گی تو اُس کی صورت یہ ہو گی کہ ہمارے عزیز بہت کامیابی حاصل کریں گے علمی طور پر اور اُن میں سے ہر ایک ہزاروں بلکہ لاکھوں کو اپنا علمی فائدہ پہنچائے گا۔ کیونکہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جب ہم علم کی باتیں کرتے ہیں اُس

وقت ہمارے سامنے ایک بہت بڑا اجتماع ہوتا کہ ہم سمجھیں کہ ہماری باتیں سننے والے بہت ہیں بلکہ اِس کے برعکس بھی یہ فائدہ ہوسکتا ہے کہ ہمارے عزیز ہمارے ضمیر کی ترجمانی کریں، ہمارے علم کی ضمیر کی ترجمانی کریں اور وہ ہماری زبان بنیں، وہ ہمارا ترجمان بنیں اور زندگی کے آخری وقت تک اور رفتہ رفتہ بہت سی جماعتوں کو اپنے علم سے، اپنی زبان سے، اپنے قلم سے فائدہ پہنچائیں یہ بات ناممکن نہیں ہے میں ایسی اُمید رکھتا ہوں کہ (Indirectly) اور (Directly) میری باتیں جماعت کو پہنچیں، علم کی باتیں اور کوئی بات نہیں، رُوحانیت کی باتیں، حکمت کی باتیں، اسرار کی باتیں۔

عزیزانِ من! لوگ نہیں سمجھتے ہیں، وہ مایوس ہو چکے ہیں، علم کی بہت پستی میں مصروف ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ اُن کے پاس علم ہے، وہ گمان کرتے ہیں کہ اُن کو علم مل رہا ہے حالانکہ علم نہیں ہے وہ جسے علم سمجھتے ہیں جبکہ علم جاننے کا نام ہے، جبکہ علم جاننے کو کہتے ہیں۔ ہمارے یہاں علم وہ ہے جس کی روشنی میں ازل اور ابد کی حقیقتوں کو سمجھ پائیں، جس کی روشنی میں خدا کی حقیقت کو سمجھیں، جس کی روشنی میں ہم اپنی رُوح کی حقیقتوں کو سمجھ پائیں، اپنی آخرت کو پہچانیں، بہشت کو پہچانیں، ملائکہ کو پہچانیں، خدا کے بڑے بڑے بھیدوں کو پائیں۔ آپ جانتے ہیں کہ بھید کیا ہوتا ہے، کوئی دوست اپنے دوست کو بھید بتاتا ہے، کوئی بادشاہ اپنے دوست کو بھید بتاتا ہے اور بادشاہ کے بھید جس کے پاس ہوتے ہیں وہ بڑا معزّز ہوتا ہے۔ بھید ہی سب کچھ ہے، علم بھید ہے، سائنس بھید ہے، حکمت بھید ہے، فلسفہ بھید ہے، ہنر بھید ہے، تجربہ بھید ہے اور سب سے بڑھ کر خدا خود بھید ہے۔ کیا آپ نہیں دیکھتے ہیں کہ خدا خود کو بھید قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ میں ایک چھپا ہوا خزانہ تھا، میں نے چاہا کہ پہچانا جاؤں تو اِس پہچانے جانے کے لئے میں نے خلقت کو پیدا کیا۔ اِس میں اشارہ یہ ہے کہ جو کوئی خدا کو پہچانے، خدا سب لوگوں کو چھوڑ کر اُسی کا ہو جائے گا، خدا خود کو اُس شخص کے حوالے کر دے گا خزانے کی طرح، دولت کی طرح، سونے کی طرح، چاندی کی طرح، جواہرات کی طرح اِس کا مطلب یہ ہوا کہ خدا جس کو ایک خزانے کی حیثیت سے ملے تو خدا کی کوئی بزرگی ہی نہ رہی، خدا کی خدائی نہ رہی، خدا کی سلطنت نہ رہی۔

اُس نے اِس معنی میں یہ کہا کہ میں خود کو اور اپنے سب کچھ کو دینے کے لئے تیّار ہوں، خود کو اور اپنے سب کچھ کو، جبکہ اُس نے کہا کہ میں مالک و آقا کی طرح اِس سے پیش آنا نہیں چاہتا ہوں بلکہ میں خود کو ایک عظیم خزانے کی حیثیت سے کسی کے حوالے کر دینا چاہتا ہوں۔ میرے نزدیک اِس حدیثِ قدسی کے یہ معنی ہیں، میرے تجربے میں یہ بات آئی ہے لیکن یہ اُس وقت ممکن ہے جبکہ ایک بندۂ مومن کُلّی طور پر اپنے خداوند کی تابعداری کرے اور اُس اعلیٰ مقام کو پہنچے جس پر کہ یہ واقعہ پیش آتا ہے۔ اسماعیلی مذہب کا مقصد ہی یہی ہے اور امامؑ کی خاص خاص باتیں یہی ہیں۔ بحیثیت ایک اسماعیلی کے آپ کو امامؑ کی بہت ساری تعلیمات دیکھنی اور سُننی پڑیں گی، بحیثیت ایک مومن کہ آپ بہت سے فرامین سُن چکے ہیں لیکن آپ نے اُن فرامین کی (Categories) نہیں بنائی ہیں۔ آپ نے نہیں سوچا ہے کہ اُن فرامین میں جتنی تعلیمات پائی

جاتی ہیں وہ سب ایک (Category) کی نہیں ہیں، اُن تعلیمات میں اُوپر سے اُوپر کی باتیں بھی ہیں اور نیچے سے نیچے کی باتیں بھی ہیں یہاں تک کہ اُن فرامین میں کچھ کچھ باتیں شریعت کی بھی ہیں اور ہونی چاہیں ۔جو افراد ابھی ابھی اسماعیلیت قبول کر چکے ہوں یا جو ایسے ہوں کہ اسماعیلیت کو قبول کرنا چاہتے ہیں تو کیا اُن کے لئے بہت بلندی کی باتیں ہونی چاہئیں؟ یہ کیسے ممکن ہے؟ تو یہی وجہ ہے کہ امامؑ نے، وقت کے امامؑ نے، زمانے کے امامؑ نے ہر شخص کو اُس کی حیثیت کے مطابق فرامین فرمائے ہیں ۔اگر ہم آج اُن میں تمیز نہیں کر سکتے ہیں تو ہم کو الجھن ہو سکتی ہے، کوئی بھی فرمان سامنے ہے تو اُس کو سمجھنا چاہئے کہ یہ کس حد اور کس درجے کا فرمان ہے اور کن کے لئے ہے، آیا اُن کے لئے ہے جن کی بہت ترقی ہے یا درمیان والوں کے لئے ہے (Beginners) کے لئے ہے۔

تقریباً دو سال سے زیادہ عرصہ گزرا یہاں پر کچھ لوگوں نے ہماری جماعت کے خلاف کچھ (Pamphlets) شائع کئے ہوئے تھے شاید آپ اِس سے باخبر ہوں ۔تو اُن کتابچوں میں کچھ مخالفین نے ایسی باتیں بھی لکھیں تھیں کہ تمہارا امام یہ کہتا ہے، یہ کہتا ہے ۔اُس میں بہت شریعت کی ابتدا کی باتیں تھیں، اِس سے ایک کم علم رکھنے والا اسماعیلی گمراہ ہو سکتا ہے جبکہ وہ دیکھے کہ وہ فرامین واقعتہً امامؑ ہی کہ ہیں اور سب سے ابتدائی قسم کے ہیں یا شریعت سے متعلّق ہیں ۔ایک ہوشمند اسماعیلی شریعت سے انکار نہیں کر سکتا ہے، شریعت اپنے مقام پر صحیح ہے لیکن طریقت اور حقیقت بھی صحیح ہے اور معرفت بھی دُرست ہے ۔اِس کا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں شریعت کو برحق سمجھتے ہوئے اور شریعت سے ترقّی کر کے طریقت، حقیقت اور معرفت تک پہنچنا ہے ۔چونکہ ایک لحاظ سے جماعت ایک فرد کی حیثیت سے ہے اِس اعتبار سے ہمارے جو ماضی کے بزرگ تھے اُن کی حیثیت میں ہم تھے اور ہماری حیثیت میں وہ ہیں ۔اِس مثال میں ہم نے ماضی میں شریعت پر عمل کیا اور اسی طرح ہمارے بزرگوں نے ہماری حیثیت میں اِس زمانے میں حقیقت پر عمل کیا اِس لحاظ سے بحیثیتِ مجموعی ہم نے قرآن کے ظاہر اور باطن دونوں پر عمل کیا اور کر رہے ہیں ۔

آپ کو قرآن کے اندر ایسی بہت سی مثالیں ملیں گی جن سے پتا چلتا ہے کہ خدا کے نزدیک ہر فرقے کے اور ہر نظریے کے لوگ شروع سے لے کر آخر تک ایک فرد کی طرح ہیں ۔پیغمبر کے زمانے کے کچھ کافروں سے فرمایا جاتا ہے کہ تم نے پیغمبروں کو کیوں قتل کیا (۳:۲۱)، (۳:۱۱۲) حالانکہ ظاہری طور پر دیکھا جائے تو یہ بات عجیب سی لگتی ہے اِس لئے کہ پیغمبر کے زمانے کے کافروں نے کسی نبی کو قتل نہیں کیا اور نبی کے زمانے میں دُوسرا [کوئی] نبی کہاں تھا؟ لیکن حقیقت سمجھنے کے بعد یہ حیرت اُٹھ جاتی ہے کیونکہ یہ بات صحیح ہے کہ پیغمبر کے زمانے میں جو کافر تھے اُن کافروں کے ہم خیال والوں نے اگلے زمانوں میں یہ کام کیا تھا، لہٰذا قانونِ الٰہی اُن کو اور اِن کو ایک فردِ بشر کی حیثیت دے کر کہتا ہے کہ تم ہی نے اُن پیغمبروں کو قتل کیا اور پھر یہ بات دُرست ہے تو یہ بھی دُرست ہے کہ پیغمبر کے زمانے میں ہمارے ہم مذہب

والوں نے جو کچھ کیا وہ ہم نے کیا اور اب دین کے معاملے میں جو کچھ ہم کرتے ہیں تو وہ ہمارے بزرگ کرتے ہیں کیونکہ وہ اور ہم ایک فرد کی حیثیت سے ہیں تو اُن کے مقابلے میں یہ مجموعی طور پر ایک فردِ بشر کی حیثیت سے ہیں۔

آپ نہیں دیکھتے ہیں کہ دُنیا کے اندر ایسی مثالیں بہت سی ہیں جن میں جب کوئی مقابلہ ہوتا ہے تو اُس مقابلے میں ایک گروپ کے افراد کسی کھیل میں، تماشے میں، کام میں، ترقّی میں دُوسرے گروپ کے افراد ایک فرد کی طرح یا دو آدمیوں کی طرح ایک دُوسرے سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ کیونکہ گروپ کے اندر جو کمزوری ہے یا خوبی ہے وہ سب میں مشترک ہوتی ہے یا یوں کہنا چاہیے کہ آج اسماعیلی جماعت کی جو حیثیت ہے، جو خوبی ہے یا جو کمزوری ہے اُس میں سب ہیں تو اگر نیک نامی ہے تو اُس میں سب ہیں اور اگر کمزوری ہے تو اُس میں سب ہیں۔ قرآن کے اندر بہت سی باتیں ایسی ہیں جن سے یہی تصوّر ملتا ہے اِس فرق کے باوجود کہ افراد کے درمیان تفاوت پایا جاتا ہے۔ مثلاً قرآن میں اکثر یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کہہ کر خدا مومنین کی تعریف کرتا ہے اور اُس تعریف کے اندر سب مومنین ایک ہو جاتے ہیں گو کہ انفرادی طور پر فرق پایا جاتا ہے لیکن اِس خطاب میں سب ایک ہو جاتے ہیں اِس کے باوجود کہ اُن مومنین میں اعلیٰ سے اعلیٰ بھی ہیں اور ادنیٰ سے ادنیٰ بھی ہیں، یہاں تک کہ امیر المومنین بھی اُن میں ہیں یعنی مومنوں کا سردار تو وہ بھی اِسی میں شامل ہو جاتے ہیں اور کمزور سے کمزور افراد بھی اِس خطاب میں شامل ہو جاتے ہیں۔

اِس مثال میں جس کی تعریف نہیں ہونی چاہیے اُس کی بھی تعریف ہو جاتی ہے لیکن جب کبھی خدا مومنین سے گِلہ کرتا ہے اُن کی کسی کمزوری کی وجہ سے تو اُس میں بھی وہ سب لوگ شریک ہو جاتے ہیں حالانکہ وہ کمزوری نچلے طبقے سے ہوتی ہے۔ جو اعلیٰ طبقہ ہے ایمان کا اُس میں اِن کمزوریوں کا امکان بہت کم ہے لیکن اِس (Blame) میں، اِس شکایت میں ادنیٰ بھی شریک ہیں اور اعلیٰ بھی شریک ہیں، بالکل اسی طرح سے مذہبی طور پر دُنیا کے فرقوں کے اندر مقابلہ ہے اور جب مقابلہ ہے تو دین کے شروع سے لے کر آخر تک جو کچھ کام بنتا ہے جو کچھ کیا جاتا ہے اُس کا (Total) بنتا ہے، اُس کا مجموعی حساب کتاب ہوتا ہے اور خدا اِسی طرح سے دیتا ہے۔ لیکن ایک بات درمیان میں ضروری ہے اور وہ یہ کہ اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ افراد میں جو فرق و تفاوت ہے وہ سب ختم ہو جاتا ہے، وہ فرق و تفاوت اپنے مقام پر ہے لیکن زیادہ سے زیادہ اہمیت مجموعی حساب کتاب کی ہے اور آپ کو تعجّب ہو گا کہ یہ بھی ایک انکشاف ہے آج کے اِس (Lesson) میں اور کل کو آپ قرآن میں جا بجا یہ دیکھیں گے کہ قرآن کے اندر مقابلے کا تصوّر ہے اور زیادہ سے زیادہ اُس میں جماعتوں کا، مذاہب کا، فرقوں کا، قوموں کا ذکر ہے۔

اِس اشارے سے آپ ضرور سمجھتے ہیں کہ دانا کے نزدیک بڑی چیز کی بات ہو تو چھوٹی چیز اُسی کے تحت خود بخود آتی ہے، ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ خدا افراد کی بات کرے اور اقوام افراد کے تحت آئیں یہ بات صحیح نہیں ہے بلکہ دُرست یہ ہے کہ

خداوندِ عالم نے اقوام کی بات کی ہے، جماعتوں کی بات کی ہے، فرقوں کی بات کی ہے، زمانوں کی بات کی ہے، پیغمبروں کی بات کی ہے، آسمانی کتابوں کی بات کی ہے اور لوگوں کے اجتماعات کی بات کی ہے اور اِسی کے تحت افراد بھی آتے ہیں پھر بھی آپ کو شک نہ رہے کہ اِس میں افراد کا بھی ذکر ہے۔

ہم نے آپ نے اکثر افراد سے متعلّق ذاتی اعمال پر بہت توجّہ دی ہے اور ہم کو جو کچھ سکھایا گیا ہے وہ انفرادی طور پر سمجھایا سکھایا گیا ہے وہ غلط نہیں ہے صحیح ہے لیکن ایک پہلو یہ رہ گیا ہے کہ ہم کو مقابلے کا تصوّر نہیں دیا گیا ہے اِس سے ہمارا علمی نقصان ہو گیا ہے۔ اب میں اِس کی ایک مثال پیش کرتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ خداوندِ عالم کا ارشاد ہے: وَمَنْ كَانَ فِيْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِيْلًا (۱۷:۷۲)۔ جو کوئی اِس دُنیا میں اندھا ہو وہ کل کو قیامت میں بھی اندھا رہے گا اور جس کی وجہ یہ ہوگی کہ وہ راہِ راست پر نہیں تھا، گمراہ ہو چکا تھا کیونکہ ہادیٔ برحق کی ہدایت سے آنکھ کی روشنی اور دیدۂ دل راہِ راست پر مل سکتی تھی۔ اِس ارشاد سے ظاہری طور پر آپ کو یوں لگے گا یہ تو ایک انفرادی تعلیم کی بات ہے حالانکہ اِس میں قوم کا بھی ذکر ہے جو لوگ دُنیا میں اندھے ہیں، جو نظریہ اندھا ہے، تاریکی میں ہے تو اُس سے کل قیامت کے دن بھی کچھ نہیں ملے گا، جو مذہب اِس قدر پس ماندہ ہے اُس میں نور نہیں ہے تو پھر کل قیامت کے دن اُس میں نور کہاں سے آئے گا۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اسماعیلیوں کو جو سعادت میّسر ہوئی ہے وہ علمی صورت میں ہے اور اگر ہم علم کی طرف توجّہ نہ دیں، علم کو حاصل نہ کریں تو گویا ہم اپنے مذہب سے ناشکرے ہو جائیں گے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم جب اسماعیلی مذہب میں پیدا ہوئے تو اِس کا مقصد کیا تھا اور خود دُنیا میں آنے کا مقصد کیا ہے، ظاہر ہے کہ دُنیا میں آنے کا جو مقصد ہے وہی مقصد اسماعیلی مذہب ہے اور اسماعیلی مذہب کے اندر وہ مقصد پورا ہو سکتا ہے، وہ خدا کی شناخت ہے، اِس خدا کی شناخت سے علم کو ہم الگ نہیں کر سکتے اور اِس تشریح سے مُراد یہ ہے کہ ہم کو جو علم کا ذریعہ مہیّا کیا گیا ہے یعنی امامؑ تو ہم کیسے ناشکری سے اِس علم سے بے نیاز ہو سکتے ہیں اور اِس سے مُنہ پھیر سکتے ہیں۔ امامؑ کا مقصد ہی یہ علم ہے، امامؑ کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ہماری دنیاوی زندگی سدھر جائے وہ تو ضمنی اور ذیلی بات ہے جو سب انسانوں میں (Common) اور مشترک ہے۔ دنیاوی طور پر ہم دُوسروں سے کب آگے ہیں اور یہ میں اِس لئے کہتا ہوں کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ امامؑ اِس لئے ہیں کہ ہماری حالت دنیاوی طور پر بہتر ہو، بہتر ہونی چاہیے ٹھیک ہے لیکن نہیں بھی ہو سکتی ہے اور اب دُنیا کی بہت بڑی ترقّی یافتہ قوموں کے برابر ہم کہاں ہوئے ہیں جب نہیں ہوئے ہیں تو ظاہر بات ہے کہ دُنیا جو ہے اِس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ تو امامؑ کے دُنیا میں آنے اور ہمارے امامؑ کے دامن سے وابستہ ہو جانے کا مقصد یہی تھا کہ ہم علم کو اور معرفت کو کمائیں اور اگر ہم کو امامؑ دیا گیا ہے اور امامؑ کے علاوہ دُوسرے ذرائع ہیں اُن میں سوجھ بوجھ ہے ہم سمجھتے ہیں اور علم کے رستے مہیّا کئے گئے ہیں تو پھر ہم کس طرح اِس فریضہ سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں، کل کو ہم سے پوچھا جائے گا کہ تم کو اسماعیلی

مذہب میں پیدا کیا گیا تھا تو تم نے کیا پایا، کیا لیا۔ لہٰذا یہ ایک ذمّہ داری ہے، ایک فریضہ ہے اِس لئے علم کے لئے زیادہ سے زیادہ توجّہ دینے کی ضرورت ہے۔

میں یہ چاہتا تھا ایک طرف سے علم کی اہمیت کے بارے میں آپ کو گزارش کروں اور دُوسری طرف سے کچھ روحانیت کی بلندی کی باتوں کی طرف جانے کی خواہش تھی، بہرحال ہم نے یہ دعویٰ تو کیا کہ اسماعیلی مذہب کے اندر سب کچھ ہے علمی طور پر اور میں نے یہ بھی کہا کہ زیادہ سے زیادہ علم کی بلندی کی باتیں کرنے سے اور سمجھنے سے باقی ذیلی اور ضمنی جو چیزیں ہیں وہ خود بخود آجاتی ہیں تو میں یہ کہنا چاہتا تھا۔ مولا آپ کی بہت مدد کرے [آمین] اور علمی طور پر آپ کو نوازے [آمین]۔

ٹرانسکرائب اور ٹائپ: یاسمین آصف　　پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (ق س) کا پُرحکمت بیان
عنوان: رُوح خدا کی قدرتِ کاملہ اور عالمِ خواب
کیسٹ نمبر: ۲۵ تاریخ: ۱۹/۱۰/۱۹۷۸، کراچی

Click here for Audio

عزیزانِ من! یا علی مدد۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ ہمیں اِس بات کی فکر لاحق ہو جاتی ہے، بلکہ ڈر لگتا ہے کہ خداوندِ عالم کی توفیق کس پیمانے پر آئے گی، یا نہیں آئے گی، اِس کا ضرور خوف رہتا ہے۔ اِس لئے آپ گفتگو سے پیشتر ہاتھ اُٹھا کر خداوند سے یاری چاہیں، مدد مانگیں، تائید کے لئے دُعا کریں کہ ہماری آج کی مجلس کامیاب ہو جائے اور مولا ہم پر رحم فرمائے، ہم سب کو توفیق عنایت کرے اور ہم سب کو ہمّت دے، حوصلہ بخشے کہ ہم اِس عرصے میں اُس کی طرف متوجّہ ہو جائیں اور جو بات کرنی ہو دُرست طریقے سے کر سکیں اور ہر وقت اُس کی آپ سب عزیزوں پر نظر رہے، اِس کے لئے دُعا مانگنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ مومن کے لئے یہ ایک ضروری شرط ہے کہ وہ ہر وقت محتاط رہتا ہے، وہ کسی بات کو بھی آسان نہیں سمجھتا ہے۔ آسان ہر کام اُس وقت ہوسکتا ہے جب کہ خداوند کی نظر ہو، جب کہ اُس کی تائید ہو، جب کہ اُسی کی طرف [سے] یاری اور مدد آئے تو بے شک اُس وقت کام آسان ہو جاتا ہے، ورنہ آسان نہیں ہے۔ اِس کے لئے ہماری ہر وقت یہ کوشش ہونی چاہیے کہ مولا سے یاری چاہیں۔ یہ مومنوں کا شیوہ رہا ہے، اور یہ ہی مومنوں کا اُصول ہے۔

تو میرے عزیزو! آج میں جو کچھ گفتگو کرنا چاہتا ہوں وہ رُوح سے متعلّق گفتگو ہوگی کیوں کہ میں سمجھتا ہوں کہ آپ کے لئے رُوح کی باتیں بہت ہی اہمیت رکھتی ہیں اور بہت ہی ضروری ہیں، اور [اِس میں] شک نہیں کہ رُوح کی شناخت از حد ضروری ہے اِس لئے کہ رُوح ہی کی شناخت میں پروردگار کی شناخت پوشیدہ ہوتی ہے یا کہ رُوح کی شناخت خود پروردگار کی شناخت ہے۔ اِس لئے میں یہ کوشش کروں گا کہ کچھ رُوح اور رُوحانیت کی باتیں کی جائیں۔ تو سب سے پہلے میرے عزیزو! ہمیں یہ سوچنا چاہیے کہ بحیثیتِ مومنین کے خداوند نے ہم پر جو فرائض عائد کئے ہوئے ہیں وہ بہت بڑے فرائض ہیں۔ یعنی جب ہم کو پاک دین عطا کیا گیا ہے، جب ہم کو دین کی شناخت دی گئی ہے اور جب ہم امامؑ کی رُوحانی اولاد کی حیثیت سے ہیں تو آپ اندازہ کریں کہ اِسی کے ساتھ ساتھ ہمارے کتنے بڑے فرائض ہیں۔ ظاہر ہے کہ جس کسی کو خدا کا دین، رسولؐ کا دین یعنی سچّا دین دیا گیا ہے اور جس کو دینِ حق میں پیدا کیا گیا ہے، اُس کے فرائض بھی ایسے ہی اہم اور بہت ہی بڑے ہوا کرتے ہیں۔

اِس لئے ہمیں جاننا چاہیے، ہم کو[یہ] احساس ہونا چاہیے ہر وقت اور ساتھ ہی ساتھ ہمیں شکر گزاری کرنی چاہیے کہ پروردگارِ عالم نے مومنین پر احسان کیا ہے، کہ اُس نے اپنی شناخت کے وسائل فراہم کر دیئے ہیں۔ تو کتنی بڑی نعمت ہے یہ مجلس بھی جس میں کہ ہم باہم مل کر بیٹھتے ہیں، کچھ وقت عبادت یا گریہ وزاری میں گزارتے ہیں، کچھ وقت علم کی باتیں سننے میں بسر کرتے ہیں اور بعض دفعہ سوال و جواب بھی کرتے ہیں، گنان پڑھتے ہیں، کیسیٹ سنتے ہیں۔ کتنی اچھی بات ہے اور یہ لمحات ہماری زندگی میں سے انتہائی گرانقدر اور انمول ہیں کہ ہم کو یہ موقع حاصل ہے کہ ہم دُنیا کی تلخیوں کو بھُلا دینے کے لئے ایک گوشے میں بیٹھتے ہیں اور ایک چھوٹی سی رُوحانی مجلس منعقد کرتے ہیں۔ کتنی اچھی بات ہے اور کتنا سکون ملتا ہے بعض دفعہ، البتہ ہم میں سے ہر ایک رُوحانی دولت سے مالا مال ہو جاتا ہے۔ وہ محسوس کرتا ہے کہ اُس کو رُوحانی دولت مل گئی ہے، وہ سمجھتا ہے کہ مولا اُس سے راضی ہوا ہے، اُس کو یقین ہوتا ہے کہ اُس کے بہت سے گناہ بخش دیئے گئے ہیں، ایسا ہی احساس ہوتا ہے، ایسا ہی خیال آتا ہے۔ تو یہ مومنین کی بہت بڑی سعادت مندی ہے کہ ہمیں اِس مشکل زمانے میں گوشۂ عافیت میں، گوشۂ درویشی میں بیٹھنے کا اور امامؑ کی باتیں کرنے اور سننے کا موقع میسّر آتا ہے۔ بعض دفعہ میرا دل بہت پگھلتا ہے آپ عزیزوں کی شرافت کو دیکھ کر، آپ عزیزوں کی فضیلت کو، سنجیدگی کو دیکھ کر، انتظار کو اور ادب کو سامنے رکھتے ہوئے میں بعض دفعہ پگھل جاتا ہوں، میرا دل بہت ہی نرم ہو جاتا ہے۔ سچ بات ہے، میں بعض دفعہ اِس مجلس سے بڑا اچھا اثر لیتا ہوں، میں متاثّر ہو جاتا ہوں۔ تو اِس لئے کہ آپ میں جو صداقت ہے، آپ کو جو اِس مجلس پر اعتماد ہے وہ بے مثال ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اِن خصوصیات کی بنا پر آپ کو رُوحانی دولت اور سعادت میسّر ہوتی رہتی ہے۔

تو عزیزانِ من! مَیں نے کہا تھا کہ ہم رُوح کی باتیں کریں گے اور وہ اِس لئے کہ رُوح کا علم بہت ہی مخفی ہے اور جو چیز جتنی مخفی ہوتی ہے وہ اِس قدر اہم اور مفید بھی ہوتی ہے۔ جس طرح رُوح خود مخفی ہے اسی طرح رُوح کا علم بھی مخفی ہے اور مخفی تو سب سے پہلے خدا ہی ہے۔ کیونکہ خدا نے اپنے مرتبے کے متعلّق فرمایا کہ ''میں چھپا ہوا خزانہ تھا'' فرمایا کہ ''میں گنجِ مخفی تھا، ایک پوشیدہ خزانہ''۔ تو مخفی کی یہ تعریف ہے، مخفی کی یہ صفت ہے۔ کیوں؟ اِس لئے کہ جو چیز گرانقدر ہو، انمول ہو، قیمتی ہو اور نایاب ہو وہ مخفی ہوا کرتی ہے۔ قرآن کے اندر جو حقیقی علم ہے وہ مخفی ہے، قرآن ہی میں مخفی ہے، لفظوں کے معنی میں مخفی ہے، حکمت کے طور پر مخفی ہے، رمز، کنایہ، اشارہ اور تاویل کے انداز میں مخفی ہے۔ حقیقت کا علم، حقیقت کی باتیں، معرفت کی باتیں یہ سب چیزیں قرآن کے اندر مخفی ہیں۔ نہ صرف قرآن ہی کے اندر بلکہ ہمارے باطن میں بھی یعنی ہمارے نفس کے اندر بھی خدا کی نشانیاں ہیں، خدا کے معجزات ہیں، رُوح و رُوحانیت کے، علم کے خزانے ہیں، جو مخفی ہیں۔ اِس کے علاوہ اس کائناتِ ظاہر کے بارے میں غور کیجئے کہ اِس صفحۂ کائنات پر بھی خدا کی نشانیاں ہیں، خدا کی آیات ہیں جس میں کہ علم اور حکمت کے انمول خزانے پوشیدہ ہیں۔ اِس پوشیدگی کو ''راز'' بھی کہا جاتا ہے، کہا جاتا ہے کہ ''حیات و کائنات کے

بھید، راز"۔ یہاں حیات سے مراد "رُوح و رُوحانیت" ہے، اس کا مطلب زندگی کے اندر اور اِس کائناتِ ظاہر کے اندر خدا کے بہت سے بھید چھپے ہوئے ہیں۔

اِس سلسلے میں، مَیں جو کچھ بھی کہہ رہا ہوں اُس میں یہ بات ہے کہ خدا کا جو خاص علم ہے وہ پوشیدہ ہے، وہ مخفی ہے جس طرح میں نے کہا کہ خدا خود بھی ایک پوشیدہ خزانہ ہے۔ تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ خداوندِ عالم نے اپنی قیمتی چیزیں یا کہ قیمتی علم، بھید، اسراریوں مخفی رکھے ہیں؟ اِس لئے اور صرف اسی لئے کہ خاص مومنین کے لئے یہ چیزیں [یعنی] خدا کی دولت، خدا کی نعمت مخصوص رہے اور اِن چیزوں تک عوام کی رسائی نہ ہو، عوام جو اِس کے اہل نہیں، عوام جو اِس کے حقدار نہیں، اُن کو یہ لازوال دولت اور یہ بے پایان خزانے حاصل نہ ہوں یہی خدا کا منشاء ہے، یہی خدا کی مصلحت ہے۔ اب چونکہ اِن حقیقتوں کا یا کہ اِن خزانوں کا تعلّق مومنین سے ہے اور مومنین کے لئے یہ مراتب ہیں، یہ درجے ہیں، یہ چیزیں رکھی ہوئی ہیں اِس لئے رُوحانی علم ہے یا جو رُوحانیت ہے وہ پوشیدہ ہے اور پوشیدہ اِس معنیٰ میں ہے کہ رُوحانیت اصل میں خود بخود دیکھنے کی چیز ہوتی ہے۔ یعنی مومن کو چاہیے کہ رُوحانیت کا مشاہدہ کرے، اُس کو اپنے دل کی آنکھ سے خود دیکھے اور خود پائے۔ ہاں! دُرست ہے، خود دیکھنے کے علاوہ ایک اور مقام [بھی] ہے، ایک اور درجہ ہے وہ یہ کہ علمُ الیقین کے طور پر ہم اپنے اِس مقدّس دین کی بدولت اِن چیزوں کو پاسکتے ہیں، اِن چیزوں کو حاصل کر سکتے ہیں۔ فرامین، گنان اور بزرگانِ دین کی باتوں سے ہم رُوح کے متعلّق خاص خاص باتیں یعنی علمُ الیقین حاصل کر سکتے ہیں۔

تو رُوح سب سے نرالی شئ ہے اور سب سے انوکھی چیز ہے۔ پروردگارِ عالم نے اپنی قدرتِ کاملہ سے جو سب سے عجیب چیز پیدا کر دی ہے اور کسی چیز کے پیدا کرنے کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ کی کاریگری اور اِس کی حکمت کا جو تقاضا ہے، اُس کے مطابق خدا نے رُوح کو پیدا کیا ہے۔ یعنی رُوح ایک ایسی چیز ہے کہ اُس کے دیکھنے سے اللہ تعالیٰ کی بہت سی قدرتوں اور حکمتوں کا مشاہدہ ہو جاتا ہے اور خدا کی شناخت ہو جاتی ہے۔ دُنیا میں کسی اعلیٰ شخصیت کو آپ اُس کے علم، ہنر، اخلاق اور دیگر اوصاف سے پہچانتے ہیں، اِسی طرح خدا کی شناخت کا وسیلہ صرف اور صرف رُوح ہے اور وہ اِس لئے کہ خداوند نے اپنی کاریگری، اپنی حکمت اور قدرت کو بروئے کار لاتے ہوئے رُوح کو مکمل کیا ہے، رُوح کو سجایا ہے، رُوح کو سنوارا ہے اور بہت عجیب طرح سے رُوح کو درجۂ کمال پر پہنچا دیا ہے۔ اِس لئے رُوح کے دیکھنے کے ساتھ ساتھ ترتیب وار خدا کی قدرتیں، حکمتیں اور مہربانیاں سامنے آتی ہیں، مشاہدے میں آتی ہیں۔ اِس معنی میں رُوح کی شناخت خدا کی شناخت ہے۔ چنانچہ رُوح کی بہت سی مثالیں ہیں، اگر رُوح کی کوئی ایک مثال ہوتی تو ہم رُوح کی اتنی تعریف نہ کرتے اور نہ کہتے کہ رُوح بہت ہی عجیب ہے۔ رُوح عجیب و غریب اِس معنی میں ہے کہ اُس کی مثالیں بہت زیادہ ہیں، اُس کے جلوے بہت زیادہ ہیں، اُس کی رنگینیوں کا کیا کہنا! رُوح کے حُسن و جمال کی تعریف نہیں ہو سکتی ہے کیونکہ اُس میں خداوندِ عالم کی صفات کا ظہور ہے۔ یہ بہت بڑی

بات ہے جو میں نے کہی کہ رُوح کے اندر اللہ تعالیٰ کے صفاتی ناموں کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔

آپ نے اللہ کے جتنے نام سُنے ہیں، جتنے نام اللہ کے قرآن میں ہیں، اُن سب ناموں کا عملاً رُوح میں ظہور ہے۔ یعنی اللہ کے ناموں میں سے ایک نام، رحمان ہے، تو رحمان کا رُوح میں ظہور ہوتا ہے، رحیم کا ظہور ہوتا ہے، حکیم کا ظہور ہوتا ہے، خالق کا ظہور ہوتا ہے، رازق کا ظہور ہوتا ہے۔ اِسی طرح ایک ایک ہو کر سب نام مومن کی رُوح میں اپنا جلوہ دکھاتے ہیں، ظہور کرتے ہیں، نزول کرتے ہیں یعنی بلندی سے پستی کی طرف آ کر اللہ کا ہر نام اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔ ظاہری طور پر ہم تو صرف خدا کے ناموں کو لفظی صورت میں دیکھتے ہیں یا تحریر میں دیکھتے ہیں یا آواز میں سُنتے ہیں یہ جو نام ہیں خدا کے، اِس کے سوا ہم کو اِن ناموں کے متعلّق کچھ پتا نہیں چلتا ہے اور زیادہ سے زیادہ لفظی طور پر اگر کوئی تحلیل کرنا چاہے تو کسی نام کے معنی سمجھ میں آتے ہیں کہ جب بندۂ مومن رُوحانیت میں داخل ہوتا ہے اور اُس پر رُوحانیت کا انکشاف ہوتا ہے تو اُس وقت اللہ تعالیٰ کے سب نام اپنا کرشمہ دکھاتے ہیں، اپنا معجزہ دکھاتے ہیں۔ یعنی رحمان کی رحمانیت، رحیم کی رحیمیت اور قادر کی قدرت، حکیم کی حکمت، ربّ کی ربوبیت، الٰہ کی الوہیت، یہ سب صفات، رُوح کی شناخت کے سلسلے میں سامنے آتی ہیں اِسی کو رُوحانیت کہا جاتا ہے، اِسی سے خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ یعنی کہنا یہ ہے [کہ] جب تک خدا کی خالقیت کا پتہ نہ چلے یعنی جب تک یہ معلوم نہ ہو کہ خداوندِ عالم تخلیق کس طرح کرتا ہے، اِس کائنات کو اُس نے کس طرح بنایا، جب اِس پر نظر نہ پڑے، جب اِس کا مشاہدہ نہ ہو تو پھر معرفت کیسی؟ معرفت سے خدا کی شناخت یعنی پہچان مُراد ہے اور پہچان میں خدا کے سب اوصاف کا ذکر ہے یعنی خدا کو کامل طور سے پہچاننا، اُس کے اوصاف کس طرح کام کرتے ہیں اُس کا مشاہدہ کرنا، ازل اور ابد کی حقیقتوں کو دیکھنا۔ خدا کا اِس کائنات پر کس طرح (Control) ہے؟ رُوح کی پرورش کس طرح ہوتی ہے؟ خدا کے جلال و جمال کی کیا کیفیت ہے؟ تو جب تک اِن چیزوں کا پتا نہ ہو تو اُس کو معرفت نہیں کہتے ہیں۔ معرفت گو کہ (Literal Meaning) میں لغوی طور پر کسی بھی چیز کی پہچان کے لئے آسکتی ہے لیکن اصطلاحی طور پر یہ معرفت صرف خدا اور رُوح کی شناخت کو کہتے ہیں تو خدا کی شناخت ایک تفصیلی چیز ہے یعنی اِس کے اندر بہت ہی وسعت ہے۔ تعجّب کی بات ہے کہ لوگ معرفت کے بارے میں سوچتے نہیں ہیں اور بعض مومنین بھی اِس میں اندازہ نہیں کرتے ہیں کہ معرفت سے کیا مُراد ہے اور معرفت کے حدود کیا ہیں؟ اور معرفت میں کن کن حقیقتوں کی شناخت ہو جاتی ہے؟ کبھی انہوں نے نہیں سوچا ہے۔ اِسی کی میں تشریح کر رہا ہوں اور کہہ رہا ہوں کہ معرفت کے حدود یہ ہیں کہ اِس معرفت سے کوئی چیز نہیں بچتی ہے۔ اِس معرفت سے، اِس شناخت سے، اِس پہچان سے کوئی چیز باہر نہیں ہے۔

چاہے ازل ہو یا ابد، عرش ہو یا کرسی، قلم ہو یا کہ لوح، فرشتے، رُوحیں، بہشت، دوزخ، آخرت اور سب مخلوقات اور بہت سے بھید، ہر چیز اور ہر چیز تو اِس کو معرفت کہتے ہیں اور یہ چیز یعنی یہ معرفت عملی طور پر حاصل ہوتی ہے گو کہ اِس کا آغاز

اقرار سے ہوتا ہے کہ مومن جب خدا کے لئے اقرار کرتا ہے، یہ بھی بنیادی قسم کی معرفت ہے۔ لیکن اِس کی تکمیل مشاہدات سے، دیکھنے سے اور رُوحانی معجزات سے ہوتی ہے۔ ہاں! یہی سبب ہے کہ معرفت بہت بڑی چیز ہے، رُوح کی شناخت بہت بڑی چیز ہے، اِسی لئے اِس کے عوض اور صلے کے طور پر خدا نے خود کو پیش کیا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ بہشت ملے گی تو یہ دانشمند کی نظر میں کوئی بڑی چیز نہیں ہے، سب سے بڑی چیز یہ ہے کہ خدا ملے گا، اور وہ بھی ایک خزانے کے طریق پر۔ جب خدا ایک خزانے کے طور سے ملے گا تو آپ اندازہ کریں کہ وہ کن معنوں میں ملے گا؟ خدائی کے ساتھ، سلطنت کے ساتھ اور تمام اوصاف کے ساتھ ملے گا۔ وہ خود کو اپنے تمام خزانوں کے ساتھ، وہ خود کو اپنی تمام صفات کے ساتھ کائنات کے ظاہر و باطن کی سلطنت و حکومت کے ساتھ خود کو پیش کرتا ہے، یہ خداوندِ عالم کا آخری اور سب سے بڑا انعام ہے۔ اِس سے پتا چلتا ہے کہ معرفت کی اہمیت کیا ہے، معرفت کا درجہ بہت ہی بلند ہے، بہت ہی عالی ہے۔ اِس لئے دین میں معرفت کی بہت بڑی اہمیت ہے اور عبادت و بندگی معرفت کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتی ہے۔ جب پوچھا جاتا ہے کہ انسان کے اِس دُنیا میں آنے کی غرض کیا تھی؟ کیا مقصد تھا جس کی تکمیل کے لئے انسان اِس دُنیا میں آیا؟ تو قرآن جواب دیتا ہے کہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (۵۱:۵۶) تخلیقِ کائنات اور انسان کے اِس دُنیا میں آنے کا مقصد عبادت ہے، لیکن عبادت معرفت کے بغیر نہیں ہے، پہلے معرفت ہے پھر عبادت ہے لیکن اِس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بندۂ مومن کامل معرفت کے لئے انتظار کرے اور عبادت نہ کرے، یہ بات نہیں ہے۔ شروع شروع میں معرفت جس قدر بھی ہو اور جتنی بھی ہو اُسی کو قبول کیا جاتا ہے، لیکن رفتہ رفتہ معرفت کی تکمیل کے لئے کوشش کی جاتی ہے اور پھر معرفت کے بعد عبادت کامیاب ہو جاتی ہے۔ اِس لیے فرمایا گیا کہ انسان کے دُنیا میں آنے کا مقصد عبادت اور معرفت ہے۔

ایک بات اِس سلسلے میں یہ کہ رُوح کی شناخت میں جیسا کہ مَیں نے شروع میں کہا تھا خدا اور رسولؐ، امامؑ اور ہر چیز کی شناخت ہو جاتی ہے تو یہ بات اِس لئے بتائی گئی کہ یہ خیال نہ کیا جائے کہ رسولؐ کی اور امامؑ کی معرفت الگ ہے، الگ نہیں ہے۔ جب انسان کی خود کی معرفت خدا کی معرفت ہو سکتی ہے تو، پھر کیا بات ہے کہ پیغمبرؐ اور امامؑ کی معرفت خدا کی معرفت نہ ہو بلکہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ امامؑ ہی کے وسیلے سے معرفت کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ رُوحانیت کے حاصل کو معرفت کہا جاتا ہے، رُوحانیت کے مشاہدات اور پھر اُن کی شناخت کا نام معرفت ہے، اور یہی رُوح کی باتیں ہیں، [یہ] رُوح سے الگ نہیں ہے اور درمیان میں رُوح کی کچھ مثالیں بیان کروں گا چونکہ میں نے شروع میں واضح کیا تھا کہ رُوح کی بہت سی مثالیں ہیں اور میں نے یہ بھی کہا تھا کہ رُوح بہت ہی عجیب ہے، لیکن مَیں نے معرفت کی باتیں کیں گو کہ معرفت رُوح سے الگ نہیں ہے، رُوح کے مشاہدات کے نتیجے کو معرفت کہا جاتا ہے۔ تاہم آپ شاید یہ چاہیں گے کہ خود رُوح کے مشاہدات کا تھوڑا سا تذکرہ ہو تو یہ ہے کہ رُوح کی مثالیں بہت زیادہ ہیں۔ اِس کائناتِ ظاہر میں جتنی چیزیں ہیں اُن میں

سے اکثر سے رُوح و رُوحانیت کی مثال دی گئی ہے۔ جب مومن خصوصی عبادت میں کامیاب ہو جاتا ہے تو اُس وقت اُس کے دل کی آنکھ کُھل جاتی ہے اور وہ اپنے آپ میں ایک کائنات کو پاتا ہے اور مَیں جس کائنات کا اپنے اِن الفاظ میں ذکر کرتا ہوں وہ کائنات ایسی نہیں جس طرح کہ کچھ عام شاعر لوگ اپنے خیال سے کسی مَن کی دُنیا کا ذکر کرتے ہیں، تو وہ بالکل خیال کی تاریکی میں بات کرتے ہیں۔ وہ الفاظ سے کسی چیز کی نقشہ کشی تو ضرور کر سکتے ہیں، لیکن اُن کے سامنے ایسی کوئی روشن چیز نہیں ہوتی ہے اِس لئے یہ خیال نہیں کیا جائے کہ میں جس کائنات کا ذکر کرتا ہوں وہ برائے نام کائنات ہے بلکہ وہ ایک کائنات ہے، جو حقیقتاً ایک روشن کائنات ہے۔ تو بندۂ مومن جب عبادت و بندگی میں آگے بڑھتا ہے تو اُس کے دل کی آنکھ کھل جاتی ہے، وہ اپنے آپ میں ایک روشن دُنیا کو پاتا ہے جس میں طرح طرح کی مثالیں اُس کے سامنے آتی ہیں۔

میں ترتیب وار بات نہیں کرتا ہوں لیکن درمیان درمیان سے کچھ مثالیں بتانا چاہتا ہوں چونکہ یہ مقصود نہیں ہے کہ میں منزل بہ منزل اُس کا تذکرہ کروں لیکن درمیان سے کوئی بات آگے سے اور کوئی بات پیچھے سے میں بتاؤں گا۔ وہ یہ کہ بعض دفعہ مومن کے سامنے یعنی دل کی آنکھ سے وہ دیکھتا ہے کہ ایک باغ و گلشن ہے اور ایک ہری بھری دُنیا ہے جس میں پھول ہیں، درخت ہیں، پھل ہیں اور کھیتی باڑی ہے اور ایک بہت ہی آباد اور سرسبز دُنیا اُس کے سامنے ہے۔ اِس کا کیا مطلب ہے؟ اِس کے بہت سے مطالب ہیں۔ اُن میں سے ایک مطلب تو یہ ہے کہ [گویا] تشبیہہ دی جاتی ہے رُوح کی، یا کہ رُوح کی شکلوں میں سے ایک شکل اُس کو دکھادی جاتی ہے کہ رُوح ایک دُنیا ہے، رُوح ایک باغ کی طرح ہے، رُوح اپنے آپ میں ایک گلشن ہے اور رُوح کے اندر بہشت ہے، پھول ہے، پھل ہے اور اُس میں ایک آباد اور پُر رونق دُنیا پوشیدہ ہے۔ لیکن ایک فرق اُس میں اور دُنیائے ظاہر میں یہ ہے کہ اُس کی ہر چیز رنگینی سے بھرپور ہوتی ہے، مثلاً اگر گلشن ہے یا باغ ہے یا درخت ہے تو درخت کا پتّا پتّا اِس قدر رنگینیوں سے بھرا ہوا ہوتا ہے کہ دیکھنے والا اُس پتّے کے مشاہدے سے اِس قدر مسرور اور شادمان ہو جاتا ہے کہ وہ خوشی سے پُھولے نہیں سماتا۔ اُس کے اندر یہ تاثیر ہے، اُس میں اتنی خوشی ہے، اُس میں ایسی مسرّت و شادمانی ہے، اُس میں اتنی رنگینی ہے۔ جیسے کہ پروردگارِ عالم نے قرآن کے اندر ارشاد فرمایا ہے کہ: صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۖ وَّنَحْنُ لَهٗ عَابِدُوْنَ (۲:۱۳۸)۔ خدا نے مومنین کے باطن کو اپنے نور کی رنگینیوں سے رنگ دیا ہے اور خدا سے بڑھ کر کوئی ایسا کاریگر ہے جو خدا کے ساتھ مقابلہ کرے رنگنے میں اور ہر چیز کو رنگین بنانے میں؟ کوئی ہے کہ ایسی چیز بنائے اور پیش کرے جو خدا کی چیز سے بڑھ [کر ہو]، دلکشی میں، خوبصورتی میں، حسن و جمال میں، رنگینی میں؟ تو اِس آیت کا مطلب یہ ہے اور اِس کے بعد فرمایا گیا کہ: وَنَحْنُ لَهٗ عَابِدُوْنَ (۲:۱۳۸)۔ یعنی اِس رنگینی کے ساتھ ساتھ عبادت کا ذکر آیا ہے۔ اِس کا اشارہ ہے کہ ذکر و عبادت اور علم کے نتیجے پر یہ ہوتا ہے کہ خداوندِ عالم مومن کے باطن کو رنگینیوں سے، نور کے جلوؤں سے اور نور کی رنگینیوں سے سجاتا ہے اور بھرپور کر دیتا ہے، یہ رُوح کی مثالوں میں سے ایک مثال ہے۔

بعض دفعہ مومن اِس رُوحانی سفر میں آسمان کی چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے، مثلاً سورج کو دیکھتا ہے، چاند کو دیکھتا ہے اور ستاروں کو دیکھتا ہے۔ بعض دفعہ صاف ستھرے آسمان کا مشاہدہ کرتا ہے اور بعض دفعہ ابر آلود آسمان کو دیکھتا ہے، یہ سب رُوح کی مثالیں ہیں۔ ایک طرف سے یہ رُوح کی مثالیں ہیں، رُوح کی شکلیں ہیں اور پھر دُوسری طرف سے اِن احوال میں اشارے ہیں مومن کے لئے اور اشاروں کو سمجھنے کا ایک اُصول یہ ہے کہ جب بندۂ مومن آسمانی چیزوں کا مشاہدہ کرتا ہے تو اُس کو یہ اشارہ ملتا ہے کہ اُس کے رُوحانی سفر کا رُخ بلندی کی طرف ہے۔ جب وہ سورج کو دیکھتا ہے تو یہ امامؑ کی مثال ہے، جب وہ چاند کو دیکھتا ہے تو یہ امامؑ کے وزیر یعنی پیر وحجّت کی مثال ہے۔ جب وہ ستاروں کو دیکھتا ہے تو پیر اور حجّت کے بعد والے درجات کی مثال ہے۔ جب صاف آسمان کو دیکھتا ہے، تو اُس کی رُوحانیت (Clear) ہوتی ہے، جب بادلوں کے ساتھ آسمان کو دیکھتا ہے تو اُس کی رُوحانیت میں کچھ کُدورت پائی جاتی ہے۔ یہ سب رُوح ہے اور رُوحانیت ہے، رُوح کی شکلیں ہیں، رُوح کی مثالیں ہیں۔ یہ مثالیں مومن رُوحانیت میں بھی دیکھتا ہے اور خواب میں بھی [دیکھتا ہے]۔

<u>خواب بھی ایک قسم کی رُوحانیت ہے لیکن خواب وہ جو صفائی سے ہو</u>۔ کُدورت والا خواب نہیں، پریشان خواب نہیں، پریشان سے مُراد بکھرے ہوئے خواب جن کی کوئی ترتیب نہ ہو۔ مومن جب کوئی نورانی خواب دیکھتا ہے تو ایک دم سے محسوس کرتا ہے کہ اُس نے ایک خصوصی خواب (Special) خواب دیکھا۔ یہ خواب اُس پر اپنا ایک نمایاں اثر چھوڑتا ہے، وہ خوشی کے مارے جاگتا ہے اور نہ بھی جاگے تو جب بیدار ہوتا ہے تو وہ خواب اُس پر نہایت ہی شاندار طریقے سے اثر ڈالتا ہے تو ایسا خواب نورانی ہوتا ہے، خواب کا ذکر اِس لئے کہ یہ سب رُوح کی مثال ہے، یہ سب رُوح ہے۔ اِس مقام پر ایک اہم نکتہ آپ کو بتاؤں [کہ] بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ خواب کی حالت میں وہ آسمان پر جاتے ہیں یا کسی دُوسری دُنیا میں چلے جاتے ہیں، یہ بات نہیں ہے۔ خواب رُوح کی اپنی کیفیت ہے اور رُوح اپنے آپ میں دیکھتی ہے خواب دیکھنے کے لئے کہیں جانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اِس سلسلے میں ایک بنیادی بات یہ ہے کہ مکان اور لامکان کا جو تصوّر ہے اُس میں فرق کرنا چاہیے یا یہ سمجھنا چاہیے کہ کچھ چیزیں مکانی ہیں اور کچھ چیزیں لامکانی ہیں۔ مطلب اِس کا یہ ہوا کہ کچھ چیزیں ایسی ہیں جن کے لئے مکان یعنی جگہ کی کوئی ضرورت نہیں ہے (Space) کی ضرورت نہیں ہے اور اُن میں سے سب سے پہلی چیز جس کے لئے جگہ کی ضرورت نہیں ہے، رُوح ہے۔ خدا کے لئے، رُوح کے لئے (Space) کی کوئی ضرورت نہیں ہے، وہ لامکانی چیز ہے اور جو چیز لامکانی ہے، (Spaceless) ہے وہ (Timeless) بھی ہے، اُس کے اندر (Time) نہیں ہے۔ (Time) نہیں ہے سے مُراد اُس کے اندر جو (Time) کا تصوّر ہے، جو وقت کا تصوّر ہے وہ دُنیا کے وقت سے مختلف ہے، آپ اُس کو لامکان اور لازمان کہہ سکتے ہیں۔ آپ کو ہماری تحریروں میں لامکان اور لازمان جیسے تصوّرات کی وضاحتیں ملتی رہیں گی تو ہم احتیاط رکھتے ہیں کہ دُور نہ جائیں اور چلیے لوٹتے ہیں رُوح کے قصّے کی طرف کہ رُوح کی بہت سی مثالیں ہیں اور اُس میں سے رُوح

کی[ایک] مثال آسمان سے بھی دی جاتی ہے،یعنی رُوح کے اندر آسمان کی مثال بھی آتی ہے،بلندی کی مثال آتی ہے۔

اِسی طرح بعض دفعہ مومن خواب میں اپنی کمزوریوں کو دیکھتا ہے،کسی بھی صورت میں اپنی کمزوریوں کو دیکھتا ہے اِس پر گفتگو کرنے میں بڑا فائدہ ہے،ترقّی کے لئے یہ ایک ریسرچ کی طرح ہے کہ ہم رُوح کی گفتگو کے سلسلے میں خواب کا بھی ذکر کریں اور بات کے اندر سے بات پیدا ہو جاتی ہے اور اُس میں سوال اُبھرتا ہے۔ یہاں پر ایک سوال یہ اُبھرا ہے کہ کیا خواب میں پیش گوئی کا پہلو بھی ہے؟ یا اِس سوال کو یوں پوچھنا چاہیے کہ کیا خواب کا تعلّق زیادہ سے زیادہ اُس انسان کو سدھارنے یا اُس کو آگاہ کرنے سے ہے یا کہ آنے والے واقعات کے متعلّق خواب میں اشارے ملتے ہیں،اِس میں کونسا پہلو زیادہ نمایاں ہے؟ میں تو یہ کہوں گا کہ خواب کے اندر گو کہ پیش گوئی بھی تو ہوتی ہے لیکن خواب کا زیادہ سے زیادہ تعلّق مومن کو سدھارنے سے ہے،اِس لئے خواب کے اندر اشارے ہوتے ہیں۔مومن کی رُوحانی پوزیشن کیا ہے،کتنی ترقّی ہے یا کتنی کمزوری ہے وہ باتیں سامنے آتی ہیں تا کہ ہوشیار اور دانشمند مومن اپنی حالت وکیفیت سے جائزہ لے اور پتا کرے کہ اُس کی کیا پوزیشن ہے،خدا بھی زیادہ سے زیادہ یہی چاہتا ہے۔خدا اِس بات کو بہت کم چاہتا ہے کہ مومن خود کو نہ سدھارے،اپنی ترقّی اور اصلاح سے کوئی تعلّق نہ رکھے بلکہ اپنے خواب کی روشنی میں پیش گوئی کرے اور آنے والے حالات سے آگاہ ہو کر لوگوں کو بتائے کہ میں نے یہ خواب دیکھا تھا اور تمہارے لئے ایسی بہتری ہو رہی ہے اور فلاں شخص کے لئے یہ نقصان ہو رہا ہے،انہی باتوں میں مصروف ہو جائے تو اِس سے مومن کو فائدہ نہیں ہے۔خدا یہ چاہتا ہے کہ خواب کو بھی ہدایات کا ایک ذریعہ بنائے،خواب میں بھی مومن کو ہدایت ملے۔خواب میں مومن کو پتا چلے کہ اُس کی رُوحانیت کا معیار کیا ہے،اُس کی ترقّی کیا ہے،[اُس کی] عبادت کس حد تک کامیاب ہو چکی ہے۔اُس کی نیکی اور بدی کی کیا حالت ہے،تو اسی کے مطابق خواب آتے ہیں۔میں کہہ رہا تھا کہ خواب ایک طرف سے دیکھا جائے تو رُوح کی مثالیں ہیں اور دُوسری طرف سے دیکھا جائے تو اُن مثالوں کے اندر مومن کے لیے ہدایتیں ہیں،(Guidance) ہے۔اِس لئے مومن جو اگر چاہے کہ رُوح کی کتاب کو پڑھے اور اُس سے معرفت کو حاصل کرے تو اُس میں ایسی باتیں ملتی رہتی ہیں،رُوح کے عجائبات بہت عجیب وغریب ہیں۔میرے خیال میں یہ باتیں دلچسپی سے اور فائدے سے خالی نہیں ہیں اور میرا دعویٰ ہے اِس گفتگو کے اندر بہت سے فائدے ہیں،بہت سی معلومات،بہت سے تجربات ہیں۔اِس لئے مومن کو چاہیے کہ وہ اپنے نکتۂ نظر کو بدل لے اور اپنے نظریات میں ترمیم کرے،[اپنے] خواب ہی سے وہ سمجھے کہ اُس کی عبادت کہاں تک کامیاب ہو چکی ہے یعنی اگر خواب میں ڈر لگتا ہے تو یہ (Warning) ہے کہ مومن کمزور ہے۔خواب کے اندر کوئی اچھی چیزیں دیکھنے میں نہیں آتی ہیں تو مومن کمزور ہے،پھر مومن کو اپنے اخلاق کا (Correction) کرنا چاہیے۔عبادت بندگی،اپنی نظر،اپنی زبان،کان،دل ودماغ اِن تمام چیزوں پر پابندی لگانی چاہیے تا کہ مومن کی ترقّی ہو اور [وہ] رُوحانیت میں آگے بڑھے،رُوحانیت کے مشاہدات سے معرفت کو حاصل کرے۔

رُوح کی شکل وصورت کا سوال سامنے آتا ہے کہ رُوح کی شکل وصورت کیسی ہے؟ اور دُوسری بات کہ کیا رُوح دیکھنے میں آتی ہے؟ ہاں رُوح مشاہدے میں آتی ہے، دیکھنے میں آتی ہے، رُوح کی شکلیں، صورتیں بہت زیادہ ہیں۔ جس طرح کہ میں نے کہا کہ رُوح کی مثالیں بہت زیادہ ہیں تو رُوح ایک پوری کائنات ہے، یہ رُوح کی بڑی شکل ہے۔ پھر اسی کائنات کے سلسلے میں رُوح کی چھوٹی شکلیں ہیں، رُوح سورج کی طرح نمودار ہوسکتی ہے، چاند کی طرح، آسمان کی طرح، ستاروں کی طرح، فضاؤں کی طرح، باغ کی طرح، گلشن کی طرح، سمندر کی طرح، کسی مکان کی طرح، ایک اجنبی انسان کی طرح، کوئی ایسے انسان کی طرح جس کو ہم پہچانتے ہیں۔ رُوح مرد کی طرح، عورت کی طرح، رُوح خدا کی طرح، رُوح پیغمبر کی طرح، رُوح امام کی طرح، روح اپنے عزیزوں، ماں باپ اور دیگر رشتہ داروں اور دوستوں کی طرح ہر ایک کا رُوپ یہ دھار سکتی ہے۔ جو کچھ ہم دیکھتے ہیں رُوحانیت میں، خیال میں اور خواب میں وہ رُوح ہے، جب رُوح سب کچھ بن سکتی ہے تو کسی غیر کے آنے کی کیا ضرورت ہے۔ یہاں تک کہ مجھے کہنے کی اجازت ہو کہ جب امامؑ کا، یا خدا کا، پیغمبر کا آنا ہوتا ہے تو اُس میں بھی باہر سے کوئی نہیں آتا اور یقیناً اِسی معنی میں کبھی امام نے فرمایا تھا کہ ''تم کہتے ہو کہ ہم نے امام کو خواب میں دیکھا تو میں کسی کے خواب میں نہیں آتا ہوں'' [راجکوٹ، ۲۰/ ۲/ ۱۹۱۰] اور نہیں معلوم جاننے والوں نے اور سننے والوں نے کس طرح سے اِس کو سمجھا۔ میں تو ایک اسماعیلی کی حیثیت سے ایک تجربہ کار اسماعیلی کی حیثیت سے یقین رکھتا ہوں کہ امامؑ نے اِسی معنی میں فرمایا تھا۔ آپ میں سے اگر کوئی خواب میں امامؑ کو دیکھتا ہے تو وہ اپنی رُوح کو دیکھتا ہے، رُوح میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ امامؑ کا روپ دھارے۔ اِسی لیے میں نے کہا کہ رُوح کی شکلیں بہت زیادہ ہیں، رُوح کی صورتیں بہت زیادہ ہیں۔ اسی لئے میں نے کہا تھا نا شروع میں کہ خدا نے جو رُوح پیدا کی ہے وہ بہت ہی عجیب پیدا کی ہے، خدا کی سب قدرتیں، سب معجزات رُوح میں ختم ہیں۔

رُوح سے باہر خدا کی کوئی کاریگری نہیں ہے، جتنا ہنر ہے، ہنر تو نہیں کہنا چاہیے لیکن میں نے ایک آسان لفظ (Use) کیا، جتنی کاریگری ہے، جتنی قدرت ہے، جتنا کمال ہے، جتنے معجزات ہیں اور جس قدر خوبیوں کا امکان ہے وہ سب کچھ رُوح میں ہے۔ رُوح کو اِس طرح خدا نے سجایا ہے اور رُوح کا کیا کہنا، رُوح ایک طرف رکھیں، روح اِس قدر انمول ہے، رُوح اتنی قیمتی ہے رُوح دونوں جہاں سے بڑھ کر اِس لئے ہے کہ رُوح میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ خدا کے رُوپ میں نمودار ہو۔ میں نے سوال کیا تھا کہ رُوح کی شکلیں کیا کیا ہیں؟ یہ سب رُوح کی مثالیں اور شکلیں ہیں لیکن ایک شکل رُوح کی خصوصی ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص کی رُوح اُس کی ظاہری شکل کے مشابہ ہے۔ میری رُوح میری طرح کی ہے آپ میں سے ہر ایک کی رُوح اُس کی طرح کی ہے، ہماری شخصیت رُوح کے لباس کی حیثیت سے ہے اور رُوح شخص یعنی آدمی کی طرح ہے۔ یہ تن، یہ بدن، یہ ہماری ظاہریت رُوح کا لباس ہے، رُوح کے کُرتے کی حیثیت سے ہے اور رُوح لباس کے اندر

انسان کی طرح ہے اِس لئے رُوح کی خصوصی شکل یہ ہے کہ وہ ہماری اِس شکل جیسی ہے لیکن اِس سے بدرجہا بہتر اور عمدہ ہے۔

ایک مزیدار بات میں آپ سے یہ بھی کہوں کہ کل کو ہم جس رُوح میں زندہ ہو جائیں گے وہ ہماری رُوح ہو گی لیکن وہ رُوح ہماری اپنی شکل کی ہو گی ہماری اپنی شکلیں بھی کئی ہیں بچپن سے لے کر جوانی اور بُڑھاپے تک لیکن رُوحانیت کی بہشت میں جب ہم زندہ ہو جائیں گے جب ہماری زندگی عالمِ رُوحانیت میں منتقل ہو جائے گی تو اُس وقت ہماری اپنی شکل چودہ، پندرہ سال کی عمر کی شکل ہو گی۔لیکن اُس میں لطافت اور پاکیزگی بہت بہتر اور بہت ہی نمایاں ہو گی، چونکہ ہم اُس وقت گوشت پوست کے نہیں ہوں گے بلکہ نور کے ہوں گے۔جب نور کے ہوں گے تو اُس وقت بندۂ مومن کے چہرے کے نور کا کیا کہنا اور اُس کے حسنُ و جمال کا کیا کہنا، یہ رُوح ہے اور یہ رُوح کے احوال ہیں۔ایک بات یہ بھی کہوں کہ ہم یہ بھی کہہ سکتے ہیں رُوح کی جس شکل کا میں نے آخر میں ذکر کیا اور کہا کہ چودہ پندرہ سال کی عمر میں جو ہماری شکل تھی، اُسی کے نمونے کے مطابق ہم ہزار درجہ بہتر اور خوب تر ہماری رُوح ہو گی، ہماری رُوحانی شکل ہو گی۔یہ جو میں نے کہا اِس طرف سے [یعنی] دُنیا کی طرف لوٹ جانے کی بات ہوئی اور اگر سوچا جائے تو یہی شکل ازل میں ہماری تھی جبکہ ہم دُنیا میں نہیں آئے تھے تو یہی شکل تھی۔یعنی ہماری ایک مقرّر شکل عالمِ رُوحانیت میں تھی اور [جو] پہلے سے موجود تھی، اُسی شکل کے مطابق ہمارا جسم اور ظاہری شکل بنی تھی۔جب ہم لوٹ کے واپس جائینگے تو ہماری اصلی شکل جو پہلے سے تھی، اُسی کو ہم قبول کریں گے، اُسی کو اپنائیں گے [اور] اُسی میں ہم زندہ ہو جائیں گے۔

دُوسری بات جو یہاں بتلانی چاہیے وہ یہ کہ خدا نے فرمایا کہ: خَلَقَ اللّٰہُ تَعَالٰی اٰدَمَ علٰی صُوْرَۃِ الرَّحْمٰن۔ترجمہ: اللہ تعالیٰ نے آدم کو اپنی رحمانیت کی شکل پر پیدا کیا۔تو انسانی شکل رحمان کی شکل ہے، جب انسانی شکل رحمان یعنی خدا کی شکل ہے تو آپ اندازہ کریں کہ رحمان کی شکل کیسی ہو گی۔ یہاں پر مثال صاف اور (Clear) ہو گئی کہ انسان کی رُوحانی شکل خدا کی شکل کی طرح حسین و جمیل ہے اور اِس سے پہلے بھی میں نے ایک طرح سے یہ کہا تھا کہ انسان کی رُوح میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ خدا کے رُوپ کو دھارے، اُس معنی میں بھی میں نے یہی بات کہی تھی۔اب دُوسرے معنی میں بھی یہی کہتا ہوں اِس سے بات صاف ہو گئی کہ انسان کی رُوحانی صورت کہاں تک نورانی ہو سکتی ہے، یہاں تک کہ وہ خدا کے چہرے کا کردار ادا کرے، اور جب مومن امامؑ کے دیدار کو حاصل کرے گا تو اُس میں بھی اپنے آپ کو دیکھے گا، اپنے آپ کی شکل میں [خدا کو] دیکھے گا۔یہ رُوحانیت کی باتیں ہیں اور چونکہ رُوحانیت کی باتیں بہت زیادہ ہیں اِس واسطے نہ معلوم ہم رُوحانیت کے کس رستے سے چلتے ہوئے، کیسی کیسی باتیں کرنا چاہتے تھے۔لیکن چونکہ رُوحانیت ایک وسیع سمندر ہے اِس لئے نہ معلوم ہم نے کیسی کیسی باتیں کہیں۔تو بہر حال میں سمجھتا ہوں کہ یہ سب باتیں رُوحانیت کی ہیں اور مجھے یقین ہے کہ یہ سب باتیں ضروری ہیں۔

[ایک مثال میں] بعض رُوح بلندی پر ہے، اُس میں زیادہ بارش برستی ہے کیونکہ بادلوں کی بلندی سے مناسبت ہوتی ہے یا کہ بادل بلندی کو چھوتے ہیں اور پہاڑوں پر بہت زیادہ بارش برستی ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ: [وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ (۲:۲۶۵) جولوگ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے اور اپنے نفوس کی ترقّی کے لئے اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں اُن کے خرچے کی مثال ایک ایسے باغ کی طرح ہے جو کسی بلندی پر واقع ہے۔ تو جو باغ بلندی پر ہو اُس پر بار بار بارش برستی ہے اور اُس بارش کے برسنے سے وہ باغ ہرا بھرا رہتا ہے اور اگر کسی سال بارش نہ بھی برسے تو وہاں شبنم بھی پڑتی ہے، بہت پڑتی ہے، فَاٰتَتْ اُكُلَهَا ضِعْفَيْنِ (۲:۲۶۵) تو ایسے باغ میں بہت زیادہ پھل لگتا ہے، اُس باغ کے درخت بہت زیادہ پھل دیتے ہیں۔ اب اِس میں یہ حکمت ہے کہ جو مومنین راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں اور خرچ تین طرح سے ہے، مالی قوت کا خرچ کرنا، ذہنی یعنی دماغی قوت کو خرچ کرنا اور جسمانی قوت کو خرچ کرنا۔ قومی کاموں کے لئے، جماعتی کاموں کے لئے اِن تین قسم کی طاقتوں کے اخراجات کی ضرورت پیش آتی ہے، یعنی کوئی بھی مومن یا تو مال سے خرچ کرتا ہے یا ذہن سے، دماغ سے خرچ کرتا ہے یا اپنی جسمانی (Energy) یعنی قوت کو خرچ کرتا ہے۔ ہاتھ سے کام کرتا ہے، محنت مزدوری کرتا ہے، جماعتی اور قومی کاموں میں حصّہ لیتا ہے، خدمت کرتا ہے اِن تین چیزوں کو مجموعی طور پر خدمت کہا جاتا ہے۔ گو کہ بظاہر یہاں صرف مال کے اخراجات، مال کے خرچ کرنے کا ذکر ہے لیکن اِس کے پس منظر میں دماغی قوت کے خرچ کرنے کا بھی ذکر ہے اور دماغی قوت کے خرچ کرنے کی بھی کئی قسمیں ہیں مثلاً آپ کسی دفتر میں کام کرتے ہیں میٹنگ کرتے ہیں، قلمی کام کرتے ہیں، علمی کام کرتے ہیں، (Teaching) کا کام کرتے ہیں، (Preaching) کا کام کرتے ہیں۔ اِن تمام کاموں میں ذہنی خرچ ہے دماغی خرچ ہے، تو دماغ ایک سرچشمہ ہے، دماغ ایک خزانہ ہے وہ لاانتہا خزانہ ہے جسے آپ خرچ کرتے ہیں، یہ بھی مال کے خرچ کرنے کی طرح ہے۔ اسی طرح مال کے خرچ کرنے کا جو قصّہ ہے وہ تو زیادہ نمایاں ہے، وہ تو زیادہ ظاہر ہے اُس کی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے سب جانتے ہیں کہ مال کس طرح خرچ کیا جاتا ہے اور مال کو خرچ کر کے قوم کو، جماعت کو کس طرح فائدہ دلایا جاتا ہے یہ تو ظاہر بات ہے۔ اِس کے بعد جسم بھی ایک خزانہ ہے جسے جلا کر کام کر کے [ہم] اپنی ملّت کو، قوم کو فائدہ دلانا چاہتے ہیں یہ بھی اخراجات میں سے ہے (Energy) کو، قوت کو خرچ کر کے آپ چلتے ہیں، پھرتے ہیں، کام کرتے ہیں اپنی حیثیت کے مطابق، موقع کے مطابق۔ تو اِن تین قسم کے اخراجات کے متعلّق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: اُس کی مثال ایک باغ کی طرح ہے اور وہ باغ بھی کسی گرم علاقے کا باغ نہیں، کسی بلندی پر واقع باغ ہے جہاں پر کہ خوب بارش برستی ہے اور بارش اگر نہ بھی برسے تو وہاں پر شبنم پڑتی ہے جس سے کہ وہ باغ ہر وقت سرسبز و شاداب رہتا ہے (۲:۲۶۵)۔

اب اِس باغ کی تاویل کیا ہے؟ باغِ رُوحانیت ہے۔ ہمارے باطن کے اندر جو رُوح ہے اُس کی مثال ایک باغ سے دی گئی ہے، رُوح کی آبادی کی مثال باغ کی آبادی سے دی گئی ہے اور رُوح کی آبادی دو طرح سے ہوتی ہے۔ ایک اُس میں نمایاں رُوحانیت ہے، جس کو ہمارے عزیز جانتے ہیں کہ نمایاں رُوحانیت کا کیا مطلب ہے؟ ایسی رُوحانیت جو ہمارے پیروں پر گزری، اُس میں انقلابات تھے، اُس میں اُس بارش کی طرح جو آسمان کے اُن بھرے ہوئے بادلوں سے برستی ہے اور اُن بادلوں میں کبھی بجلی چمکتی ہے، کبھی کڑک کی آواز آتی ہے اور کبھی زوروں سے بارش برستی ہے۔ دیکھتے ہیں کہ بادل آگئے ہیں اور کالی کالی گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں تو یہ سب بارش کی علامت ہے اور بارش بھی برستی ہے اور خوب برستی ہے، طوفان برپا ہو جاتا ہے۔ ایک رُوحانیت ایسی ہے جیسے دُنیا کی آبادی ہے اور اُس میں طوفان بھی ہے۔ لیکن دُوسری رُوحانیت وہ ہے جو شبنم کی طرح ہے، شبنم رات کو پڑتی ہے، کسی کو پتا نہیں چلتا ہے، اُس میں کوئی آواز نہیں ہے، اُس میں کوئی نام ونمود کی چیز نہیں ہے۔ لیکن جب صبح اُٹھیں اور کھیتوں میں جائیں اور باغ میں جائیں تو صرف بس پانی ہی پانی ہوتا ہے اور فصل سیراب ہو جاتی ہے، باغ سیراب ہو جاتا ہے، درخت کے پتّے دُھل جاتے ہیں، پھولوں کی پنکھڑیاں دُھل جاتی ہیں شبنم کی وجہ سے یہاں تک کہ پتّوں سے پانی ٹپکتا ہے اور موتیوں کی طرح شبنم کے قطرے جھلکنے لگتے ہیں، یہ شبنم کی برکت ہے۔ تو اِس سے مومنین کی وہ رُوحانیت مراد ہے جس میں نہ تو کوئی غوغا ہے اور نہ تو کوئی آواز، نہ کوئی انقلاب ہے اور نہ کوئی ایسی اُس میں نمایاں کیفیت ہے لیکن اندر ہی اندر سے اُس کی آبادی ہوتی چلی جاتی ہے۔

بارش برسے اور بجلی کا منظر دیکھیں، کڑک کی آواز سنیں، اچھا ہے، بارش کا منظر بہت خوب ہوتا ہے، بڑا تماشا ہوتا ہے جب بارش برستی ہے۔ یعنی جب نمایاں طور پر رُوحانیت کا طوفان برپا ہو جاتا ہے تو بڑا عجیب وغریب تماشا بن جاتا ہے اور اُس میں سب باتیں آتی ہیں جو پیغمبروں پر اور اولیاء اللہ پر واقعات گزرتے ہیں وہی سامنے ہوتے ہیں، یہ رُوحانیت اُس زوروں کی بارش کی طرح ہے۔ یہ نہ ہو تو پھر وہ رُوحانیت ضرور چاہیے جو شبنم کی طرح ہے، پوشیدہ ہے (Secret) ہے۔ اِس سے یقین آتا ہے کہ جو خدمت کرتے ہیں یعنی جو راہِ مولا میں صرف کرتے ہیں، مالی قربانی پیش کرتے ہیں، اُن کی آبادی، رُوحانی آبادی ضرور ہوتی رہتی ہے۔ یہ قرآن کا فیصلہ ہے، یہ قرآن کا حکم ہے۔ تو ہم یہ چاہتے ہیں کہ کبھی کبھار قرآن کی حکمتیں اور اُس کی تاویلیں بیان کی جائیں۔ چونکہ قرآن دُنیا میں اگر نازل ہوا ہے تو اُس کا کوئی مقصد ہے اور اُس کا مقصد وہاں پر پورا ہو جاتا ہے جہاں پر کہ قرآن کے ظاہر کو بھی اور باطن کو بھی سمجھ لیا جاتا ہے۔

ہمارا دعویٰ ہے کہ یہ ایک طرح سے قرآن کے ظاہر کا اور باطن کا سمجھنا ہے اور دُوسرے لوگ بس آپ کے سامنے یہ آیت پڑھیں گے اور اُس کی تشریح کریں گے۔ وہ تو ایک ہی پہلو سے بیان کریں گے، صرف مال کے اخراجات کی بات کریں گے تو پھر وہ (Energy) کی بات نہیں کریں گے، ذہنی دولت کے خرچ کرنے کی بات نہیں کریں گے،

جسمانی طاقت کے خرچ کرنے کی بات نہیں کریں گے اور پھر رُوحانیت کی بات بھی نہیں کریں گے آپ کو یعنی محدود بات بتائیں گے۔ قرآن جیسی کامل اور مکمل آسمانی کتاب کو محدود کرنا اور اُس کی حکمتوں کو نہ سمجھنا، یہ اِس حق کی غیر ادائیگی ہے یعنی اِس کا جو حق ہے وہ ادا نہیں کر سکتے ہیں۔ تو ہمیں شکر گزار ہونا چاہیے اپنے خداوند اور اپنے پیروں کے لئے جنہوں نے ہم کو یہ راستہ بتلایا اور ہم کو یہ طریقہ بتایا کہ ہم قرآن کے باطن میں جائیں اور اُس کی حکمتوں کو سمجھیں اور اُس کی تاویلات کو چھوئیں اور اپنے اعمال پر بھی نظر رکھیں کہ دُنیا میں اگر ہم سے تھوڑی بہت خدمت ہوتی ہے تو یہ بھی ایک نعمت ہے کہ ہم اپنی خدمت کے صلے کو اور اُس کے اجر کو سمجھتے ہیں۔ اِس سے ہماری اُمید میں اور اضافہ ہو جاتا ہے اور ہمارا یقین محکم ہو جاتا ہے۔ ہمیں اپنی خدمت اچھی لگتی ہے، ہم گمان سے کام نہیں کرتے ہیں، اُمید سے اور یقین سے کام کرتے ہیں۔

جانور کام کرتے ہیں، اُن سے بھی کام لیا جاتا ہے لیکن اُن کو علم نہیں ہے اِس لئے اُن کو اِس کام کے اجر کی توقع نہیں ہے۔ تو دُنیا میں جو عمل ہو وہ علم کے ساتھ ہو، جانتے ہوئے ہو تا کہ اِس کا اجر وصلہ آپ کو ملے۔ پیر ناصر خسروؒ کی [کتاب] وجہ دین کو آپ اِس سرے سے لے کر اُس سرے تک پڑھیں، اُس میں علم و عمل کی تعریف ہے، اُس میں تاویل کی تعریف ہے، اُس میں بہت سی باتوں کی تاویل بتلائی گئی ہے۔ یہ کتاب ایسی شاندار ہے کہ اِس میں بہت سی حکمتیں اور بہت سی حقیقتیں بیان کی گئی ہیں۔ رشیا سے جو پروفیسر آیا تھا، اُس سے جب انٹرویو لیا گیا تو اُس نے اسلام میں سے اسماعیلی مذہب کی تعریف کی اور پیر ناصر خسروؒ کی کتابوں کی تعریف کرتے ہوئے اُس نے کہا کہ وجہ دین کتاب جو ہے وہ بہت ہی بے مثال ہے، اُس کے اندر جو گہری حقیقتیں بیان کی گئی ہیں، وہ اسلام کی کسی کتاب میں بیان نہیں کی گئی ہیں۔ وہ آج الحمدُللہ! ہمارے سامنے ہے، جس پر آپ کے عزیز اُستاد نے کام کیا ہے تو آپ کے لئے وہ رستہ آسان بنا دیا گیا ہے۔ آپ اُس میں سے فائدہ اُٹھائیں تا کہ آپ کو خوشی ہو کہ آپ کا نظریہ کیا ہے، آپ کا طریقہ کیا ہے۔ سمجھ کر [کام] کریں، جانتے بوجھتے ہوئے کریں، تو اِس میں زیادہ فائدہ ہے۔ میرے خیال میں مجھے صرف اتنی سی باتیں کرنی چاہیں اور یہی دانشمندوں کے لئے یہی اشارے، یہی باتیں بہت کچھ ہیں۔ مہربانی یا علی مدد۔

ٹرانسکرائب: سیما عظیم ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: عالمِ خواب اور خواب کا ردِعمل

کیسٹ نمبر: ۲۶ تاریخ: ۱۹۷۸/۱۱/۲۴، کراچی

Click here for Audio

عالمِ خواب ایک دُنیا ہے، خوابوں کی دُنیا وہ ایک دُنیا ہے، وہ ایک کائنات ہے۔ جس کا مطالعہ یعنی خوابوں کی دُنیا کی (Study) اور ریسرچ بہت ضروری ہے۔ اِس کام کے ضروری ہونے کی کئی وجوہ ہیں، کئی دلیلیں ہیں کہ ہم اِس موضوع کی طرف کیوں توجہ دیں۔ سب سے پہلی اہمیت اِس کی یہ ہے کہ انبیاء علیہم السّلام کی رُوحانیت اور وحی و الہام کا ایک اہم حصّہ اُن کے خواب سے متعلّق ہے۔ اُن کی تعلیم، اُن کی رُوحانیت، اُن کے تجربات، اُن کے معجزات کا ایک گرانقدر حصّہ خواب سے متعلّق ہے، یعنی اُن کے خواب کے اندر بہت سے واقعات گزرتے ہیں، جن میں علم ہے، رُوحانیت ہے اور نُور ہے۔ لہٰذا چونکہ مومن اُسی رستے پر چل رہا ہے جو رستہ انبیاء و اولیاء علیہم السّلام کا ہے، جس کا نام صراطِ مستقیم ہے، تو اِس لئے کامیاب مومنین پر بھی اُن کی حیثیت اور کوشش کے مطابق وہی باتیں گزرتی ہیں جو انبیاء و أئمہ علیہم السّلام پر گزرتی ہیں اِس لئے ضرورت ہے اِس بات کی کہ ہم خوابوں کے بارے میں کچھ تحقیق کریں، کچھ ریسرچ کریں۔ اِس لئے کہ ایک مومن جب راہِ رُوحانیت میں آگے بڑھتا چلا جاتا ہے تو سب سے پہلے اُس کی عبادت اور خصوصی ذکر کے نتائج، سب سے پہلے خواب میں سامنے آتے ہیں۔

اِس کے علاوہ ایک مومن جو ذکر و عبادت میں کمزور ہوتا ہے، جس پر بیداری میں معجزات کا گزرنا ذرا مشکل ہو جاتا ہے تو اُس مومن کو بھی بہت سے معجزات خواب میں سامنے آتے ہیں، یہ اِس لئے کہ خواب محض جسمانی سکون اور جسم کی مرمّت کے لئے نہیں ہے، بلکہ خواب میں رُوحانیت اور رُوح سے متعلّق بھی بہت سی چیزیں رکھی ہوئی ہیں۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ خواب ایک جیتی جاگتی کتاب ہے، رُوحانیت کی کتاب، ایک بول کی کتاب اور خواب کی اہمیت اِس واقعہ سے بھی ظاہر ہے کہ ایک انسان کی عمر بھر کے خواب کو دیکھا جائے تو وہ عمر کا ایک حصّہ ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص روزانہ چھ گھنٹے کی نیند کرتا ہے، یعنی چھ گھنٹے سوتا ہے کم سے کم تو ساٹھ برس یا اسّی برس کی عمر میں اِس کے چھ گھنٹوں کا میزان کیا بنے گا؟ کیا (Total) بنے گا؟ عمر کا ایک بہت بڑا حصّہ! اِس سے ظاہر ہے کہ خدا نے عمر کے اتنے بڑے حصّے کو فضول نہیں رکھا ہے، یعنی وہ علم و حکمت کے بغیر نہیں ہے، اُس میں بہت سے اشارے ہیں، اُس میں بہت سی علم کی باتیں ہیں، بلکہ کہنا چاہیے کہ اُس میں بہت سے

اسرار ہیں، بھید ہیں اور خواب کا سب سے بڑا بھید یہ ہے کہ وہ رُوحانیت اور عالم آخرت کا نمونہ ہے، گو کہ عالمِ آخرت کے برابر خواب اتنا روشن نہیں ہے جتنا کہ ہونا چاہیے لیکن اہمیت کے لحاظ سے وہ بڑا اہم ہے اور بڑا ضروری ہے اور جہاں روشنی کی بات یا روشنی کا سوال ہوتا ہے، اُس میں بھی خواب کے اندر یہ گنجائش ہے کہ اُس میں ترقّی ہو. بہت زیادہ ترقّی ہو، یہاں تک کہ کسی کے خواب، عالمِ بیداری کی باتوں سے بڑھ کر ہوں یہ بہت ممکن ہے۔ یا یوں کہنا چاہیے کہ ایک عام انسان کے خواب اور ایک پیغمبر اور امام یا ولی یا بزرگ کے خواب میں بڑا فرق ہے۔ اِس فرق کا ثبوت ہم اِس طرح سے بھی پیش کر سکتے ہیں کہ ایک انسان مختلف حالات میں اور مختلف اوقات میں مختلف خوابوں کو دیکھتا ہے، یعنی کبھی وہ خواب میں روشنی دیکھتا ہے اور کبھی تاریکی، کبھی وہ تکلیف اُٹھاتا ہے اور کبھی راحت پاتا ہے۔ اِس سے معلوم ہوا کہ عالمِ خواب کے اندر بہت سی ترقّی کی گنجائش ہے اور یہ ترقّی کسی اور چیز سے نہیں بلکہ اخلاق، عبادات اور اعمال سے اِس کی ترقّی ہو سکتی ہے، اِس میں صفائی اور روشنی پیدا ہو سکتی ہے۔

آپ قرآن کے فلسفے میں خواب کے موضوع کو دیکھیں گے تو پتا چلے گا کہ خواب [کا] ایک بہت اہم مقام ہے اشارے کے لحاظ سے، ہدایت کے لحاظ سے اور وحی و الہام کے لحاظ سے۔ سب سے پہلے آپ حضرت ابراہیمؑ کی مثال کو سامنے رکھیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کو اپنے عزیز بیٹے کی قربانی کا جو حکم دیا گیا تھا وہ خواب میں تھا (۳۷:۱۰۱۔۱۰۷) دیکھا آپ نے کہ عظیم انبیاء کے خواب کس قدر اُستوار اور سچّے ہوتے ہیں اور وہ حضرات اپنے خواب پر کس حد تک بھروسہ کرتے ہیں۔ خواب کی بناء پر اپنے عزیز بیٹے کی قربانی کے لئے تیار ہو جانا، اور عملاً قربانی کرنے کے لئے چلے جانا اور عزیز بیٹے کے گلے پر چُھری پھیرنا! یہ حُکم محض خواب کے اندر دیا گیا تھا۔ اگر خواب کی کچھ اہمیت نہ ہوتی اور خواب انبیا علیہم السّلام کی نظر میں قابلِ اعتبار نہ ہوتا یا کہ خواب میں وحی نہ ہوتی، خواب میں حکم نہ دیا جاتا تو حضرت ابراہیم علیہ السّلام نے قربانی کے لئے تہیہ کیوں کیا؟ ایک دانشمند مومن اور ایک ذی شعور انسان خواب کے سلسلے میں یہاں سے بہت کچھ مطلب حاصل کر سکتا ہے۔

دوسری چیز قرآن ہی کی بات ہے یہ کہیں دُور کی نہیں، حضرت یوسف علیہ السّلام نے جو کچھ بشارت حاصل کی تھی یا جو کچھ بشارت حضرت یوسف علیہ السّلام کو مستقبل کے سلسلے میں دی گئی تھی وہ خواب میں تھی، سورۂ یوسف کے آغاز میں دیکھیں کہ انہوں نے خواب ہی میں دیکھا تھا کہ گیارہ ستارے سورج اور چاند اُن کے لئے سجدہ کر رہے تھے (۱۲:۴)۔ جب انہوں نے اپنے والدِ محترم سے اِس کا ذکر کیا تو والدِ بزرگوار نے فرمایا کہ: یہ خواب آپ کسی سے بیان نہ کریں، کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو نوازنا چاہتا ہے اور اپنے آباؤاجداد میں جو مرتبہ چلا آیا ہے یعنی نبوّت اور امامت اُس سے آپ کو سرفراز فرمانا چاہتا ہے (۱۲:۵۔۶)۔ تو اِس کے لئے آپ اپنے بھائیوں سے اِس کا ذکر نہیں کرنا نہیں تو وہ حسد میں آئینگے اور شیطان کو موقع ملے گا پھر آپکے اور آپکے بھائیوں کے درمیان عداوت و دشمنی پڑے گی۔ یہیں سے ہم کو ہدایت ملتی ہے کہ جو اچھے اچھے خواب ہیں، معجزانہ خواب یا رُوحانیت کے نتائج، اُن کو ظاہر نہیں کرنا ہے اور بڑے کام کے سلسلے میں جو فرمایا جاتا ہے کہ

اِس ذکر و عبادت کے نتیجے پر تمہارے سامنے جو معجزات آئیں گے اُن کا ذکر کسی سے نہیں کرنا امام ہی فرماتے ہیں تو یہ قرآن کی بات ہے اور یہ وہی بات ہے جو حضرت یعقوبؑ نے اپنے فرزندِ جگر بند یوسفؑ سے فرمایا تھا، اُس وقت جبکہ وہ اپنے نورانی خواب کا کوئی نتیجہ بیان کر رہا تھا۔ اِس سے ایک طرف سے خواب کہ اہمیت کا پتا چلتا ہے، دُوسری طرف سے جو نورانی خواب ہوتے ہیں اُن کو محدود رکھنے کا اشارہ ملتا ہے۔

ایک سوال ایسا بھی کریں گے کہ پیغمبر اور ائمہ تو خدا کے برگزیدہ افراد ہیں کیا کافر اور دُوسرے لوگ بھی کوئی ایسے اہم خواب دیکھتے ہیں یا نہیں؟ ہم ایک ایسا سوال بنائیں گے۔ اُس کے لئے قرآن ہم کو جواب دیتا ہے کہ ہاں! بعض وقت کافر لوگ بھی خدا کی مصلحت سے کچھ ضروری خواب دیکھتے ہیں۔ اِس کا پتا ہم کو حضرت یوسفؑ کے زمانے سے ملتا ہے کہ جس زمانے میں حضرت یوسفؑ قید خانے میں پڑے تھے اُس زمانے میں وہاں کا جو بادشاہ تھا اُس نے ایک خواب دیکھا تھا اور جس کی تعبیر یا تاویل کوئی نہیں بتا سکتا تھا لیکن مختصر یہ کہ اِس کی تاویل و تعبیر حضرت یوسف علیہ السّلام نے بادشاہ کو اور بادشاہ کے معزز لوگوں کو بتائی، جس کے وسیلے سے انہوں نے جو ایک قحط آنے والا تھا اُس کے سدِّ باب کے لئے اسکیم بنائی اور اُس خواب کے اندر اِس کی ہدایت کی گئی تھی اور وہ ہدایت تاویل سے تعبیر سے واضح ہوتی تھی۔ یعنی بادشاہ نے یہ خواب دیکھا تھا کہ اُس کے سامنے سات موٹی گائیں پیدا ہوئیں اور سات دُبلی گائیں پیدا ہوئیں پھر اِن سات دُبلی گائیوں نے اُن سات موٹی گائیوں کو ہڑپ کر لیا، کھا لیا، پھر بادشاہ نے یہ بھی دیکھا کہ سات بالیاں تھیں گندم جَو وغیرہ کی جو ہری تھیں اور کچھ سات بالیاں خشک تھیں (۱۲: ۴۳)۔ بادشاہ نے جیسے ہی یہ خواب دیکھا تو اُس کے دل میں یہ بات چبھ گئی اور قدرتی طور پر اُس کو احساس ہوا کہ یقیناً اِس کے اندر کچھ معنی ہیں، پھر بادشاہ نے اپنے وزیروں سے، امیروں سے، حکماء سے، علماء سے اِس کا ذکر کیا اور اُس نے چاہا کہ کوئی دانشور، کوئی حکیم اُس کے خواب کی تعبیر و تاویل بتائے، لیکن کوئی نہیں بتا سکتا تھا۔ یہاں پر ہم کو اِس بات کا بھی علم ہوتا ہے کہ خواب کے اندر سے جو حکمتیں اور تاویلیں حاصل کرنا ہے وہ تو رحمتِ خداوندی کی بدولت ممکن ہے اِس کے بغیر کوئی دنیوی علم خواب کی حقیقتوں کو پا نہیں سکتا اور ایسا کوئی قاعدہ اور کلیّہ نہیں جس کے تحت خواب کی تعبیر کی جا سکے۔ اِس کے لئے جو کلیّہ جو قاعدہ ہے وہ خدا کے ہاتھ میں ہے، خدا کے اختیار میں ہے اور اِس کا ثبوت اِس واقعہ سے ملتا ہے کہ خدا نے سورۂ یوسف کے اندر ارشاد فرمایا ہے کہ: ''اُسی نے یوسف کو خواب کی تاویل سکھائی تھی'' (۱۲: ۶، ۲۱، ۴۴، ۱۰۱) چنانچہ مختصراً میں بتاتا ہوں، قصّہ ذرا طول وطویل ہے، تو حضرت یوسفؑ نے جو قید خانے میں تھے اُن کو بتایا کہ سات سال فراوانی کے آئیں گے جس میں بہت کچھ فصل اور پھل حاصل کیا جا سکے گا اور اُن کے بعد سات سال قحط پڑے گا جس میں جو کچھ آپ اگلے سات سالوں سے بچا کر رکھیں گے اُسی پر آپ کو گزارا کرنا ہوگا اور انہوں نے تجویز بتائی اسکیم کی کہ کس طرح سات برس تک غلّہ کو جمع رکھ سکتے ہیں۔ مطلب یہ کہ سات فراوانی کے سالوں کو گائے کے

رُوپ میں پیش کیا گیا تھا، یعنی موٹی گائے سے فراوان سالی مُراد تھی اور دُبلی گائے سے قحط کے سال مُراد تھے اور دُبلی گائیوں کا موٹی گائیوں کو کھانا اِس بات کا اشارہ تھا کہ سات سال جو کچھ جمع رکھا جائے گا اُس کو قحط کے سال کھائیں گے یا قحط والے سال جو ہیں اُس کو ختم کریں گے یہ اشارہ تھا اور یہ تاویل تھی۔

اِن اشاروں سے پتہ چلتا ہے کہ خواب کی بہت بڑی اہمیت ہے، آئیے! اُس کے بعد کسی دُوسرے مقام پر چلے جائیں کیونکہ ہم نے مختصر طور پر جائزہ لینا ہے۔ کئی ارشادات ہیں رسولِ اکرمؐ کے بارے میں قرآن کے اندر، ایک مقام پر ہے جو فرمایا جاتا ہے کہ: اے رسول آپ نے جو خواب میں دیکھا تھا وہ سچ ثابت ہوا (۴۸:۲۷)۔ اور اِس کے علاوہ بھی مومنین کے سلسلے میں بھی کچھ ارشادات ہیں، اُن سے پتا چلتا ہے کہ خواب ایک واقعی حقیقت ہے۔ آئیے! پھر اِن ارشادات کی روشنی میں مومن کے عالم خواب کی طرف رُجوع کریں اور وہاں سے کچھ مفید باتیں حاصل کرنے کے لئے کوشش کریں۔ تو یہ ہے کہ خواب ایک معیار ہے، خواب ایک میزان ہے، خواب ایک میٹر ہے۔ جس طرح کسی مشینری میں کوئی (Meter) لگتا ہے۔ اُس میٹر کے دیکھنے سے پتا چلتا ہے کہ مشین کے اندر فیول کا کیا حال ہے اور (Heat) کی کیا کیفیت ہے اور پانی کی (Quantity) کیا ہے اور دیگر ضروری اجزا اور مشین کی کیفیت یا (Speed) وغیرہ اِن تمام چیزوں کا اُس میٹر (Meter) کے ذریعے سے پتا چلتا ہے۔ اِسی طرح ہمارے اندر جو خواب ہیں اُس سے ہمارے اعمال کا پتا چلتا ہے۔ اِس طرح پتا چلتا ہے کہ جب مومن عبادت و بندگی میں مصروف ہوتا ہے اور اُس کے بیشتر اوقات نیکی اور نیکی کاری میں گزرتے ہیں تو نتیجہ کے طور پر اُس کو اچھے خواب آتے ہیں، نورانی خواب آتے ہیں، کوئی بُشارت ملتی ہے، کوئی خوشی ہوتی ہے، کوئی اچھی مجلس دیکھنے میں آتی ہے اور بعض دفعہ دیدار بھی ہوتا ہے۔ کبھی کبھار وہ آسمان کی بلندیوں میں پرواز کرتا ہے، کبھی کبھار زمین پر بیٹھے بٹھائے سورج کو دیکھتا ہے، اُس کی نظر بُلندی کی طرف جاتی ہے، آسمان کی طرف جاتی ہے، چاند کو دیکھتا ہے یا صاف وشفّاف آسمان کو دیکھتا ہے، کبھی وہ پہاڑ کی چوٹیوں پر خود کو پاتا ہے، کبھی وہ باغ وگلشن کی سیر کرتا ہے، کبھی وہ خود کو کسی عبادت کی محفل میں پاتا ہے، کبھی دُعا پڑھتا ہے، کبھی کسی سے بحث ومناظرہ بھی کرتا ہے، کبھی وہ علم کی باتیں سنتا ہے، کوئی اُس سے کچھ بات کرتا ہے، کوئی اُسکو کوئی اشارہ کرتا ہے، یہ علامات نیکی کے نتائج سے متعلّق ہیں یعنی جب اُس کے اعمال اچھے ہوں تو اُس کے نتیجے میں ایسے ایسے اچھے خواب آتے ہیں۔

اِس کے برعکس پھر کبھی کبھار وہی انسان کسی ایسے مکان میں بند ہو جاتا ہے، کبھی وہ کھنڈرات میں خود کو مبتلا پاتا ہے، کبھی وہ جانوروں، کتّوں مویشیوں کے درمیان خود کو پاتا ہے، کبھی وہ خود کو تاریکی میں مبتلا پاتا ہے، کبھی وہ کسی بُلندی سے گر بھی جاتا ہے، کبھی وہ بھاگنا چاہتا ہے لیکن اُس سے بھاگا نہیں جاتا، کبھی وہ خود کو بیمار بھی دیکھتا ہے، کبھی وہ ایسی محفل میں ہوتا ہے کہ اُس سے اِس کو خوشی نہیں ہوتی ہے۔ من جملہ خواب دو حصّوں میں منقسم ہیں، یعنی اچھے، نورانی خواب، جس

میں خوشی ہوتی ہے،علم کی باتیں ہوتی ہیں گویا اچھے اشارے ہوتے ہیں اور [دوسرے] بُرے خواب،تو چونکہ خواب ایک میٹر ہے جو انسان کی ہستی اور شخصیت کی مشینری میں لگا ہوا ہے،اُس کو دیکھ کر ایک باشعور انسان فائدہ اُٹھا سکتا ہے وہ سمجھ سکتا ہے کہ اُس میں کیا کمی ہے لیکن جو انسان صحیح معنوں میں انسان نہ ہو اور جو انسان ہوشیار نہ ہو اور جس کو علم نہ ہو،تعلیم نہ ہو وہ خواب سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا ہے،وہ ایک [ہی] طرح سے رہتا ہے،خوشی ہو تو بھی فرق نہیں ہے،تکلیف ہو تو بھی فرق نہیں ہے وہ ایک [ہی] طرح سے ہے۔لیکن جو حقیقی مومن ہے وہ سمجھتا ہے،جب اچھے خواب دیکھتا ہے تو وہ شکر گزار رہتا ہے اور بھی اچھے اعمال کے لئے کوشش کرتا ہے،جب بُرے خواب دیکھتا ہے تو جھٹ پٹ اُٹھ کر تسبیح پڑھتا ہے اور اپنے آپ کی اصلاح کے لئے کوشش کرتا ہے یہ اُس کی سعادت مندی ہے۔

ایک اور اہم بات خواب کے سلسلے میں یہ ہے کہ دانا مومن وہی ہے جو اپنی ذات کی طرف توجہ دے اور اپنے خواب سے دُوسروں کے لئے علاج،معالجہ،خوشخبری،پیشگوئی یہ کام نہ لے۔آپ نے ہم نے دُنیا کے اندر بہت سے لوگ دیکھے ہیں جو اپنے آپ کی تعمیر و اصلاح کے بغیر،اُس کو چھوڑ کر وہ دُوسروں کی تعمیر میں لگے ہوئے ہوتے ہیں۔کہتے ہیں کہ میں نے آپ کے بارے میں ایک اچھا خواب دیکھا ہے تو مبارک ہو،بعض دفعہ کہتے ہیں کہ میں نے ایک بُرا خواب دیکھا،تمہارے بارے میں دیکھا ہے تو اِس کے لئے دیکھو یہ کرنا،تمہارے بزرگوں میں سے کسی کو کپڑے کی ضرورت ہے جو دُنیا سے گزر چکا ہے یا کھانے کی ضرورت ہے وہ تم سے کھانا منگاتا ہے وغیرہ وغیرہ،یہ باتیں اچھی نہیں ہیں کیوں؟اِس لئے کہ خواب کے اندر جو تاویلات ہوتی ہیں یا جو اشارے ہوتے ہیں اُن کا سب سے پہلا تعلّق انسان کی اپنی ذات سے ہے۔مشین میں جو میٹر لگا ہوا ہے اُس کا تعلّق اُس مشینری سے ہے،دُوسری مشینری سے نہیں ہے اور دُوسری مشینری میں بھی اُس جیسا میٹر لگا ہوا ہے،چاہے وہ خراب ہے یا ٹھیک کام کرتا ہے لیکن میٹر ہے،اُس مشین میں بھی ہے۔تو ہر مشین میں ایک میٹر ہے بنانے والے نے،کاریگر نے کارخانے میں لگایا ہوا ہے۔

انسان دانا وہی ہے جو اپنی ذات کی اصلاح کے لئے کوشش کرتا ہے،میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ یعنی درجۂ کمال کے بعد بھی دُوسروں کی دستگیری نہ کی جائے،ضرور کی جائے وہ وقت الگ ہے۔آپ کو اُستاد بنایا گیا ہے تو بے شک آپ دُوسروں کی اُستادی کریں اور اُستاد کے سب اوصاف آپ میں آچکے ہیں۔لیکن اگر آپ کامل استاد نہیں ہیں،تو آپ طبیبی کا کام چھوڑیں۔پہلے آپ اپنے آپ کو ترقّی دیں،ڈاکٹری کرنی ہے تو پہلے آپ ڈاکٹری کی سند حاصل کریں،اِس کے بغیر آپ دُوسروں کے لئے نسخے کیوں بناتے ہیں؟یہ ایک مثال ہے۔تو کچھ لوگ ایسا کرتے ہیں کہ اپنے خوابوں سے دُوسروں کو خوشخبری وغیرہ دیتے ہیں،حالانکہ اُن کے خوابوں کا مقصد اُن کی اپنی ذات ہے۔تو اگر اپنے خواب کے اندر ہم کسی انسان کا مرنا دیکھتے ہیں مثال کے طور پر،تو اُس میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ہماری رُوح نے ایک شخص کے رُوپ کو دھار

لیااور ہماری رُوح عبادت کی کمی سے کسی اور انسان کی شکل میں مرگئی،ایسا بھی ہوتا ہے۔لیکن اِس سے ہم کیا سمجھتے ہیں،جبکہ سوچتے نہیں ہیں،تو ہم اِس سے کسی دُوسرے انسان کی موت کو مُراد لیتے ہیں، یہ بات نہیں ہے، یہ بات نہیں ہے۔اُس ایک خواب کے اندر بہت سی تاویلیں ہیں،کئی کئی تاویلیں ہیں۔اچھا! تو ہماری اِس گفتگو کا مقصد یہ ہے کہ مومن اپنے خواب کی کتاب سے جو ایک کتاب ہے، جو بولتی کتاب ہے،وہ علم کو حاصل کرے،وہ آگہی کو حاصل کرے،وہ اپنی اصلاح کرے،وہ اِس سے فائدہ اُٹھا کر ترقّی کرے اور کم سے کم یہ بات تو بہت ہی آسان ہے جو میں نے کہا کہ اگر اچھے خواب آتے ہیں تو وہ شکر گزار رہے کہ اُس کے نیک کام نتیجہ دے رہے ہیں،پھل دے رہے ہیں اور اگر بُرے خواب دیکھتا ہے تو سمجھ لے کہ اُس کی عبادت و بندگی میں کمی آئی ہے، پھر عبادت کرے،بندگی کرے دیکھے اُس کے اعمال میں سے کس عمل میں کمزوری ہے یہ دیکھے،خواب اِس مقصد کے لئے ہے۔

اِس کے علاوہ خواب لامکان ہے،لامکان! آپ نے ہم نے کتابوں میں لامکان کا ذکر سُنا ہے،لیکن کبھی ہم نے اِس کا تجزیہ نہیں کیا۔کوئی کتاب ایسی نہیں ہے کہ اُس کی مدد سے ہم کو لامکان کی کیفیت اور اُس کا اتا پتا بتائے۔لامکان ایک ایسی کیفیت جو کہ وہ (Space) نہیں ہے،ایک ایسی کیفیت جو (Spaceless) ہے۔وہ اُوپر نیچے، دائیں بائیں،آگے پیچھے، چھہ اطراف میں کہیں نہیں ہے،وہ لامکانی کیفیت میں ہے وہ مکان کے بغیر ہے،جسم کے بغیر ہے،مادّہ کے بغیر ہے۔تو جو لامکان ہے،اُس کا نمونہ عالمِ خواب ہے،جب ہم نے مانا کہ خواب لامکان ہے تو اِس خواب کے دیکھنے کے لئے ہماری رُوح کہیں بھی نہیں جاتی ہے،وہ اپنے آپ میں متوجہ ہوجاتی ہے،وہ اپنی ذات کی طرف مرکوز ہوجاتی ہے، چونکہ رُوح ایک لامکانی حقیقت ہے۔بہشت ہو یا آخرت یا رُوح یا خواب یہ سب لامکانی کیفیت میں ہے۔انسان عادی ہے ایسی باتوں کا کہ وہ لامکانی چیزوں کو بھی مکان کے طور پر سوچتا ہے،کیوں؟ انسان کا ماحول اور اُس کے سوچنے کا انداز بھی ایسا ہی رہا ہے۔جب کہا جاتا ہے لامکان تو اُس کے لئے مشکل ہوجاتا ہے کہ لامکان کیا ہے؟ جب کہا جاتا ہے کہ بہشت لامکانی ہے،تو اُس کے لئے مشکل ہوجاتا ہے کہ یعنی مکان کے بغیر کیسا چل سکتا ہے۔کوئی چیز،کوئی جگہ اُوپر یا نیچے،دائیں یا بائیں ہوسکتی ہے،نہیں! تو رُوح جب جسم کے تعلّق کو کم کرکے یا چھوڑ کر کے اپنی ذات کی طرف متوجہ ہوتی ہے تو اُس وقت یہ لامکانی کیفیت کو اختیار کرتی ہے۔تو خواب کی ایک اہمیت یہ ہے کہ ایسی حقیقتوں کو سمجھنے کے لئے وہ ایک (Example) ہے،وہ ایک نمونہ ہے،وہ مثال ہے۔

اگر کسی کو لامکان کے سلسلے میں سوچنا ہے تو وہ خواب کے بارے میں سوچے کہ عالمِ خواب لامکان کا نمونہ ہے۔ جب لامکان،لامکان ہے کہ اُس میں کوئی مکان نہیں ہے تو وہاں پر (Matter) نہیں ہے،مادّہ نہیں ہے،جب مادّہ نہیں ہے اور لامکان ہے تو لامکان ہونے کے ساتھ ساتھ وہ لازمان بھی ہے۔وہاں ماضی نہیں ہے،وہاں مستقبل نہیں ہے اور

وہاں یہ حال نہیں ہے جو اِس دُنیا میں ہے، لیکن وہاں دُوسرا حال ہے، یعنی (Present Time) تو اُس حال کے اندر ماضی بھی ہے اور مستقبل بھی ہے۔ عالمِ خواب کے اندر ماضی نہیں ہے، مستقبل نہیں ہے، حال کا نمونہ ہے اور وہ حال بھی دُنیا کے حال سے مختلف ہے وہ حال ایسا ہے کہ اُس حال کے اندر ماضی بھی ہے، مستقبل بھی ہے۔ اِس کا ثبوت [یہ ہے کہ] ہم آپ خواب دیکھتے ہیں، اُس میں ہمارا بچپنا آتا ہے، ہمارے وہ عزیز بھی آتے ہیں جو دُنیا سے اب گزر چکے ہیں، یہ ثبوت ہے، اِس بات کا کہ خواب کے اندر ماضی نہیں ہے اور ماضی ہم سے دُور نہیں ہے وہ ہمارے سامنے ہے [یعنی] حال ہے، ماضی اگر ہے تو حال کی صورت میں ہے اور اگر (Future) ہے، مستقبل ہے وہ بھی حال ہے۔ بعض دفعہ ہم مستقبل کو دیکھتے ہیں اور وہاں پر مکان نہیں ہے، لامکان ہے، اِس لئے ہر چیز کو اپنے سامنے دیکھتے ہیں اور کبھی دیکھنے کے لحاظ سے تھوڑا بہت چلتے ہیں اور کبھی چلتے نہیں ہیں، خود بخود چیز ہمارے سامنے آتی ہے۔ تو یہ خلاصہ ہوا کہ عالمِ خواب لامکان ہے عالمِ خواب لازمان ہے وہ (Spaceless) کیفیت ہے اور وہ (Timelessness) ہے۔ اور ایک اور اہم بات یہ کہ خواب ہماری دُوسری زندگی کے نمونہ کو پیش کرتا ہے، کس طرح؟ ہم جب سوتے ہیں تو یہ آنکھ بند ہوتی ہے پر ہم دُوسری آنکھ سے دیکھتے ہیں، اِس آنکھ سے نہیں دُوسری آنکھ سے دیکھتے ہیں اور کافی دیکھتے ہیں، واضح طور پر دیکھتے ہیں، بعض دفعہ بہت روشنی کے ساتھ دیکھتے ہیں، اُس وقت یہ ہماری آنکھ نہیں ہوتی ہے یہ تو سوئی ہوئی ہوتی ہے۔ ہم دُوسرے ہاتھ سے پکڑتے ہیں اِس جسمانی ہاتھ سے نہیں اور رُوحانی پہلو سے چلتے ہیں اور رُوح کی زبان سے بولتے ہیں اور رُوح کے کانوں سے سنتے ہیں۔ ہمارے یہ ظاہری حواس سوئے ہوئے ہوتے ہیں، خاموش ہوتے ہیں۔ اِس سے معلوم ہوا کہ جب ہم دُنیا سے گزر چکے ہونگے تو اُس وقت ہمارے اِس بدن کے نہ ہونے کے باوجود اِن اعضاء کے نہ ہونے کے باوجود ہم رُوح میں چلتے پھرتے، بولتے چالتے، اُٹھتے بیٹھتے ہونگے۔

رُوح ہی ایک طاقت ہے کہ وہی رُوح آنکھ ہے، وہی رُوح کان ہے، وہی زبان ہے، وہی ہاتھ پاؤں سب کچھ ہے۔ خدا کے متعلّق آپ نے سُنا ہے نا! خدا کے یہ آلے، یہ اوزار، یہ ہاتھ پاؤں نہیں ہیں، خدا ایک نور ہے، خدا ایک طاقت ہے، اُس طاقت میں سب کچھ ممکن ہے، بغیر آلے کے، بغیر اسباب کے، بغیر ذرائع کے اُس کے لئے سب کچھ ممکن ہے، تو رُوح چونکہ خدا کے نور کی روشنی ہے، خدا کے نور کا جُز ہے لہٰذا وہی رُوح سب کچھ ہے۔ اِس پاؤں کے بغیر وہ چلنے کا کام کر سکتی ہے، دیکھ سکتی ہے، خود ہی آنکھ ہے، خود ہی کان ہے، خود ہی زبان ہے، خود ہی ہاتھ پاؤں اور سب کچھ رُوح ہے۔ اِس کا نمونہ اور مثال ہم کو خواب میں ملتی ہے یہ دیکھنا ہے اور پھر خواب کی قسمیں! بہت بہت قسمیں ہیں وہ ایک (Degree) کی طرح ہے۔ کچھ خواب ایسے ہیں کہ بیداری کی طرح ہیں، جیسا کہ اولیاء کا خواب، اور غافلوں کا خواب، مومنوں کا خواب اور دُنیا میں جتنے جانور ہیں یا جتنی اقسام ہیں اُن میں بھی اختلاف ہے خواب کے لحاظ سے، اِس سے پتا چلتا ہے کہ [ہر] خواب ایک طرح کا نہیں ہے۔ گھوڑے کو آپ نے دیکھا چاروں [پیروں پر] کھڑا رہتا ہے اور بعض دفعہ اُسی طرح

کھڑا کھڑا سکون لیتا ہے۔ چمگادڑ کو آپ نے دیکھا! رات کو تو وہ اُڑتا رہتا ہے، دن کو کیا کرتا ہے کہیں کسی درخت میں یا کسی پرانے گھر میں یا جہاں پر آدمی کا گزر نہ ہو، پنجوں سے کسی چیز کو پکڑے رہتا ہے اور خود کو لٹکاتا ہے اور لٹک جاتا ہے۔ اِس سے میری مُراد یہ ہے کہ آپ اگر مانیں کہ چمگادڑ بھی سو جاتا ہے تو اگر وہ آدمی کی طرح سو جائے تو گر پڑے۔ اِس مثال کو اگر آپ نہیں لیتے ہیں تو ایک عام پرندے کو لیں کہ درخت کی کسی شاخ پر چھوٹی سی شاخ پر وہ بسیرا لیتا ہے اور سَر کو اپنے پروں کے درمیان لیتا ہے، وہ سوتا ہے، لیکن اِس طرح سے نہیں سوتا ہے جس طرح کہ انسان نرم اور گرم بستر پر خوابِ غفلت میں جاتا ہے، گہری نیند میں سوتا ہے، [وہ] ایسا نہیں سوتا ہے۔ پرندہ بالکل ہوشیاری کے ساتھ سوتا ہے، تو نیند کی جو غرض ہے اُس غرض کو پوری کرنے کے لئے وہ سکون کرتا ہے تاکہ اُس کے اندر جسم میں تکمیل ہو غذا ہضم ہو جائے اور (Energy) جو ہے وہ جزوِ بدن ہو جائے، وغیرہ اُس کے لئے سکون کی ضرورت ہے وہ کام بنتا رہتا ہے۔

حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا ہے کہ نیند کی ضرورت اِس لئے ہے کہ اُس میں جسم کا تھکان دُور ہو جائے اور خون سے گوشت بنے اور غذا سے خون بنے اور اُس کے لئے اگر چھ گھنٹوں کی ضرورت ہے تو ہی کام ایک گھنٹہ میں بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی ایک گھنٹہ کی نیند سے بھی وہی ضرورتیں پوری ہو سکتی ہیں جو بعض دفعہ چھ گھنٹوں میں بھی پوری نہیں ہوتی ہیں تو امامؑ نے یہ فرمایا اور ہم نے جانوروں کے اندر صورتِ حال یہ دیکھی کہ زیادہ کام کرنے والے جانور جو ہیں وہ انسان کی طرح نہیں سوتے ہیں۔ اِس سے مومن کا وہ خوف دُور ہو سکتا ہے جو اِس عنوان سے اُس میں ہے کہ ڈاکٹروں کے مشوروں کے مطابق وہ کہتے ہیں کہ یعنی چھ گھنٹے سات گھنٹے سونا چاہیے۔ ٹھیک ہے سونا چاہیے لیکن جب مومن میں معجزہ کام کرتا ہے اور معجزات کے مرحلے سے جب مومن گزرتا ہے تو اُس وقت نیند بھی محدود ہو جاتی ہے تو اُس کی اہمیت نہیں رہتی ہے، تو یہاں خواب کے ذکر کے ساتھ ساتھ نیند کی بھی بات ہو گئی اور جانوروں میں بہت سے جانور ایسے ہیں جن کی نیند بہت کم ہے یا نہیں ہے، آپ نے بہت سے جانور دیکھے ہیں، نیند کوئی رُوح کے لئے نہیں چاہیے جسم کے لئے چاہیے اور اگر جسم کے لئے چاہیے تو گھوڑا بہت زیادہ کام کرتا ہے، بیل بہت زیادہ کام کرتا ہے، لیکن وہ انسان کی طرح کہاں سوتا ہے، نہیں سوتا ہے۔ ایک بیل، ایک گدھا، ایک اُونٹ، ایک گھوڑا دن بھر بہت کام کرتا ہے، کہ رات کو آپ دیکھتے ہیں کہ وہ چاروں پیروں پر کھڑا ہے اور جُگالی کرنے والا جانور جو ہے وہ رات بھر جُگالی کرتا ہے وہ کہاں سوتا ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ یہ خدا کی قدرت کا کرشمہ ہے اور مومن کو باور کرنا ہے، نیند کم ہو تو ہو سکتی ہے۔ مومن میں یہ معجزہ ہے کہ وہ تھوڑا سوئے اور زیادہ کام کرے، لیکن مومن اپنے (Standard) سے گر جاتا ہے، ایک عام انسان کے (Level) پر اُترتا ہے تو وہ بات الگ ہے اور جب مومن بھرپور معجزات میں ہوتا ہے تو اُس کی نیند کہاں ہے اور اولیاء سوتے ہیں تو وہ کہاں سوتے ہیں اور اگر وہ سوتے ہیں تو ہماری طرح کہاں سوتے ہیں۔

پیغمبر نے فرمایا کہ: تنامُ عَینی ولاینامُ قلبی (کتاب العلاج ص:۳۳۹) میری آنکھ سوتی ہے لیکن دل نہیں سوتا ہے۔ امامؑ اگر سکون کرتے ہیں تو کرتے ہیں، لیکن وہ خوابِ غفلت میں تھوڑے پڑے رہتے ہیں۔ اچھا! یہ ہیں خواب کے عجائبات اور نیند کے واقعات، یہ تمام باتیں مومن کو جاننے کی ہیں، چونکہ معرفت کے سلسلے میں یہ باتیں بھی آتی ہیں۔ معرفت جب یعنی ہم اپنی شخصیت کی چیزوں کو، خواب کو، بیداری کو اور اُس کے اشاروں کو نہیں سمجھیں گے تو پھر اِن رُکاوٹوں کو اِس طرح چھوڑتے ہوئے ہم آگے کہاں جاسکیں گے۔ علمُ الیقین کا جب تک تجزیہ نہیں کریں تو عینُ الیقین کا دیکھنا مشکل ہے، اِن سے ہمارے وہ شکوک وشبہات دُور ہو جائینگے جو بعض دفعہ ہم کو نیند کے بارے میں شک ہوتا ہے یا جب ہم خود کو نہیں پہچانیں گے تو اولیاء اللہ کو کہاں پہچانیں گے؟ امام کو کہاں پہچانیں گے؟ یہ باتیں ایک طرح سے امامؑ کی شناخت کے لئے مدد کرسکتی ہیں اور دُوسری طرف سے ہم خود کو اِن باتوں سے پہچان سکتے ہیں اور خدا کے معجزات کو پہچان سکتے ہیں۔ یہ ہے اور خواب ایک دُنیا ہے اور جب اگر وہ ایک دُنیا ہے تو اِس کی اہمیت کو جاننا چاہیے اور اِس کی طرف توجہ دینی چاہیے اور جب آپ خواب میں ڈرتے ہیں تو اُٹھیں اور تسبیح پڑھیں، جب آپ خواب میں خوش ہوتے ہیں تو اُٹھیں شکر گزاری کریں اور جب آپ خواب میں تاریکی کو دیکھتے ہیں تو زیادہ عبادت کریں، جب زیادہ روشنی کو دیکھتے ہیں تو شکر گزاری سے کام لیں تو دونوں حالات میں عبادت اور شکر گزاری لازمی ہے اور رُوحانیت کا ایک حصّہ خواب سے وابستہ ہے، یہاں تک کہ بہت سی باتیں مومنین خواب میں سیکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ بعض کو خواب میں پڑھنے کے وظائف ملتے ہیں، بہت سی اچھی باتیں ہوتی ہیں، تو بہر حال آپ جب اچھے خواب دیکھیں گے تو اُن کا تذکرہ دوسروں سے نہیں کرنا نہیں تو وہ جو خاصیت ہے وہ چلی جائے گی اور جو معجزہ ہے وہ کمزور ہو جائے گا اور لوگ آپ سے حسد کرنے لگیں گے یا کہیں گے کہ یہ ایسا ہی کہتا ہے، وغیرہ۔ ہاں! ٹھیک کوئی خیر خواہ اُستاد ہو کوئی مشورہ ہو یا کچھ خاص حلقہ ہو اور اُس میں بیان کرنے سے نقصان نہیں ہوتا ہو تو یہ بات الگ ہے، اِس سلسلے میں اگر کوئی ضروری سوال ہو تو کیا جاسکتا ہے، سوالات کے لئے بھی گنجائش ہونی چاہیے۔

خواب سے متعلّق چند سوال اور اُن کے جوابات

سوال نمبر ۱: انہوں نے کہا کہ خواب ربط کے بغیر اور سلسلے کے بغیر ٹکڑوں میں اور بکھری ہوئی حالت میں بھی آتے ہیں، اِس کا رُوحانیت سے کس حد تک تعلّق ہے؟ انہوں نے یہ سوال کیا۔

جواب: تو جواب عرض ہے کہ یہ بھی ایک کمزوری کی علامت ہے، اِس کو خوابِ پریشان کہتے ہیں، پریشان فارسی میں بکھر جانے کو کہتے ہیں اور عربی میں، قرآن کی زبان میں بھی اِس کا ایک نام ہے "اَضْغَاثُ اَحْلَامٍ" (۱۲/ ۴۴) یعنی پریشان

خواب ،تو انسان کی رُوحانیت کی کمزوری سے خواب کے سلسلے میں ربط نہیں رہتا ہے، سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے اور اِس کا اشارہ یہ ہے اور اُن [خواب کے] ٹکڑوں کے اندر جو جو باتیں ہوتی ہیں یا [خواب کی] جس قسم کی نوعیت ہوتی ہے، اُس کے مطابق تاویل ضروری ہے اور مجموعی تاویل یہ ہے کہ یہ ایک کمزوری کی علامت ہے۔ آپ باور کرینگے کہ جو نورانی خواب ہوتا ہے وہ کتاب کے ایک قصّے کی طرح یا ایک دانشور کی گفتگو کی طرح وہ خواب مربوط ہوتا ہے۔ اُس کا سلسلہ اٹوٹ ہوتا ہے یہ نورانی خواب ہوتا ہے اور جب انسان کی خودی میں، رُوحانیت میں، باطن میں کمزوری آتی ہے عبادت کی کمی ہوتی ہے یا اخلاقی کمزوری ہوتی ہے تو اُس وقت خواب کے اندر گڑبڑ جیسی ہوتی ہے۔ لیکن اُس گڑبڑ ہونے کے اندر بھی اُس کے اشارے ہوتے ہیں، کمزوری کے معنی اُس میں پائے جاتے ہیں۔

سوال نمبر ۲: انہوں نے ایک سوال کیا کہ بعض دفعہ خواب میں یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ کوئی رُوح یا کوئی شئ آ کر انسان کے اُوپر وزن ڈالتی ہے۔

جواب: اِس کو طبّ میں یا نفسیاتی طور پر ''کابوس'' کہتے ہیں، لیکن وہ ایک چیز ہوتی ہے۔ وہ ایک چیز ہوتی ہے شروع میں یہ کمزوری کی علامت بتلاتی ہے، لیکن آگے چل کر اسی سے کوئی اچھی رُوح اور اچھی طاقت اِسی میں سے اُبھر آتی ہے۔ یہ انسان کے رُوحانی طور پر، حسّی طور پر زندہ ہونے اور اُس میں احساس وشعور ہونے کی دلیل ہے، لیکن یہی چیز آگے چل کر ایک معجزہ بن جاتی ہے۔

سوال نمبر ۳: موت کو دیکھنا اُس کی کیا تاویل ہے؟

جواب: موت کو کسی طرح سے دیکھنا، تعبیر اور تاویل کے لحاظ سے اچھی علامت ہے اور موت کی کئی قسمیں ہیں اور معلوم نہیں کس قسم کی موت دیکھتا ہے اور اگر اُس کی حالت اچھی ہے تو یہ موت وہی ہوسکتی ہے جس کا ذکر ہے کہ: موتوا قبل ان تموتوا یعنی تم جسمانی طور پر مرنے سے پیشتر نفسانی طور پر مرو، یعنی نفس کشی کرو، تزکیۂ نفس کرو، تحلیل نفس کرو۔ اگر اِس قسم کی موت ہے تو یہ رُوحِ ایمان کے مرنے کی علامت نہیں ہے بلکہ نفس امّارہ کے مرنے کی علامت ہوسکتی ہے۔

سوال نمبر ۴: انہوں نے سوال کیا کہ خواب کے اندر خواب دیکھنا یہ بھی ہوتا ہے۔

جواب: یہ اُس عالمِ خواب کے دُوررس ہونے اور بہت سی چیزوں پر اُس کے حاوی ہونے کی علامت ہے۔ یہاں تک کہ بعض دفعہ کچھ درویش بہت دُور تک دیکھتے ہیں، جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ عالمِ خواب جس طرح وہ لامکان ہے اسی طرح وہ لازمان بھی ہے۔ تو جب لازمان ہے تو اُس کا (Approach) ازل تک ہے اور وہ یعنی بہت سی چیزوں کو پاتا ہے۔

مومن خواب میں ایسے فرضی خواب کو بھی دیکھتا ہے، خواب کے اندر خواب میں جاتا ہے اور اُس کے اندر ایسی چیزیں دیکھتا ہے، ایسے خواب دیکھتا ہے کہ اُن خوابوں کو اُس نے دیکھا نہیں تھا۔ واقعتہً اُس نے دیکھا نہیں تھا لیکن وہ ایسے خواب کو خواب کے اندر پاتا ہے، اِس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ایک (Approach)، یہ ازل کے اندر جھانکنا ہے۔

سوال نمبر ۵: اِن کے دو سوال ہیں، پہلے سوال میں انہوں نے یہ پوچھا ہے کہ خواب جو مختلف کیفیتوں میں ہوتا ہے، تو گہری نیند میں نہیں بلکہ ہلکی نیند میں خواب دیکھا جاتا ہے۔

جواب: تو اِس کے لئے جواب یہ ہے کہ کچھ افراد ایسے ہیں جو کہ گہری نیند میں جانے کے بعد خواب بھول جاتے ہیں، لیکن سب ایسے نہیں ہیں۔ کچھ افراد ہیں [جو] ہلکی نیند میں خواب دیکھتے ہیں، کچھ افراد ہیں [جو] گہری نیند میں خواب دیکھتے ہیں اور کچھ افراد ہیں جو کہ خوابوں کو بھول جاتے ہیں۔ جو خواب کو بھول جاتے ہیں وہ بہت تھوڑے ہیں اور جب وہ تھوڑے ہیں تو ہم عام اصول میں اِس کا حساب نہیں کرتے ہیں، اُن کو شمار نہیں کرتے ہیں، وہ مستثنیات میں سے ہیں، یعنی یہ (Case)، (Exceptional) ہے اور عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ گہری نیند میں خواب دیکھتے ہیں اور ہلکی نیند میں بھی دیکھتے ہیں اور ہلکی نیند میں یہ خدشہ رہتا ہے کہ بعض دفعہ مادّی دُنیا کا اُس خواب کے ساتھ تعلّق رہتا ہے۔ مثلاً بعض دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ اگر یہاں ہم سوئے ہیں اور کچھ لوگ باہر کے کمرے میں آہستہ آہستہ باتیں کرتے ہیں، تو اُن کی آواز ہمارے کانوں میں پڑتی ہے۔ جیسے ہی اُن کی آواز ہمارے کانوں میں پڑتی ہے تو اُسی میں سے ہمارے خواب کے لئے ایک گفتگو بنتی ہے، اُن کی گفتگو سے کچھ مختلف، لیکن (Matter) اُن کی آواز سے بنتا ہے، یہ ہلکی نیند کی کیفیت ہے، تو اِس میں اُن کی کچھ مداخلت ہوتی ہے اور بعض دفعہ تنہائی میں اگر ہلکی نیند، رُوحانی قسم کے ایک مومن پر واقع ہوئی ہے اور اُس میں [وہ] خواب دیکھتا ہے تو یہ اچھی بات ہے۔ اور آپ کے اِس سوال کا یہ جواب بنا کہ اکثر [یعنی] گہری نیند میں خواب دیکھا جاتا ہے اور ہلکی نیند میں بھی خواب دیکھے جاتے ہیں لیکن اُس کی دو صورتیں ہیں، ایک صورت میں کچھ اِس مادّی دُنیا کا تعلق بھی رہتا ہے۔

سوال نمبر ۶: دُوسرا سوال آپ کا تھا، میرے ایک قول کے (Reference) سے آپ نے کہا کہ خواب جو دیکھا جاتا ہے، دوسرے انسانوں سے اُس کا تعلّق ضرور ہوتا ہے۔

جواب: یہ بات صحیح ہے آپ کا کہنا، لیکن اکثر و بیشتر خواب کا تعلّق شخص کی اپنی ذات سے ہے اور بعض دفعہ ضرور اُس کا تعلّق دُوسرے لوگوں سے، دُنیا سے، سوسائٹی سے ضرور ہے اور اِس سلسلے میں، مَیں نے پہلے کہا تھا کہ مصر کے بادشاہ نے جو خواب دیکھا تھا، اُس کا تعلّق اگرچہ اُس کی سلطنت سے، حکومت سے ضرور تھا، لیکن اُس کے ملک کے لوگوں سے بھی اُس کا

تعلّق تھا اور یوسفؑ نے جو خواب دیکھا تھا وہ اُس کی شخصیت سے تھا اور ابراہیمؑ نے خواب دیکھا تھا وہ اپنے بیٹے سے اور اپنے امتحان سے متعلّق تھا۔ تو دونوں پہلو ہیں لیکن اکثر و بیشتر ہوتا یہ ہے کہ خدا چاہتا ہے کہ انسان اپنی تعمیر کرے، خدا چاہتا ہے کہ انسان خود کو سُدھارے، تو اِس اشارے کا رُخ خود انسان کی شخصیت کی طرف ہوتا ہے اور ہاں! اِس سے انکار نہیں کہ بعض دفعہ دُوسرے انسانوں سے بھی خواب کا تعلّق ہوتا ہے اور ضرور ایسا ہے کہ یعنی جب دُنیا میں کوئی انقلاب آنے والا ہے یا کوئی ایسی ضروری بات ہے تو ہوسکتا ہے۔

سوال نمبر ۷: شاید آپ یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہم دُنیا میں کسی چیز کے ساتھ ذہن میں، خاطر میں یاد میں اور ظاہر میں کسی چیز کے ساتھ ہیں تو وہ چیز خواب میں ضرور آتی ہے۔ ایسے میں معلوم نہیں کہ اِس قسم کی چیز کا دیکھنا محض قدرتی ہے یا ہماری وابستگی سے ہے۔ اور شاید آپ یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ ہم ہر چیز سے بے تعلّق رہیں اور قدرتی طور پر کوئی چیز خواب میں آئے تو شاید وہی چیز قدرتی اور حقیقی ہوسکتی ہے، آپ یہ پوچھنا چاہتے ہیں؟

جواب: یہ بات صحیح ہے، ایک خواب یعنی (By Force) جیسا بھی ہوسکتا ہے کہ ہم کسی چیز کو اپنے ذہن و خاطر میں رکھتے ہیں تو اکثر وہی چیز خواب میں آتی ہے، اُس کے بارے میں شبہ ہے اور اُس کے بارے میں قدرتی ہونے کے سلسلے میں شبہ ہے۔ ایک چیز جس کو ہم یاد نہیں کرتے ہیں جو ہمارے ذہن میں نہیں ہے، ہمارے حواس میں نہیں ہے، تو یکا یک ایک بات ہم دیکھتے ہیں تو بیشک وہ زیادہ قدرتی ہے اور حقیقت کا پہلو اُس میں زیادہ ہے۔

سوال نمبر ۸: انہوں نے کہا کہ کوئی بھی نیک کام ہے جو ہم کرنا چاہتے ہیں لیکن کر نہیں سکتے ہیں اور اگر اُس کا کوئی نمونہ خواب میں دکھائی دے تو اُس کا کیا مطلب ہے؟

جواب: مَیں نے کہا کہ انسان جو کسی نیک کام کی نیّت رکھتا ہے تو خدا اُس کو منظور فرماتا ہے اور اگر خدا چاہے تو اِس منظوری کو عالمِ خواب میں بھی اُس پر ظاہر کرسکتا ہے کہ اُس نے اِس کی نیّت کو قبول فرمایا ہے تو اُس صورت میں کوئی بھی نیک کام عملاً خواب میں آسکتا ہے، جس کے کرنے کے لئے مومن نے نیّت کی تھی۔

سوال نمبر ۹: انہوں نے پوچھا کہ خواب میں ہم اگر خود کو چھوٹے چھوٹے بچّوں کے درمیان پائیں، جو معصوم بچّے ہوتے ہیں یا خود کو ایسی جگہوں سے گزرتے ہوئے دیکھیں جو اُونچی دیواریں ہیں یا درخت ہیں یا پہاڑ ہیں۔

جواب: تو اِس کے لئے میں نے کہا کہ وہ جو چھوٹی چھوٹی نسل ہے، چھوٹے بچّے ہیں وہ بہشت کی مخلوق ہیں اور جن دشوار گزار رستوں سے مومن گزرتا ہے با آسانی وہ رُوحانی طاقت کا مظاہرہ ہے اور اِس کے برعکس اگر ایک انسان خواب میں

چل نہیں سکتا ہے اور چڑھائی نہیں چڑھ سکتا ہے تو یہ اُس کی رُوحانی کمزوری کی علامت ہے۔ تو اِس لئے اگر دیواروں کو پھلانگتا ہے، درختوں کی چوٹیوں پر چڑھتا ہے یا اُونچی جگہوں سے گزرتا ہے یا چڑھائی سے با آسانی چڑھتا ہے تو یہ اُس کی رُوح کے طاقتور ہونے کا اشارہ ہے۔

سوال نمبر ۱۰: انہوں نے کہا کہ خود کو ایک باغ میں پایا تو اتنے میں کچھ کتّے اِن کے پیچھے پڑ گئے، تو پھر یہ اُڑنے لگے، پرواز کرنے لگے، پھر اُس کے بعد نیچے آئے۔
جواب: اِس کا جواب ہے کتّوں سے مراد کچھ ایسے مخالف لوگ یا دینی دشمن ہو سکتے ہیں، جنہوں نے اِن کو اذیّت دینا چاہا ہوگا اور پھر خداوند کی رحمت اور مہربانی سے یہ اپنی عبادت، ذکر و نیکی کی طاقت سے، اِن سے بالاتر ہو گئے اور رُوحانیت کی فضا میں اُڑنے لگے، تب وہ اذیّت دُور ہو گئی اور اُس سے یہ بچائے گئے، تو اِس کی تاویل اِس طرح سے ہو سکتی ہے۔

سوال نمبر ۱۱: انہوں نے کہا کہ لاش کو اگر خواب میں دیکھیں۔
جواب: تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ یہ اشارہ ہے نفسِ امّارہ کی طرف یا یہ ہے کہ جو کسی رُوحانی کام میں سُستی ہو اُس کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے یا کسی طاقت کے لحاظ سے مُردگی کی علامت ہو سکتی ہے۔

سوال نمبر ۱۲: [خواب میں] بہت سے مومنین کو امام کا دیدار ہوتا ہے لیکن فرمایا گیا ہے کہ امام سینے میں نہیں آتا۔
جواب: تو اِس کا مقصد یہ ہوا کہ انسان کی رُوح کو یہ صلاحیت دی گئی ہے کہ وہ امام کے رُوپ کو دھار کر امام کی نمائندگی کر سکتی ہے اور امام کی طرف سے اُس کو اجازت ہے کہ امام بن کر دیدار دے۔ لہٰذا یہ دیدار ایک طرح سے امام کا دیدار ہے اور ایک لحاظ سے نہیں ہے، اِس میں دونوں باتیں ہیں اور جس لحاظ سے وہ امام کا دیدار ہے نمائندگی کے طور پر تو صحیح ہے کہ مومن اُس کو دیدار سمجھتا ہے اور جس لحاظ سے وہ دیدار نہیں ہے، اُس کے بارے میں امام نے فرمایا ہے کہ امام کسی کے سینے میں نہیں آسکتا۔

سوال نمبر ۱۳: آپ کا سوال شاید یہ ہو کہ مومن ایک خواب دیکھتا ہے اور اُس کی تاویل سمجھنا چاہتا ہے تو ایسے میں پوچھنا جائز ہے یا ناجائز ہے، آپ یہ پوچھنا چاہتے ہیں۔
جواب: یہ صحیح ہے تاویل کے لحاظ سے، ابھی میں نے کہا تھا نا کہ خواب ہر کسی کو نہیں بتانے کا ہے اور کسی مشورے کے سلسلے میں کسی کامل اُستاد سے پوچھنا ہے تو وہ جائز ہے، کسی مہربان دوست سے پوچھنا ہے تو جائز ہے تو تاویل کے لحاظ سے کسی کامل اُستاد سے پوچھنے میں منع نہیں ہے۔

سوال نمبر ۱۴: خواب میں ہیبت ناک، خوفناک خواب دیکھنا۔

جواب: اُس [خواب] کا ہماری (Breathing) پر یا نبض پر اثر ہونا قدرتی بات ہے۔ چونکہ وہ اپنے اثر میں لاسکتا ہے اُس کا اثر پڑتا ہے، وہ حقیقت ہے تو چونکہ اُس کا نتیجہ بہت سی صورتوں میں نکلتا ہے، لہٰذا یہ قدرتی بات ہے کہ انسان جہاں ڈرتا ہے تو وہاں اُس کے نبض اور (Breathing) میں فرق آتا ہے، چونکہ اُس میں وہ رُوح کام کرتی ہے اور اُس کی حالت بدل جاتی ہے اور اُس رُوح میں کوئی اور رُوح بھی آسکتی ہے یا رُوح اپنی بھرپور قوت میں کام کرسکتی ہے یا اُس کی حالت مختلف ہوجاتی ہے۔ تو اِن وجوہات کی بنا پر (Breathing) میں، نبض میں یعنی (Pulse) میں فرق آسکتا ہے، یہ قدرتی بات ہے تو ایسے میں جب خوف والے خواب ہوں تو ایسے میں جاگیں اور تھوڑی سی تسبیح پڑھیں۔

سوال نمبر ۱۵: [خواب کے عالم میں بول بولنا۔]

جواب: خواب کے عالم میں بعض دفعہ مومن اپنا بول بھی بولتا ہے، لیکن زیادہ دیر تک نہیں بولتا ہے کچھ لمحات کے لئے بول بولتا ہے اور اُس وقت (Fastly) آگے ہوتا ہے اور اُس پر رُوحانی کیفیت طاری ہوجاتی ہے۔ یہ وہ جانتا ہے اور بعض دفعہ ممکن ہے کہ وہ زبان سے کوئی گنان بولے اور اُس کو پتا نہ ہو یا اُس کو کچھ نیم شعوری طور پر پتا ہو اور یہ ہوتا ہے، کہ کچھ لوگ گنان پڑھتے ہیں۔ کچھ لوگ گنان پڑھتے ہیں اور مجھ میں بھی ایک خاصیت تھی جب میں پہلو پر نہیں، کروٹ پر نہیں، جب میں چت لیٹتا تھا تو اُس وقت میری زبان سے، میرے مُنہ سے کچھ آواز نکلتی تھی اور گنان کی طرح، الفاظ کے بغیر ایک آواز۔ تو یہ شام کو لیٹتے ہوئے اور تھوڑی دیر سونے کے بعد یہ ہوتا تھا، آس پاس جو ہوتے تھے لوگ اُن کو پتا چلتا تھا اور مجھ کو بھی تھوڑی تھوڑی اِس سے خبر ہوتی تھی۔ یہ ہوتا رہتا ہے اچھی علامت ہے آگے چل کر اِس میں سے کوئی رُوح بنتی ہے اور کوئی ترقّی بنتی ہے۔

سوال نمبر ۱۶: انہوں نے کہا کہ جب ہم سوتے ہیں تو کوئی چیز پکارتی ہے۔

جواب: یہ رُوح ہے، ہماری اپنی رُوح ہے یا کہنا چاہیے کہ فرشتے ہیں اور یہ بیداری کے لئے جگانے کے لئے اور احساس دلانے کے لئے ہیں۔

سوال نمبر ۱۷: [خواب میں اپنے کام کاج کو دیکھنا]

جواب: دُنیا کے مشاغل بہت ہیں، مختلف وجوہات سے، مختلف کام کئے جاتے ہیں اور ہر شخص کے سامنے کوئی نہ کوئی ضرورت ہوتی ہے اور وہ بہت سوچ کر کوئی کام کرتا ہے۔ تو اپنا کسب اور اپنا کام اور اپنا شغل جو ہے وہ خواب میں آئے تو آسکتا ہے، اِس میں کوئی بات نہیں ہے، شاید اُس میں بھی کچھ برکت ہے یا اُس کام کے سیکھنے یا سکھانے کے بارے میں کوئی اشارہ ملتا ہوگا۔

سوال نمبر ۱۸:[کسی رُوحانی بیماری کے بارے میں سوال]

جواب: یہ بھی ایک ادھوری رُوحانیت ہے یا یہ اِس کو ایک بیماری قرار دیتے ہیں۔ڈاکٹر لوگوں کے (Notice) میں بھی یہ بات ہے، جو حکیم ہیں وہ بھی اِس کو سمجھتے ہیں کہ یہ ایک قسم کی بیماری ہے اور ظاہری طبّ میں اور ڈاکٹری میں یہ بیماری ہے لیکن رُوحانیت میں ایسے شخص کو ادھوری رُوحانیت والا قرار دیتے ہیں اور ایسے شخص کو رُوحانیت بہت جلد (Catch) کر سکتی ہے۔بشرطیکہ کہ اُس کو رُوحانیّت سکھائی جائے، عبادت کا رستہ بتایا جائے، علم و آگہی سے اُس کو فائدہ دلایا جائے۔

سوال نمبر ۱۹:[خواب کے اندر قبرستان کو اور شادی کو ایک ساتھ دیکھنا]۔

جواب: تو یہ تاویل طلب چیز ہے۔ایک کتاب میں ہے کہ: این دیار این مزار[1] جو ناصرِ خسروؒ کی تبلیغ جہاں پر ہے۔اِس کو پڑھتے ہیں، دُنیا خود قبرستان ہے کہ اِس زمین میں کتنے لوگ دفنائے گئے ہیں، لاتعداد اور بیشمار لوگ تو یہ رُوح کے عجائبات میں سے ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ انسان موت اور زندگی کے دو دروازوں سے گزرتا جاتا ہے اور بقا وفنا ایک ساتھ ہیں، شادی اور غمی ایک ساتھ ہیں۔

حواشی

[1] ناصر خسرو براهی میگزشت — مست و لا یعقل چون میخوارگان

دید قبرستان و مَبرَز روبرو — بانگ بر زد و گفت کای نظّارگان

نعمت دنیا و نعمت خواره بین — اینش نعمت اینش نعمت خوارگان

ترجمہ: ناصرِ خسرو ایک راستے سے گزر رہا تھا کہ اُس نے ایک مقام پر قبرستان اور مَبرَز (بول و براز کی جگہ) کو آمنے سامنے دیکھا۔(ایسے میں) اُس نے بآوازِ بلند صدا دی اور کہا اے نظّارہ کرنے والو! دنیا کی نعمت اور نعمت کو کھانے والوں کو دیکھو! (مَبرَز کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ ہے نعمت اور (قبرستان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) یہ ہیں نعمت کھانے والے!۔از دیوانِ ناصرِ خسرو، صفحہ ۵۰۷۔

ٹرانسکرائب: سیما عظیم ٹائپ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

Click here for Audio

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی (ق س) کا پُرحکمت بیان

عنوان: رُوحانی سلطنت اسماعیلیوں کی میراث

کیسٹ نمبر: ۲۷ تاریخ: دسمبر۔ ۱۹۷۸۔ کراچی

عزیزانِ من! آج ہم یہ چاہتے ہیں کہ انسان کے اندر جو گوناگون صلاحیتیں موجود ہیں اُن کے بارے میں کچھ اظہارِ خیال کریں، یعنی ہم اِس موضوع سے بحث کریں کہ انسان کے اندر کیسی کیسی صلاحیتیں پوشیدہ ہیں اور کن طریقوں سے ہم اُن صلاحیتوں کا پتا لگا سکتے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ انسان اشرف المخلوقات ہے، یعنی خدا کی خدائی میں، خدا کی سلطنت میں جتنی چیزیں پیدا کی گئیں ہیں یا جتنی مخلوقات پائی جاتی ہیں، اُن سب سے اشرف واعلیٰ اور افضل انسان ہے۔ اِس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان فرشتوں سے بھی بڑھکر ہے، کیونکہ فرشتہ بھی مخلوق ہے اور انسان کو اگر اشرف المخلوقات کا ٹائٹل دیا جائے تو اِس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ انسان فرشتوں سے بھی اُوپر ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسان کا اِس مرتبے پر ہونا امکانیت کی بات ہے یا عملی طور پر واقعتہً انسان موجودہ حالت میں اسی درجے پر فائز ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان عملاً ایسا نہیں ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ دُنیا کے اندر کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو حیوان سے بھی بدتر ہیں، پھر اِس کا خلاصہ یہ ہوا کہ یہ سب امکانیت کی بات ہے اور اگر مانا گیا کہ یہ امکانیت کی بات ہے تو پھر اِس امکانیت کی انسان کے اندر وہ کون سی قوتیں ہیں، وہ کون سی صلاحیتیں ہیں جس کے بل بوتے پر انسان فرشتوں سے بھی آگے بڑھ سکتا ہے۔ کوئی ایسی قوت، کوئی ایسی صلاحیت ضرور موجود ہونی چاہیے، جس کی وجہ سے ہم کہہ سکیں یا باور کرسکیں کہ انسان واقعتہً اشرف المخلوقات ہے۔ اب ہمیں یقین کرنا ہوگا کہ بیشک انسان میں ایسی بہت سی قوتیں ہیں، ایسی بہت سی صلاحیتیں ہیں جن کو بروئے کار لاکر انسان فرشتوں سے بھی اُوپر جاسکتا ہے اور جس کی وجہ سے انسان کو اشرف المخلوقات کا خطاب ملا ہے۔

اب ہم اِس سوال کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے سوچتے ہیں کہ وہ صلاحیت کیا دُنیوی اور ظاہری قسم کی ہے یا دینی اور باطنی قسم کی ہے، یعنی کیا وہ صلاحیت ایسی ہے کہ رُوحانی قسم کی ہے؟ اِس سوال کا جواب تب ہی ممکن ہے جو ہم کہیں کہ وہ قوت دُنیاوی نہیں، وہ صلاحیت دنیاوی نہیں بلکہ دینی اور رُوحانی ہے اور اِس کا ثبوت یہ ہے کہ انبیاء علیہم السّلام جو روئے زمین پر بنی نوعِ انسان کی ہدایت کے لئے آئے تھے، انہوں نے عملاً انسان کی اِس عظمت و بزرگی کو دکھایا ہے کہ یہ جو انسان میں قابلیت اور صلاحیت ہے وہ رُوحانی اور دینی ہے۔ یعنی ہم پیغمبروں سے مثال لے سکتے ہیں کہ پیغمبروں کی برتری اور بزرگی

دُنیوی طور پر نہیں تھی، دینی اور رُوحانی طور سے تھی، لہٰذا ہم باور کریں گے کہ انسان کی وہ صلاحیت جس سے انسان فرشتوں سے بھی اُوپر جا سکتا ہے دینی اور رُوحانی قسم کی ہے۔

اب ہمیں آسانی ہوئی آخری سوال کے جواب کی طرف جانے کے لئے اور وہ یہ کہ علم اور عبادت کی جو صلاحیت ہے انسان میں وہی ہے جس سے کہ انسان فرشتوں سے بھی اُوپر جا سکتا ہے، کیونکہ انسان کے بعد جتنی مخلوقات ہیں اُن میں فرشتہ ایک مخلوق ہے جو کہ بے شک وہ بہت عظیم ہے اور ہم دیکھتے ہیں کہ فرشتے کی خاصیت کیا ہے، اُس میں ایک عنصر عبادت کا ہے اور ایک عنصر علم کا ہے۔ تو یقین آیا کہ جب بھی انسان فرشتے سے آگے بڑھے گا تو اُس میں کسی اور چیز سے نہیں عبادت اور علم سے آگے بڑھے گا۔ مومن کا جب بھی فرشتے سے مقابلہ ہوگا تو دو باتوں میں ہوگا، عبادت اور علم، کیونکہ فرشتے میں یہی دو باتیں ہیں۔ لیکن آپ کو تعجّب ہوگا کہ فرشتے سے کس طرح سبقت لی جا سکتی ہے، یقیناً اِس کی مثال بھی ہم کو انبیاء علیہم السّلام کی ذاتِ اقدس سے مل سکتی ہے کہ آدم علیہ السّلام کی سبقت فرشتوں سے عبادت اور علم میں تھی کہ آدمؑ نے فرشتوں کو علم سکھایا اور عبادت میں وہ اُن سے آگے بڑھے۔ اب یہ بات طے ہوئی کہ علم اور عبادت ہی مومن کی سب سے بنیادی صلاحیت ہے۔

ایک اور اہم بات اسی سلسلے میں یہ ہے کہ آپ جانتے ہیں کہ دُنیا کے اندر ایک بڑی چیز میں بہت ساری چھوٹی چیزیں آجاتی ہیں، ایک بڑی چیز میں بہت سی چھوٹی چیزیں سمو جاتی ہیں، جس طرح اِس کائنات کو دیکھیں کہ سب سے بیرونی آسمان جس کو ''فلک الافلاک'' کہا جاتا ہے، اُس میں پوری کائنات سموئی ہوئی ہے، اسی طرح انسان کے اندر دو بڑی صلاحیتیں [ہیں یعنی] ایک عبادت کی صلاحیت ہے اور علم کی صلاحیت ہے۔ جب مومن کی یہ دو صلاحیتیں اُجاگر ہو جائیں گی تو اُس وقت دُوسری سب صلاحیتیں اِن دو بڑی صلاحیتوں کے ذیل میں اور اِن کے ضمن میں اُجاگر ہو جائیں گی، آپ کو تعجّب ہوگا کہ انسان کے اندر اتنی صلاحیتیں ہیں جتنی کہ سورج کی کرنیں، سورج کی شعاعیں، سورج کی کرنیں کتنی ہیں؟ لاتعداد، بے پناہ، بے شمار، اسی طرح انسان کے اندر لاتعداد قوتیں پوشیدہ ہیں، بے شمار صلاحیتیں خوابیدہ ہیں۔ جب مومن عبادت و بندگی اور علم کی صلاحیت کو اُجاگر کرے گا تو نتیجے کے طور پر اِس کے باطن سے صلاحیتوں کی کرنیں پھوٹیں گی اور بہت سی قوتیں، بہت سی صلاحیتیں اُجاگر ہو جائیں گی۔ یہاں تک کہ کائناتِ ظاہر و باطن سمٹ سمٹ کر مومن میں محدود نظر آنے لگیں گی اور مومن کی ہر صلاحیت سے ایک چیز نمایاں ہو جائے گی، تو دُنیا میں کائنات میں کتنی چیزیں ہیں؟ کتنی رُوحیں ہیں؟ وہ سب مومن میں سمو جائیں گی، اِس کے لئے اِن اُمیدوں کے ساتھ اور اِس یقین کے ساتھ مومن کو عمل کرنا چاہئے۔

دیکھیں! خدا کا کلام بہت ہی مختصر ہوتا ہے، نبی کا ارشاد اُس سے کچھ زیادہ وضاحت کے ساتھ ہوتا ہے، امامؑ کا فرمان اُس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ ہوتا ہے، لیکن پھر بھی امامؑ کے ارشادات کی وضاحت کی ضرورت ہوتی ہے۔ کیا

کہا؟ اگر مراتب کو دین مانیں، درجات کو دین قرار دیں، خدا کا درجہ، رسولؐ کا درجہ، امامؑ کا درجہ، تو اُس کے نتیجے میں خدا کا جو کلام ہے وہ بہت ہی مختصر ہوتا ہے۔ اِس کی وضاحت پیغمبر کے ارشادات سے ہوتی ہے اور پھر مقابلتہً پیغمبر کے ارشادات بھی مختصر ہوتے ہیں، جن کی وضاحت امامؑ کے ارشادات سے ہوتی ہے اور امامؑ کے ارشادات کی بھی وضاحت ہونی چاہیے۔ اِس سے میری مُراد یہ ہے کہ امامؑ نے مومن کی عظمت و برتری کے بہت سے فرامین فرمائے ہیں، لیکن پھر بھی اُس میں وضاحت کی ضرورت ہے اور وہ وضاحت یہ ہے کہ مومن بہت آگے بڑھ سکتا ہے، مومن بہت بلندی تک اور بہت بلندیوں تک جاسکتا ہے، لیکن کیونکر؟ کس طرح سے؟ اور کن قوتوں کے بَل بوتے پر، وہ اِن قوتوں کے بَل بوتے پر کہ اُس کے اندر دو بنیادی چیزیں ہیں، علم کی صلاحیت، عبادت کی قوت، مومن اِن دو قوتوں کو عمل میں لائے تو بہت کچھ ترقّی کرسکتا ہے۔

دُوسرے پہلو سے اِس کی وضاحت یہ ہے کہ اِن صلاحیتوں کا پتا کس طرح سے چلے؟ باطن کی صفائی کی ضرورت ہے، باطن کی پاکیزگی کی ضرورت ہے یعنی جب تک انسان کے باطن میں آلودگی رہتی ہے اور انسان کی رُوح آلائش سے بھری رہتی ہے تو اُس وقت مومن کی تمام صلاحیتیں دبی رہتی ہیں، وہ پوشیدہ رہتی ہیں۔ اِس کی مثال یوں ہے کہ کسی کھیت میں فصل ہے، جو ابھی ابھی اُگی ہے یا کوئی گھاس ہے اور موسمِ بہار کے وقت گھاس کے اُوپر پتھر کی سلیں پڑی ہیں، پتھر ہیں اور مٹّی پڑی ہوئی ہے تو اُس میں گھاس دبی رہتی ہے، وہ اُگ نہیں سکتی، تو زمیندار کا یا دہقان کا فرض یہ ہے کہ اُن پتھروں کو ہٹائے تاکہ زمین سے گھاس اُگے، فصل پیدا ہوجائے۔ اسی طرح انسان کے اندر یہ (Position) ہے کہ ہر وقت آلودگی آسکتی ہے، انسان کے باطن میں آلائش ہوسکتی ہے، اِس کو بار بار پاکیزہ کرنے کی ضرورت ہے، لیکن یہ پاکیزگی، انقلابی قسم کی پاکیزگی [یا] تطہیر کس طرح سے ہونی چاہیے؟ وہ یہ کہ کسی بھی بہانے سے خدا کے حضور میں مومن گڑگڑائے، گریہ وزاری کرے، گریہ وزاری سے انسان کی ہستی کے اندر ایک عجیب قسم کا انقلاب رُونما ہوجاتا ہے، اِس انقلاب سے مومن کے اندر تحلیل ہوجاتی ہے، پاکیزگی ہوجاتی ہے، خدا کے حضور میں گریہ وزاری کرنا یہ ایک عظیم ہُنر ہے۔ آنسو بہانا دو طرح سے ہے، دُنیا کی کسی مصیبت پر اور خدا کی محبّت میں، جب انسان دُنیا کے کسی نقصان پر آنسو بہاتا ہے، روتا ہے تو یہ اُس بارش کی طرح ہے جو بے وقت برستی ہے، بغیر (Season) کے بارش ہوتی ہے اور جس سے نقصان کے سوا کوئی فائدہ نہیں ہے اور دُوسری بارش وہ ہے جو عین وقت پر برستی ہے، جس کی ضرورت تھی تاکہ پہاڑ کے دامن سے لے کر میدانی علاقے تک زمین اُس سے آباد ہو اور مری ہوئی زمین اُس کی بدولت زندہ ہوجائے۔ تو بغیر نقصان کے خدا کے لئے آنسو بہانا، اپنی کوتاہیوں پر ندامت اُٹھانا اور ترقّی کے لئے، علم کے لئے حسرت کرنا، پیروں بزرگوں کی ترقّی کو ملحوظِ نظر رکھتے ہوئے خدا سے درخواست کرنا کہ ہم کو بھی کچھ اِس قسم کی ترقّی ہونی چاہئے اور اُس حالت میں آنسو بہانا، اُس بارش کی طرح ہے جو وقت پر (Season) میں برستی ہے، موسمِ بہار میں برستی ہے یا آگے چل کر برستی ہے، جس سے مری ہوئی زمین کو حیات ملتی ہے، تو یہ ایک ہُنر ہے۔

کچھ دوستوں نے، کچھ بھائیوں نے ناسمجھی سے یا اختلاف کی بِنا پر اِس چیز کی مخالفت کی، حالانکہ وہ بھول گئے اپنے اُصول کو اور [وہ] اُصول یہ ہے کہ ہماری مقدّس دُعا کے اندر ایک پارٹ تسبیح اور گریہ وزاری کا ہے اور دیکھئے آپ سب ماشاءاللہ سب تعلیم یافتہ ہیں، گریہ کے کیا معنی اور زاری کا کیا مطلب؟ گریہ کسے کہتے ہیں؟ یہ ایک فارسی لفظ ہے، گریہ وزاری، یہ اصطلاح خوامخواہ کی نہیں ہے، یہ ایک عمل کے لئے ہے، ایک کام کے لئے ہے۔ دُنیا مادّی طور پر بہت آگے بڑھی ہے، کاش آپ کو کچھ اُن بزرگوں کا پتا ہوتا جو پچاس برس پہلے تھے، وہ ہر موقع پر آنسو بہاتے تھے، خصوصاً دیدار کے وقت، عبادت کے دوران، اچھی نصیحتوں کے نتیجے میں، رُوحانی محفل میں اور صبح کے وقت بھی بسا اوقات، دیکھیں تو وہ مولا کے ایسے عاشق تھے کہ اُن کی آنکھوں سے ہمیشہ پانی بہتا تھا، یہ کیوں؟ اور دیکھئے! جب مومن خدا سے قریب ہوتا ہے تو خدا اُس کو خود بخود چلاتا ہے، وہ سوچے سمجھے یا نہ سمجھے لیکن خدا اُس کے باطن کو اُس کے دل کو اپنے قبضے میں کر لیتا ہے۔ اُن افراد میں سے کچھ ایسے بھی تھے جن کو تعلیمی طور پر یہ پتا نہیں تھا کہ آنسوؤں کی کیا قیمت ہوتی ہے لیکن وہ آنسو بہاتے تھے، یہ اُن کو توفیق ملی تھی، یہ اُن کو ہدایت ملی تھی وہ ایسے افراد تھے۔ وہ نہیں تو اپنے وقت میں بھی دیکھیں آپ کو مشکل سے اِس زمانے میں دیدار کے موقع پر بہت کم مومنین ایسے ملیں گے جو کہ پنڈال میں امام کو دیکھتے ہی اُن کی آنکھوں سے آنسو آتے ہیں، لیکن ایسی مثالیں آپ کو آج کل کے زمانے میں بہت کم ملیں گی تو یہ ایک سعادت ہے، یہ ایک کوشش ہے۔

اِس کے علاوہ آپ کو ایک چیز یاد دلاتا ہوں، آپ قرآن کی طرف توجّہ دیں، سب قرآن کو نہ پڑھیں، ایک ہی موضوع کو پڑھیں۔ آپ کا موضوع ہونا چاہیے کہ انبیاء اور گریہ وزاری، یہ آپ اپنا موضوع بنا لیں۔ آپ کسی بھی (Dictionary) [یا] قرآن کی لغت کی مدد سے [دیکھیں کہ]، قرآن کی زبان میں گریہ وزاری کو کیا کہتے ہیں اُس لفظ کو لیں، اور پھر انبیاء، خود بخود اُس لفظ میں آپ کے سامنے آئیں گے، آپ کو پتا چلے گا کہ انبیاء علیہم السّلام عبادت بندگی میں کس طرح عاجزی کا گریہ وزاری کا مظاہرہ کرتے تھے، اور اِس سے میرا مقصد یہ ہے کہ دل کو جب تک نہ پگھلایا جائے تو اُس میں تجدید نہیں ہوتی ہے۔ دُنیا میں جو بھی چیز ناکام ہے، کام نہیں کرتی ہے تو اُس کو (Renew) کرانا چاہیے، آپ کی گاڑی ہے، (Machinery) ہے اور کوئی چیز ہے تو وہ کام نہیں کرتی ہے، آپ اُس کی مرمّت کرتے ہیں جس کو (Renew) کہتے ہیں۔ تو آپ ہی بتائیں کہ دل کس طرح (Renew) ہوسکتا ہے؟ دل کو پگھلائیں، گرمائیں، اِس کو سو بار گرمائیں، اِس میں یہ قوت ہے کہ ہر وقت یہ تازہ تر ہو جاتا ہے، اگر دل تازہ تر نہ ہو جائے، اِس میں جدّت پیدا نہ ہو، اِس میں (Renew) نہ ہو تو یہ آپ کے لئے کس طرح کام کرسکتا ہے۔ دیکھئے! تمام حکمت دل میں ہے اور ترقّی کا دارومدار دل پر ہے، تو آپ [کو] دل کی (Mechanicing) کس طرح کرنی ہے وہ سمجھ لیں، وہ یہ ہے کہ آپ اُس کو گرمائیں، اُس کو پگھلائیں لیکن مولا کی محبّت میں اور اگر مزید آپ اِس کی وضاحت چاہتے ہیں تو دیکھئے امامؑ نے کس چیز کی زیادہ تعریف کی ہے، امامؑ نے

فرمایا ہے کہ: دین کے اندر سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اہلِ بیت کی محبّت ہو (دارالسّلام، ۳۔ ۲۔ ۱۹۳۷) اہلِ بیت کی محبّت ہو اب آپ کو جب یہ موضوع ملا کہ امامؑ کی محبّت سب سے بڑی چیز ہے تو آپ لفظِ محبّت کا تجزیہ کریں، اُس کی تحلیل کریں، وہ کیا کیفیت ہے؟ اُس میں دل پر کیا گزرتا ہے اور حقیقی محبّت کیا ہے؟ اور سچّی محبّت جب حاصل ہوتی ہے تو اُس میں مومن کا یا عاشق کا کیا عالم ہوتا ہے؟ یہی کہ بس اُس میں دل پگھل جاتا ہے، یہی کہ اُس میں دل نرم ہو جاتا ہے، یہی کہ بس اُس میں آنسو آتے ہیں، جب آنسو آتے ہیں تو خدا وہ ذات نہیں کہ گناہ کو معاف نہ کرے۔ میرے خیال میں آپ بھی اپنے دشمن کو معاف کریں گے، ایک دشمن فرض کریں آپ کا تھا اور اِس کے متعلّق آپ کا یہ جذبہ تھا کہ موقع ہو تو اُس سے آپ انتقام لینا پسند کریں گے، چونکہ وہ آپ کا دشمن تھا کسی طرح سے لیکن وہ دشمن آپ کے سامنے آیا اور ہاتھ جوڑ کر، سر جھکا کر، آنسو بہانے لگا، کیا کیفیت گزرے گی! بس آپ کے دل میں جو جذبۂ انتقام تھا وہ ختم ہو کر رہے گا اور پھر آپ چاہیں گے کہ اُس کو معاف کریں۔ یہ آنسو بہانے پر کس طرح رحم آنا چاہیے اُسکی ایک مثال ہے، اور آنسو اور آنسو میں فرق ہے، میں نے ایک فرق بتایا وہ یہ کہ دُنیا کے کسی نقصان پر آنسو نہیں بہانے کا اور ہمارے دُوسرے بھائی جو آنسو بہاتے ہیں وہ بھی پسندیدہ نہیں ہے، ہمیں امامؑ کے متعلّق نہیں رونے کا، ہمیں اگر رونا ہے تو اپنے گناہوں پر، اپنی پسماندگی پر، اپنی کمزوری پر اور اِس لئے کہ امامؑ کے پاس کتنی رحمتیں ہیں، اُن کو سامنے رکھتے ہوئے، امامؑ کی مہربانیوں کو، رُوحانی ترقّی کی امکانیت کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے [رونا ہے]۔

میں ایک اور چیز آپ کو بتاؤں! ایک بچّہ پیدا ہوتا ہے تو اُس کو خدا کیا عطا کرتا ہے سب سے پہلے رونا! یہی رونا اُس کی زبان کا کام کرتا ہے، گو کہ وہ زبان نہیں سمجھتا ہے، گو کہ وہ اپنی حاجتوں کو پیش نہیں کر سکتا ہے، لیکن اُس کا رونا ہر طرح سے ترجمانی کرتا ہے اُس کی ضرورتوں کی اور اُس کی حاجتوں کی، جو کچھ بھی وہ چاہتا ہے وہ اپنے رونے کی کیفیت میں پیش کرتا ہے اور خدا بھی اسی طرح مومن پر رحم فرماتا ہے کہ خدا کے سامنے ہم بچوں کی طرح ہیں، ہمارے پاس ایسی قابلیت کہاں کہ الفاظ سے اپنی حاجت کو اُس کے سامنے پیش کریں، لہٰذا بہتر ہے کہ ہم آنسو بہائیں۔ تو یہ ایک صوفیانہ اور درویشانہ فائدہ ہے، لیکن ادب سے اور سنجیدگی سے اور نہایت یعنی خلوت سے یہ کوئی جنرل چیز نہیں، یہ بہت ہی مخصوص ہے اور بہت ہی خاص شئ ہے۔ آج جن مومنین کی خاطر خواہ ترقّی نہیں ہے اُس کے بارے میں آپ سوچیں، سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا وجہ ہے، کیا یہ اسماعیلی مذہب کی کوئی کمزوری ہے؟ یا امامؑ کے بول دینے میں کوئی تاثیر نہیں ہے؟ یا یہ کہنا چاہیے کہ مومن کی اپنی غلطی ہے یا ہم قسمت اور تقدیر کو مانیں، آخر کوئی وجہ تو ہے جس سے کہ مومن کی رُوحانی ترقّی نہیں ہوتی ہے۔ وہ بول لیتا ہے، وہ بڑا کام میں آگے ہوتا ہے لیکن بارہ سال، پندرہ سال، بیس سال، آخر کوئی وجہ ہے، اِس میں نہ امامؑ کے قول دینے میں، بول دینے میں کوئی تاثیر کی کمی ہے، نہ اسماعیلی مذہب میں کوئی کمی ہے اور نہ اسمِ اعظم ایسی ویسی چیز ہے اور جو کچھ

بھی نقص ہے وہ مومن میں ہے، اُس کے اعمال پر ہے، وہ اپنی کوششوں میں ناکام رہتا ہے، قسمت بھی نہیں، تقدیر بھی نہیں، ہمارے مذہب میں قسمت تقدیر کوئی چیز نہیں، ہم اپنی قسمت خود بنا سکتے ہیں اور دُنیا میں جو لوگ قسمت اور تقدیر پرست ہیں وہ بہت ہی پیچھے ہیں۔ اسماعیلی مذہب وہ ہے جو کہ قسمت وتقدیر اور قضا وقدر جیسی باتوں پر زیادہ زور نہیں دیتا ہے یا یہ کہ اِس نظریے کی نفی کرتا ہے۔

بہرحال ابھی ابھی مومن کی صلاحیتوں کی بات ہوئی تھی کہ مومن کے اندر بہت سی صلاحیتیں ہیں، بشرط یہ کہ مومن اپنی صلاحیتوں کو اُجاگر کرے اور اِن سے کام لے، تو اِن صلاحیتوں کو اُجاگر کرنے کے سلسلے میں یہ چند باتیں آپ سے کی گئیں۔ عاجزی بہت بڑی قوت ہے، فنا بہت بڑی طاقت ہے، آپ نے فنا کی تعریف سُنی ہے اور آج کل مادّی طور پر بھی فنا ہی کام کرتی ہے۔ دُنیا کے اندر جو بھی طاقت بنتی ہے، سب سے بڑا پاور جو بنتا ہے وہ فنا ہی سے بنتا ہے، گولی چلتی ہے تو اُس میں فنا کام کرتی ہے، کچھ چیزیں ہیں (Burst) ہو جاتی ہیں، جَل جاتی ہیں، فنا ہو جاتی ہیں اور اُس فنا کے نتیجے میں گولی کہیں سے کہیں جاتی ہے۔ راکٹ [ہی] کو لیجئے، بم کو، الیکٹرک کو لیجئے تو یہ سب فنا کے فارمولا کے تحت ہے۔ فنا کسی چیز کا فنا ہو جانا، مٹ جانا تو پھر وہیں سے ایک طاقت اُبھرتی ہے۔ اسی طرح انسان کے اندر جو خودی ہے یا جو گناہ ہے اُس کو فنا کریں تو وہیں سے ایک طاقت اُبھرے گی جو آپ کو کہیں سے کہیں لے جائے گی۔ تو آپ کسی اور چیز کو فنا نہ کریں، اپنی خودی کو فنا کریں، وہ عاجزی سے (Humility) سے ممکن ہے کہ خود کو عاجز قرار دیں، کہ خود کو محتاج قرار دیں، کہ خود کو کمزور قرار دیں، کہ خود کو گناہ گار قرار دیں، اِس سے ایک طاقت آہستہ آہستہ اُبھرے گی اور اِس کا مظاہرہ اُس وقت ہے کہ آپ کی آنکھوں سے عاشقانہ آنسو بہہ جائیں اور اگر آنسو آواز کے بغیر ہیں تو سب سے بہتر ہے۔ تو رویّہ وہ ہونا چاہیے کہ جس سے کسی کو تکلیف نہ ہو، رویّہ ایسا ہونا چاہیے کہ گستاخانہ نہ ہو، رویّہ ایسا ہونا چاہئے کہ وہ سنجیدہ ہو یہ بہت ہی اچھا ہے تو رویّہ ایسا ہونا چاہیے کہ ہماری آواز سے کسی کو تکلیف نہ ہو، کسی کو ناگوار نہ گزرے۔

<u>رُوحانی ترقّی مومن کی میراث ہے، حکمت مومن کی میراث ہے، عالمِ رُوحانیت مومن کی میراث ہے، بہشت مومن کی میراث ہے، نور مومن کی میراث ہے، ترقّی مومن کی میراث ہے</u> اور چونکہ ہم امامؑ کے بچّے ہیں اور رُوحانی سلطنت ہمارے رُوحانی والد کی سلطنت ہے اور اِس معنی میں عالم رُوحانیت ہماری میراث ہے اور اگر ہم اپنی میراث کو حاصل نہیں کر سکتے ہیں تو ہم ناخلف ہیں، ناخلف کیا لفظ ہے؟ ناخلف اُس نالائق فرزند کو کہا جاتا ہے جو باپ کے لئے باعثِ ننگ ہے، باعثِ ناموس ہے، تو ناخلف نالائق اولاد کو کہتے ہیں۔ ایک اچھے باپ سے ایک نالائق اولاد ہوتی ہے تو اُس کو ناخلف کہتے ہیں۔ ہم اگر ناخلف ہیں تو یہ اور بات ہے، ہم اگر اپنے باپ کے بچّے ہیں تو ہم کو بہت کام کرنا ہے اور دیکھئے! دُنیا میں پیچھے رہنے کا ایک سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض لوگ بہت سے فرائض کو خدا پر چھوڑتے ہیں، اِس سے اِن صلاحیتوں کی نفی ہو

جاتی ہے جو ہمارے اندر ہیں، یہ بڑی نقصان دہ بات ہے، اگر ہمارا تصوّر یہ ہو کہ ہمارے اندر بہت سی قوتیں ہیں صرف عمل کی کمی ہے تو یہ بہت اچھی بات ہے اور ہے بھی یہی، اسماعیلی مذہب کا تقاضا یہ ہے کہ مومن خود کو ہر طرح سے اہل سمجھے اور ہر ترقّی کے لئے خود کو قابل قرار دے، وہ یہ نہ کہے، وہ یہ نہ سمجھے کہ ہم میں صلاحیتوں کی کمی ہے، صلاحیتیں ہمارے اندر ہر قسم کی موجود ہیں، ہاں! فرمانبرداری کی کمی ہے، ہاں! عمل کی کمی ہے، ہاں! علم کی کمی ہے۔ علم کے نہ ہونے سے کیا نقصان ہوتا ہے؟ ہم ایسے سادہ مومن بھی ہو سکتے ہیں، نہیں! علم ایک فلسفہ ہے، علم (Theory)، علم روشنی ہے، علم آنکھ ہے، علم نور ہے، علم رستے کی منزل کی نشاندہی کرتا ہے، علم جب ہو تو ایک طرح سے تجربے کا کام دیتا ہے، تجربے کا ہونا اور نہ ہونا یکسان نہیں ہے، لہٰذا علم کے ہونے سے اپنی صلاحیتوں کا پتا چلتا ہے، علم کے ہونے سے اِن صلاحیتوں سے کام لینے کا ڈھنگ آتا ہے، علم کے ہونے سے یہ پتا چلتا ہے کہ خداوند نے ہم کو کیا دیا ہے اور ہم نے اِس دیے ہوئے سے اور کیا لینا ہے، علم سے ہمّت ملتی ہے، علم سے حوصلہ ملتا ہے۔ ایک سولجر جب نیا نیا ہوتا ہے تو اُس کے دل میں ایک طرح سے خوف پیدا ہوتا ہے، اُس کو اعتماد نہیں ہوتا ہے، جب اُس کی (Recruiting) ہوتی ہے، اُس کو سکھایا جاتا ہے، اُس کو (Train) کیا جاتا ہے اور اُس کو ہتھیار کا استعمال کرنا بتایا جاتا ہے تو اُس کو ایک اعتماد حاصل ہوتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ خود کو بچاؤں گا اور دشمن پر وار کروں گا اور میں ضرور فتح حاصل کروں گا، اُس کو اپنے ہنر پر اتنا بھروسہ اور اتنا اعتماد ہوتا ہے، اِس لئے علم ہو تو اعتماد آتا ہے، علم ہو تو امام کی مہربانیوں اور رحمتوں کی شناخت ہوتی ہے، علم ہو تو عالمِ رُوحانیت کی خوبیوں کا پتا چلتا ہے، جب خوبیوں کا پتا چلتا ہے تو وہیں سے ایک کشش پیدا ہوتی ہے، جب خوبی کا پتا چلتا ہے تو اُس میں سے ایک کشش پیدا ہوتی ہے، جب علم ہو تو وہ ہمارے لئے ہتھیار کا کام دیتا ہے اور شیطان سے جہاد کرنے کے لئے آسانی ہوتی ہے، جب علم نہ ہو تو انسان خود کو لاچار سمجھتا ہے، علم ہو تو مومن کا دل بڑا قوی ہو جاتا ہے۔ آپ دُنیا کے ایک لیڈر پر قیاس کریں کہ اُس لیڈر میں کیا ہے؟ علم ہے، تجربہ ہے اور پھر اعتماد ہے، دانشمندی ہے، سیاست ہے۔ سیاست بھی ایک طرح سے علم ہے تو اسی کا فرق ہے اُس میں اور دُوسرے ایک انسان میں کیا فرق ہے؟ بس علم کا فرق ہے۔ اچھا! تو علم کے ہونے سے آپ کی رُوح میں اضافہ ہو جاتا ہے، آپ کے ایمان کی روشنی میں اضافہ ہو جاتا ہے اور عبادت کے کرنے سے غذا ملتی ہے اور رُوح کو سکون ملتا ہے۔ نہ تو تنہا علم کچھ کام کر سکتا ہے اور نہ صرف عبادت کسی مقام تک پہنچ سکتی ہے خداوندِ عالم نے علم اور عبادت، دونوں چیزوں کو ایک ساتھ لازم و ملزوم کر دیا ہے۔ ایک پاؤں پر انسان کہیں نہیں جا سکتا ہے، پرندے کے دو پَر ہیں تو انسان کے دو پاؤں ہیں اور گاڑی کے دو طرفہ پہیّے ہیں اور جہاز کے بھی دو انجن ہیں، دو پَر ہیں وہ فضول نہیں ہیں وہ ہَوا میں (Balance) رکھتے ہیں، ایک ہو تو اُس پر (Balance) نہ ہو، اِس لئے علم عبادت یہ دونوں چیزیں ہیں اور امامؑ کی فرمانبرداری کے تحت یہ دونوں چیزیں حاصل ہو سکتی ہیں تا کہ مومن کے اندر جو قوتیں ہیں جو صلاحیتیں ہیں وہ اُجاگر ہو جائیں، اور زمانے کی اہمیت

میں آپ کو بتاؤں آج کل کا زمانہ اتنا اہم ہے، اتنا اہم ہے کہ کہیں بھی صرف شغل کے لئے کوئی مجلس نہیں ہونی چاہیے، مجلس ہو بہت عملی ہو، (Practical) ہو اور ہر بات ذمہ داری سے قبول کی جائے اور بہت محنت کی جائے، بہت محنت اٹھائی جائے اور اِس کی اہمیت کو سمجھ لیا جائے۔

دیکھئے! اِس وقت علم کی بہت ضرورت ہے، اگلے زمانے سے کہیں بڑھ کر علم کی ضرورت ہے، ایک وقت تھا اُس میں صرف عقیدے سے گزارا ہو سکتا تھا، عقیدہ (Blind faith) وہ کافی تھا، کیونکہ مقابلہ نہیں تھا اُس میں دین اپنے پورے ڈھانچے سے کام کر رہا تھا اور دین کے ساتھ کوئی تضاد پیدا نہیں ہوا تھا، دین کے (Opposite) میں بڑی بڑی طاقتیں نہیں اُبھری تھیں۔ ابھی دُنیا کے اندر بڑی بڑی طاقتیں اُبھری ہیں، لادینیت کی طاقتیں اور ایسے مسائل پیدا ہوئے ہیں کہ ہم کو جو عام علماء نے بتایا تھا جو کچھ بتایا تھا اُس میں تضاد پیدا ہو گیا ہے، مثلاً یہ کہنا کہ یہی دُنیا ہے اور بس یہی ایک دُنیا ہے اور یہ کہنا کہ آسمان پر نہیں جایا جا سکتا ہے اور یہ کہنا کہ چاند بس ایک روشنی ہے اور یہ کہنا کہ آسمان گر جائے گا اور یہ کہنا کہ ستارے بکھر جائیں گے، یہ سب باتیں اگر قرآن کی ہیں تو اِس کے اندر تاویل ہے اور اگر علماء کی ہیں تو اُس میں کچھ خاص اہمیت نہیں ہے۔ بہر حال دُنیا نے زمانے کی ترقّی نے ثابت کر دیا کہ جو علم سچا ہے وہ تو سچا ہے، اُس کو کوئی چیز متاثر نہیں کر سکتی ہے اور جو روایتیں تھیں تو وہ بالکل کمزور ہو گئیں۔

مکڑی ایک جالا تنتی [بُنتی] ہے اور کوئی چیز اُس سے ٹکرا جاتی ہے تو مکڑی کا جالا پارہ پارہ ہو جاتا ہے، اِسی طرح جو عام باتیں ہیں وہ پارہ پارہ ہو گئیں، یہ کہنا کہ آسمان سے عیسیٰؑ کا نزول ہو گا وغیرہ، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ دُنیا یکسر بدل چکی ہے اور ایسی ایسی باتیں پیدا ہوئیں ہیں یا مادّی قسم کی ٹھوس حقیقتیں پیدا ہوئی ہیں عام طور پر دیکھا جائے تو جن سے دین کی روایتوں کی بنیادیں ہل چکی ہیں۔ اب ایسے میں ایک ایسے علم کی ضرورت ہے جو کہ بہت ہی محکم ہو، انقلاب جب آچکا ہے تو اِس میں نئے سِرے سے سوچنے کی ضرورت ہے۔ ہمارا جو دین ہے وہ برحق ہے، ہمارے عقیدے کو کوئی چیز متزلزل نہیں کر سکتی ہے بشرطیکہ ہم میں علم ہو، بشرطیکہ ہم میں حکمت ہو تو اِس لئے ضرورت ہے اِس وقت کہ [ہم] صحیح معنوں میں علم کی طرف توجّہ دیں اور قرآن کی حکمت کو سمجھ پائیں، امامؑ کے ارشادات کو بنیاد سے سمجھ لیں، فرامین کو بھی سمجھنا چاہیے، فرامین کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے، اس کے لئے بھی دل کی روشنی کی ضرورت ہے، علم کی ضرورت ہے، علم ہی علم کو پا سکتا ہے۔ جس طرح کہا جاتا ہے کہ پیسوں سے پیسے بنائے جا سکتے ہیں، دولت سے دولت بنائی جا سکتی ہے تو اِس لئے علم ہی کی روشنی میں ہم امامؑ کے فرامین کے مقاصد کو سمجھ سکتے ہیں۔ اِس کے لئے میری گزارش یہ ہے کہ جب بھی مجلس ہو اُس میں بڑی یکسوئی سے باتیں ذہن نشین کر لی جائیں اور اگر کسی سوال کی ضرورت ہے تو وہ سوال بھی کیا جائے اور ہر بات اچھی طرح سے ذہن نشین کر لینی چاہیے، میرا مقصد یہ ہے کہ ہم جو یہاں مجلس کرتے ہیں [یا] کہیں بھی تو وہ بہت ہی اہم چیز ہے۔ اُس

میں سے فائدہ اُٹھانا چاہیے اور اُس سے دو طرح سے فائدہ اُٹھانا چاہیے ایک علم کا فائدہ، ایک عبادت کا فائدہ۔ عام طور پر آپ نے دیکھا ہے ہم کرتے یوں ہیں کہ پہلے تھوڑا سا اپنے دل کو گرماتے ہیں، آپ کو تجربہ ہوا ہوگا کہ جب ہم اپنے دل کو گرماتے ہیں تو جو علم ہے وہ اپنا کام کرنا شروع کرتا ہے۔ جب ہم اپنے دل کو نہیں گرماتے ہیں ایسے خشک ہی کام شروع کرتے ہیں تو اُس میں آپ نے تجربہ کیا ہوگا کہ اُس میں علم کا کوئی بڑا کرشمہ یا کہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں ہوتا ہے۔ یہ البتہ قابل توجّہ بات ہے کہ مومن اپنے آپ میں تبدیل ہوسکتا ہے، اپنے آپ میں پگھل سکتا ہے وہ کچھ سے کچھ ہوسکتا ہے۔ وہ اپنے مقام پر بیٹھ بیٹھ کر کہیں سے کہیں جاسکتا ہے۔ تو اِس کے لئے یہ سب اسماعیلی مذہب کا معجزہ ہے، کسی شخصیت کی کوئی بات نہیں ہے، یہ امامؑ کی رحمت ہے کہ اسماعیلی مذہب کو، سب اسماعیلیوں کو یہ قوت اُس نے عنایت کی ہے اور اسماعیلیوں کو دُنیا کے اندر بہت اعلیٰ سطح پر رکھا ہے، لیکن افسوس ہوگا جبکہ اسماعیلی اپنی نعمت کو نہیں سمجھیں اور اِس کی حقیقت کو نہیں جانیں، تو قیامت کے دن بڑا گلہ رہے گا۔ کیونکہ قرآن کے اندر یہ ارشاد ہوا ہے کہ قیامت ایک ایسا دن ہے کہ اُس میں ہر نعمت والے سے پوچھا جائے گا کہ تجھ کو یہ نعمت عطا کی گئی تھی تو تو نے اِس کو کس طرح استعمال کیا؟ کس طرح پہچانا؟ کس طرح جانا؟ اسماعیلی مذہب سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہے، یہ ایک ایسی نعمت ہے کہ اِس نعمت کے اندر ساری نعمتیں آچکی ہیں۔ خدا نے اُس روز فرمایا تھا کہ: اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا (۵:۳) آج میں نے تمہارے دین کو تم پر مکمّل کیا اور میں نے تم پر اپنی تمام نعمت پوری کردی اور میں نے تمہارے لئے بطورِ دین کے اسلام مقرّر کیا۔ اِس خطاب کا خاص تعلّق مومنین سے تھا۔

اگر ہم اسلام کے معنی میں جائیں تو اُس میں سے بھی اسماعیلیت کی باتیں ظاہر ہونے لگیں گی۔ اسلام کے کئی معنی ہیں، اُن میں سے ایک معنی تسلیم [کے] ہیں۔ تسلیم کے معنی سپردگی، خود کو سونپنا، خود کو حوالے کردینا، کس کے حوالے کردینا جو ہادیٔ برحق ہے اُس کے [حوالے کردینا]، یعنی وہ جو کچھ کہے اُس پر عمل کرنا یہ ہوئی سپردگی اور ایک طرح سے عبادت و بندگی میں بھی سپردگی آتی ہے، اور اسلام کے ایک معنی صلح [کے ہیں]، اگر تسلیم ہے، سپردگی ہے تو اسماعیلی مذہب میں ہے۔ اسلام کے اندر جتنی جماعتیں ہیں اُن میں سے کسی میں بھی سپردگی نہیں ہے، سپردگی اسماعیلی مذہب میں ہے، تسلیم اسماعیلی مذہب میں ہے کہ [خود کو] ایک زندہ ہادی کے سپرد کردینا یہ سپردگی ہے اور کوئی سپردگی نہیں۔ ہدایت و رہنمائی کے سلسلے میں جس طرح کشتی میں بیٹھے ہوئے افراد خود کو ملّاح کے سپرد کردیتے ہیں، خود کو کشتی کے سپرد کردیتے ہیں، اِس طرح امامؑ جو کشتیٔ نجات ہیں ہم اُس کی فرمان برداری کی کشتی میں بیٹھے ہوئے ہیں، اُس کی ہدایت کی کشتی میں بیٹھے ہوئے ہیں اور ہم نے اپنے آپ کو تسلیم کیا ہے، اُس کے حوالے کردیا ہے، ہم نے خود کو اُس کے سپرد کردیا ہے، تو یہ ہوئے معنی تسلیم کے جو اسلام کی (Root) میں سے ہے۔ ایک معنی تسلیم [کے ہیں] اور دوسرے معنی صلح کے ہیں، صلح و آشتی اگر ہے تو

صرف اسماعیلی مذہب میں ہے، کیونکہ صلح وآشتی بھی خود از خود نہیں ہوتی ہے اُس کے لئے ایک ہادی، رہنما کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب اسماعیلی مذہب میں امامِ برحق موجود ہے تو اُس کی بدولت اور اُس کی حُرمت سے ہم سب سے پہلے اپنے آپس میں بھی صلح وآشتی سے رہیں اور اگر وہ کہیں تو ہم دُوسروں سے بھی صلح وآشتی کر سکتے ہیں، دُوسروں میں یہ ممکن نہیں ہے۔ یعنی صلح وآشتی کی جو شرطیں ہیں یا صلح وآشتی کے لئے جو صفت ہے وہ بدرجۂ اَتم اسماعیلی مذہب میں ہے، اور اسلام کے تیسرے معنی فرمانبرداری کے ہیں، ایک معنی سپردگی کے تھے، دُوسرے معنی صلح وآشتی کے تھے اور تیسرے معنی فرمانبرداری کے ہیں ''وَسَلِّمۡ تَسۡلِيۡمًا'' سے مُراد جو اسلام کی (Root) سے ہے، فرمانبرداری کرو جیسا کہ فرمانبرداری کرنے کا حق ہے، تو فرمانبرداری اسماعیلی مذہب میں ہے۔ اِس کی شرطیں بھی یہیں پر ہیں، فرمانبرداری وہاں ہو سکتی ہے جہاں پر کہ زندہ ہادی ہو۔ اسماعیلی مذہب میں ہی زندہ ہادی ہے لہٰذا یہاں پر تازہ بہ تازہ فرمانبرداری ہوتی رہتی ہے۔ فرمانبرداری کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کسی گزشتہ قانون کی تابعداری کی جائے، فرمانبرداری کا مقصد یہ ہے کہ فرمانبرداری ایسی ہو کہ وہ تازہ بہ تازہ ارشادات سے رُجوع کریں اور تازہ بہ تازہ فرمانبرداری ہو، یہ بات بھی اسماعیلی مذہب میں ممکن ہے۔ لہٰذا اگر عدل وانصاف سے کام لیا جائے اور اگر سچ پوچھا جائے تو اسلام کے جو معنی ہیں وہ اسماعیلی مذہب میں صحیح ہیں۔ جب سب باتیں یہاں پر ہیں تو افسوس کا مقام ہوگا کہ اگر اسماعیلی جیسا کے چاہیے ترقّی نہ کریں۔ اسماعیلیوں کو دینی طور پر بھی اور دنیاوی طور پر بھی ترقّی کرنی چاہیے۔ اِس کے علاوہ ایک بات اور سنیں، رسول اللہؐ کے زمانے کا قیاس کریں کہ رسول اللہؐ کا زمانہ کیسا تھا؟ رسول اللہ کے زمانے میں صحیح اسلام تھا، حقیقی اسلام تھا اور اسلام کی ساری خوبیاں کہاں تھیں؟ اسلام کا مرکز کیا تھا؟ وہ آنحضرتؐ تھے۔ اسلام کی جتنی تعریف کی جاتی ہے وہ آنحضرتؐ کی وجہ سے ہے اور آنحضرتؐ کی ذاتِ عالی صفات اسلام کا مرکز تھی، اسلام کی تمام تر خوبیاں آنحضرتؐ میں مجموع تھیں، صحیح معنوں میں آنحضرتؐ اللہ کی رسّی تھے، آنحضرتؐ بولنے والے قرآن تھے، آنحضرتؐ اسلامِ مجسّم تھے۔ آنحضرتؐ ایمانِ مجسّم تھے، ایمان کے پیکر تھے۔ جب اِس دلیل سے ہم کو پتا چلتا ہے اور اِس سے ایک زندہ ہادی کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے تو وہی بات آنحضرتؐ کے جانشین میں بھی ہونی چاہیے اور ہمارے نزدیک یہ تمام تر خوبیاں امامؑ میں موجود ہیں، اِس معنی میں اسلام کی خوبیاں اسماعیلی مذہب میں موجود ہیں۔

رہا سوال اِس بات کا کہ موجودہ وقت میں اسماعیلی مذہب کی جو شکل وصورت ہے وہ اُس اسلام سے کسی قدر مختلف نظر آتی ہے جو شروع میں تھا۔ تو اِس کا جواب یہ ہے کہ اگر آنحضرتؐ چودہ سو برس تک دُنیا میں زندہ ہوتے تو خود آنحضرتؐ بھی اسلام کو چلاتے چلاتے ایسا ہی کرتے جیسا کہ انہوں نے ۲۳ سال کے اندر کیا، تھوڑی تھوڑی ترمیمات کرتے آئے تھے۔ آپ تواریخ کو پڑھیں، قرآن کے ناسخ اور منسوخ کے نظریے کو سامنے رکھیں، ناسخ ومنسوخ کا کیا مطلب

ہے؟ ناسخ اور منسوخ کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے لوگوں کی حالت کے پیشِ نظر آگے کچھ ارشادات فرمائے تھے، بعد میں لوگوں کی وہ حالت نہ رہی، اُن کی ترقّی ہوئی، وہ بدل گئے تو اُن لوگوں کی وجہ سے، زمانے کی وجہ سے، ترقّی کی وجہ سے کچھ ارشادات کو خدا نے بدل دیا، اِس کو کہتے ہیں ناسخ اور منسوخ اور پیغمبر نے بھی ایسا کیا۔ آپ باور کریں اگر چودہ سو سال تک آنحضرتؐ زندہ رہتے تو لازمی بات ہے کہ اِن چودہ سو سالوں میں قرآن نازل ہوتا رہتا کیونکہ نبی پر تو ہر وقت وحی آتی رہتی ہے، تو اُس میں کتنی آیتیں منسوخ ہوتی اور کتنی آیتیں ناسخ ہوتیں اور رسول اللہؐ کے ارشادات میں بھی یہ بات ضرور ہوتی کہ آنحضرتؐ اگلے کسی ارشاد کو منسوخ کرتے اور لوگوں کی ترقّی اور زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے پیشِ نظر کچھ نئے ارشادات فرماتے، تو اِس کے نتیجے میں اب تک یہی (Position) ہوتی جو [آج] اسماعیلی مذہب کی ہے یا یہ مطلب کہ اگر رسولؐ خود ہی اِس زمانے تک زندہ ہوتے تو اُس میں بھی یہی بات ہوتی اور اُس کے جانشین نے بھی جو بات کی تو وہ بات بھی اُس صورتِ حال سے مختلف نہیں۔ خدا کے کام میں کوئی کمی تو نہیں آنی چاہیے، اگر رسولؐ کو اُس نے جسمانی طور پر اُٹھا لیا تو کیا ہوا؟ اُس کے جانشین نے بھی وہی کام کیا جو کرنا چاہیے، لیکن لوگ اِس مطلب کو، اِس فلسفے کو، اِس حکمت کو نہیں سمجھتے ہیں، کتنی صاف بات ہے مومنین کے لئے جن کا ایمان مضبوط ہے، جن کے دلوں میں شک نہیں ہے اُن کے لئے یہ بات بالکل صاف اور ستھری ہے، یہ بات اتنی صاف ہے جیسے دودھ اور جیسے دھوپ اور جیسے کسی صاف چشمے کا پانی ہو۔ اِس میں ذرا کدورت نہیں ہے، اِس میں ذرا بھی آلائش نہیں ہے، یہ بات بالکل صاف اور ستھری اور قابلِ فہم ہے۔ تو دُنیا کو اِس طرح ہونا چاہیے۔ چلئے! اسی ضمن میں ایک اور بات کریں گے آپ رسول اللہ سے اُس طرف کے زمانے کو لیں، آدمؑ سے لے کر آنحضرتؐ تک جو زمانہ گزرا اُس پر ذرا نظر رکھیں۔ چلیں! ہم ذہنی طور پر، تصوّراتی [طور] پر اُس زمانے میں جائیں گے، آدمؑ سے شروع کر کے آنحضرتؐ تک چلیں گے، زمانے کی رفتار کیسی رہی، تھوڑی تھوڑی تبدیلی ہوتی آئی، تو خدا کے قانون میں جو کچھ ممکن تھا وہی ہوا نا! خدا کی عادت میں جو کچھ تھا وہی ہوا کہ آدمؑ کے زمانے میں، نوحؑ کے زمانے میں، ابراہیمؑ کے زمانے میں، موسیٰؑ کے دور میں اور عیسیٰؑ کے زمانے میں تبدیلی ہوتی آئی، اُسی تبدیلی کو آنحضرتؐ کے بعد بھی جاری و برقرار رہنا چاہیے اور ہمارے نزدیک یہی بات ہے، اسماعیلی مذہب ایسا منطقی ہے، ایسا عقلی مذہب ہے اور یہ روشن دلائل پر قائم ہے، اِس کے اندر روشنی ہے لیکن کاش! کوئی جاننے والا جان لے [اگر] جاننے والا جانے تو اُس کے لئے ذرا بھی شک نہیں ہے۔

اب رہا ظاہری علم، تو ظاہری علم میں اتنا تضاد ہے [اُس میں] اتنی الجھنیں ہیں، اِس قدر اختلافات ہیں کہ کیا بتائیں، ہم کو ایسا دین نہیں چاہیے جو روایات اور کہانیوں پر قائم ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہمارا جو دین ہے اُس کی بنیاد عقل و منطق پر ہو اور زندہ ہادی کی ہدایتوں پر قائم رہے، قرآن پر قائم رہے، رسولؐ کے ارشادات پر قائم رہے اور آپ قرآن میں

دیکھیں گے، آپ کو ہدایت کے سلسلے میں تصوّرِ دائمیت ملے گا۔ قرآن کے اندر جتنی مثالیں ہیں، اُن تمام مثالوں کے اندر دائمیت کا تصوّر ہے۔ مثلاً خدا نے رسّی سے تشبیہہ دی ہے، نور کی تشبیہہ، ہادی کی تشبیہہ رسّی سے دی ہے، کہا ہے کہ ''حبلُ اللہ'' فرمایا ہے کہ: وَاعۡتَصِمُوۡا بِحَبۡلِ اللّٰهِ (۱۰۳:۳)۔ اِس تصوّر کا یہ مطلب ہے کہ اللہ کی رسّی جو اٹوٹ ہے، وہ کبھی ٹوٹنے والی نہیں ہے اور وہ ایسی ہے کہ ہر جگہ کو پہنچتی ہے اور تمام زمانے سے گزری ہوئی ہے، ازل سے لے کر ابد تک پہنچ رہی ہے، اُس کو مضبوطی سے پکڑو۔ ایک یہ بھی بتایا کہ مضبوطی سے پکڑنا، اِس سے یہ اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر کوئی ڈھیلا پنے سے پکڑے تو اُس کے ہاتھ سے رسّی پھسل جائے گی، بہت سے لوگوں کے ہاتھ سے خدا کی رسّی پھسل گئی ہے یعنی وہ رسّی ایسی نہیں ہے کہ ایک بار پکڑا تو پھر انسان کا ہاتھ جادو کے طور پر اُس کے ساتھ وابستہ رہے ایسا نہیں ہے، وہ رسّی پھسل بھی جاتی ہے، نکل بھی جاتی ہے۔ اِس لئے خدا نے کہا کہ تم رسّی کو مضبوطی سے تھام لینا، اِس امکانیت کے پیشِ نظر خدا نے فرمایا کہ انسان کا ہاتھ جو ہے وہ اُس سے چھوٹ جاتا ہے۔ کیا اِس رسّی میں دائمیت کا تصوّر نہیں ہے؟ کیا اِس کا یہ اشارہ نہیں ہے کہ وہ رسّی ہمیشہ ہے، کوئی زمانہ اِس رسّی سے خالی ہوسکتا ہے، ازل میں یا ابد میں کبھی وہ رسّی غائب ہوسکتی ہے یا یہ دائمیت کا تصوّر ہے، میں تو یہ کہوں گا کہ دائمیت کا تصوّر ہے۔ چلئے یہ ہوگیا۔

ایک جگہ پر خدا نے نور کی، ہادی کی تشبیہہ درخت سے دی ہے فرمایا ہے کہ: وہ درخت ایسا ہے کہ اُس کی جڑیں ہمیشہ کے لئے مضبوط ہیں فرمایا ہے کہ اس کی جو شاخیں ہیں وہ آسمان کو پہنچی ہوئی ہیں، اور وہ بغیر موسم کے ہمیشہ ہر (Season) میں پھل دیتا ہے (۱۴: ۲۴۔ ۲۵)۔ کیا اِس میں امامؑ کی مثال نہیں ہے؟ دائمیت کا تصوّر نہیں ہے؟ نہیں کہا گیا ہے کہ امام ہمیشہ دُنیا میں ہوگا۔ ایک جگہ پر نور کی مثال دیتے ہوئے خدا نے فرمایا ہے کہ: خدا کے نور کو کسی زمانے میں کوئی فرد، کوئی قوم، کوئی انسان نہیں بجھا سکتا ہے (۶۱:۸)۔ کیا اِس میں دائمیت کا تصوّر نہیں ہے؟ کیا یہ امامؑ کی مثال نہیں ہے؟ یہ امامؑ کی مثال ہے [اس میں] ہمیشگی کا تصوّر ہے اور سورۂ کوثر (۱۰۸: ۱۔ ۳) میں فرمایا گیا ہے کہ: پیغمبر کے بعد اسلام کا کام، پیغمبر کا کام ایک ایسے شخص کے وسیلے سے، چلتا رہے گا کہ وہ شخص ایسا ہے کہ اُس کی بہت سی اولاد ہیں، اُس کی اولاد کا ایک سلسلہ چلے گا اور قیامت تک چلے گا، کیا یہ دائمیت کا تصوّر نہیں ہے؟ کیا یہ ایک واضح مطلب نہیں ہے؟ اور اسی طرح صراطِ مستقیم کا تصوّر ہے۔ تو یہ لازمی بات ہے کہ جب تک قرآن ہے تب تک آلِ ابراھیمؑ کا سلسلہ قائم اور جاری ہے۔ جب تک قرآن ہے تو قرآن کا جاننے والا اور اُس کی حکمت جاننے والا ہے اور جب تک قرآن کا جاننے والا ہے یعنی امام تو اُس کی روحانی بادشاہی ہے، تو یہ چیزیں قرآن کے ساتھ لازم و ملزوم ہیں، یہ بھی ایک دائمیت کا تصوّر ہے اور فرمایا گیا ہے کہ: لَاۤ اِكۡرَاهَ فِى الدِّيۡنِ ۙ قَد تَّبَيَّنَ الرُّشۡدُ مِنَ الۡغَىِّ ۚ فَمَنۡ يَّكۡفُرۡ بِالطَّاغُوۡتِ وَيُؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسۡتَمۡسَكَ بِالۡعُرۡوَةِ الۡوُثۡقٰى لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ وَاللّٰهُ سَمِيۡعٌ عَلِيۡمٌ (۲۵۶:۲) اور جو بتوں سے انکار کر کے خدا پر ایمان

لائے اُس نے گویا مضبوط وثیقے [حلقے] میں ہاتھ ڈالا ہے، اب اُس کا ہاتھ ہمیشہ رہے گا اور وہ گرنے والا نہیں ہے۔ یہ بھی دائمیت کا تصوّر ہے۔

بہر حال اسماعیلی مذہب علم کا مذہب ہے، حکمت کا مذہب ہے، دانشمندی کا مذہب ہے، ترقّی کا مذہب ہے، یہ تقلید کا مذہب نہیں ہے، کورانہ تقلید کا مذہب نہیں ہے، امامؑ ہر وقت زور دیتے ہیں علم حاصل کرنے پر، توجّہ دینے پر اور ایسے بہت سے فرامین ہیں جن سے کہ علم کی حوصلہ افزائی ہوتی ہے، جن سے کہ جاننے کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ تو اب اِس وقت بہت زیادہ ضرورت ہے آپ ایسے نوجوان نسل علم کے لئے کوشش کریں اور اپنی جماعتوں کو فائدہ دلائیں، ابھی آپ کا وقت ہے، آپ بہت کام کر سکتے ہیں، منصوبہ بنائیں کہ پہلے علم حاصل کریں اور پھر جماعتوں کو منتقل کریں، اِس نیک نیتی سے مولا بہت راضی رہے گا اور آپ کو علم میں بہت مدد کرے گا۔ دُعا ہے کہ مولا آپ سب سے راضی رہے، آمین! مولا آپ سب کو نوازے، آمین! مولا آپ سب کی مشکلات کو آسان کرے، آمین! مولا آپ سب عزیزوں کی بلاؤں کو رَد کرے، آمین! بیماریوں سے آپ کو شفا عطا کرے، آمین! آپ کی نیک مُرادوں کی تکمیل فرمائے، آمین! آپ کو دونوں جہان کی سرفرازی اور کامیابی عطا کرے، آمین! اور آپ کو خداوند دیدارِ ظاہر اور دیدارِ باطن کی دولت سے نوازے، آمین! آپ ہمیشہ کامیاب رہیں اور کامران رہیں، آمین! یاربَّ العالمین!! شکریہ۔

میرے کہنے کا حوالہ دیتے ہوئے انہوں نے پوچھا کہ آپ نے کہا تھا کہ اِس اشرف المخلوقات کے معنی میں انسان یعنی مومن فرشتوں سے بھی آگے جا سکتا ہے اور اِس سلسلے میں انہوں نے کہا کہ آپ کے کہنے کے مطابق اِس کی مثال آپ نے آدمؑ سے پیش کی تھی، پھر انہوں نے اپنا سوال یہ پیش کیا کہ اگر یہ بات صحیح ہے تو انسان کیا جمالی فرشتوں سے آگے جاتا ہے یا کہ جلالی فرشتوں سے آگے جاتا ہے؟ جب کہ ہم نے کہا تھا کہ مومن کے سامنے یہ واقعہ [پیش] آتا ہے کہ وہ اپنے ذاتی فرشتوں سے ملاقات کرتا ہے اور ذاتی فرشتوں کا وہ مسجود بن جاتا ہے یا ذاتی فرشتوں کو وہ تعلیم دیتا ہے، میں نے کبھی کہا تھا، تو انہوں نے اِس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اِس افضلیت میں یہ بات کہاں تک پہنچتی ہے کہ آیا بندۂ مومن صرف جمالی فرشتوں سے آگے بڑھتا ہے یا جلالی فرشتوں سے بھی [آگے بڑھتا ہے]۔ اِس کے لئے میرا جواب ہے کہ بے شک پہلے مرحلے پر بندۂ مومن کا واسطہ جمالی فرشتوں سے پڑتا ہے، وہ اپنی شخصیت کے جمالی فرشتوں کو تعلیم دیتا ہے لیکن اُس کے بعد ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جس میں کہ وہ جلالی فرشتوں سے بھی آگے بڑھ سکتا ہے کیونکہ یہ جو ذاتی دُنیا میں اور اپنی رُوحانیت کی دُنیا میں جو جمالی فرشتوں کو تعلیم دیتا ہے یہ ایک مثال ہے اُس اعلیٰ حقیقت کی اور اُس کی امکانیت کی کہ آگے چل کر یہ انسانِ کامل کی طرح جلالی فرشتوں سے بھی آگے گزرتا ہے، یہ اُس کی مثال ہے۔ تو میرا جواب یہ ہے۔

بے شک عقلِ کُل ایک طرح سے دیکھا جائے تو وہ سب سے اُوپر کا درجہ ہے اور وہ کسی سے علم لینے والا نہیں ہے لیکن میں نے جو جواب دیا وہ جواب اِس سے بھی اُوپر کو جاتا ہے، وہ اِس طرح کہ جہاں ذاتِ باری [یا] باری سبحانہٗ وتعالیٰ ہے اُس مقام کو دیکھا جائے تو وہ مرتبہ اتنا بلند ہے کہ اُس نے عقلِ کُل کو پیدا کیا، اِسی پیدا کرنے کے عنوان میں اُس کو علم بھی دیا اور اُس کو عقلِ کُل کے مرتبے پر بنایا۔ جیسے میں نے کبھی سورۂ رحمان کی تشریح کرتے ہوئے کہا تھا کہ: الرَّحْمٰنُ عَلَّمَ الْقُرْآنَ (۵۵:۱۔۲)۔ میں نے خود وہاں کئی سوالات کو اُٹھا کے اور اُن سوالات کی روشنی میں یہ کہا تھا کہ رحمان نے عقلِ کُل کو قرآن بنایا اور قرآن سکھایا، اسی طرح انسان کا جو درجہ ہے وہ عقلِ کُل سے بھی اُوپر کو جاتا ہے اور مونو ریلزم کے یہ معنی ہیں، جہاں سب سے بڑا مرتبہ ہے، جس کو خدا کہا جاتا ہے اُس مقام پر بھی انسان کی ایک انائے علوی ہے اور اُس انائے علوی میں انسان یہ سب کچھ کرتا ہے۔

میں اپنی دُوسری تعلیمات کی طرف اشارہ کرتا ہوں، میں نے کبھی کہا تھا کہ عقلِ کُل، نفسِ کُل، ناطق اور اساس یہ بہشت کی چار نہریں ہیں اور مومن کی جنّت وہ ہے کہ جس جنّت کے تحت یہ چار نہریں چلتی ہیں، جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ (۲:۲۵)۔ مومن ایسی جنتوں میں ہوگا جن کے اندر چار نہریں چلتی ہیں، تو یہ چار نہریں اُس جنّت کے اندر میں چلتی ہیں، تو اُس کی ماتحتی میں عقلِ کُل بھی جب آیا تو انسان کی انا خالقیت کی صفت رکھتی ہے، اُس معنی میں وہ جلالی فرشتوں سے بھی اُوپر جا سکتا ہے۔ مجھے یاد آتا ہے ایک فرمان، وہ فرمان اتنا عالیشان تھا کہ آپ کو کہیں ملے گا اُس میں یہ ہے کہ: مومن آگے جا سکتا ہے، وہ سلمان فارسی کی طرح ہو سکتا ہے، وہ اہلِ بیت کی طرح ہو سکتا ہے [کچھ مندرا۔ ۲۸۔۱۱۔ ۱۹۰۳] مومن اُس سے بھی آگے جا سکتا ہے [دارالسّلام، ۲۹۔۹۔ ۱۸۹۹] تو اِس میں کچھ لوگوں کو حیرت ہوگی، مومن اور مومن کا اہلِ بیت سے آگے جانا! اور آگے کہاں جانا! ایک شخص نے بڑا اعتراض اُٹھایا لیکن ہم سمجھ گئے کہ اِس کے اندر کیا معنی ہیں اور ابھی ابھی میں نے بات کی تھی کہ فرمان کے سمجھنے کے لئے بھی علم چاہیے اور اِس میں سخت علم کی ضرورت ہے جو امامؑ نے فرمایا کہ: مومن اہلِ بیت سے بھی آگے جا سکتا ہے، تو اہلِ بیت کن کو کہا جاتا ہے، کن حضرات کو کہا جاتا ہے؟ وہ محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کا نام ہے اور مومن اگر اہلِ بیت سے آگے جاتا ہے تو اِس کے معنی یہ ہوئے کہ اِن حضرات سے وہ آگے جاتا ہے، تو اِس کے کیا معنی ہیں؟ اِس کے یہ معنی ہیں میں بتاؤں گا اِس اچھی اور پیاری مجلس میں ضرور بتاؤں گا، یہ بہت بڑا بھید ہے وہ یہ کہ یہ جو مرتبے ہیں یہ امامؑ کے ظاہری مرتبے ہیں، امامؑ کا باطنی مرتبہ آگے ہے اُس اگلے مرتبے تک مومن کو جانا ہے، وہ مرتبہ عقلِ کُل سے اُوپر ہے، اِس مرتبے میں امامؑ نے عقلِ کُل، نفسِ کُل، ناطق اور اساس کی حیثیت میں کام کرنا ہے اور اُس انائے علوی میں امامؑ کا آخری مرتبہ ہے اور اُس آخری مرتبے میں مومن کا مرتبہ بھی ہے، جہاں پر کہ مونو ریلزم ہے۔ تو دیکھا آپ نے کہ مومن کس طرح عقلِ کُل سے آگے جاتا ہے اور اگر کسی کتاب کا حوالہ چاہیے تو آپ وجہ دین حصّہ اوّل کو

سامنے رکھیں، اُس میں شاید علم کے بیان میں پیر صاحب ؑ نے یہ فرمایا ہے کہ انسان کا رُجوع کہاں ہوتا ہے؟ کُن تک ہوتا ہے، امرِ کُن تک اور امرِ کُن عقلِ کُل سے اُو پر ہے [کتاب وجہ دین حصّہ اوّل، کلام نمبر ۳، ص: ۵۱]۔ بس انسان کی رسائی امرِ الٰہی تک ہے، امر! کُن! اور کُن نے عقل کو وجود دیا، تو اِس معنی میں عقلِ کُل قلمِ الٰہی ہے اور مومن کی انا قلمِ الٰہی سے بھی اُو پر ہے جہاں پر کہ مونو ریلزم ہے۔ یہ آپ کے سوال کا جواب ہے۔

ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ق س کا پُرحکمت بیان

عنوان: رُوح اور رُوحانیت

کیسٹ نمبر: ۲۸ تاریخ: دسمبر، ۱۹۷۸، کراچی

Click here for Audio

مصلحت یہ ہے کہ ہم رُوح اور رُوحانیت کے بارے میں کچھ گفتگو کریں کیونکہ "رُوح اور رُوحانیت" اسلام میں سب سے بڑا موضوع ہے۔ اِس لئے کہ معرفتِ ذات ہی سے معرفتِ خدا حاصل ہوتی ہے اور اِس کے بغیر معرفت نہیں ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی معرفت انسان کی اپنی معرفت میں ہے اور معرفت رُوح کے پہچاننے کا نام ہے تو پھر رُوح اور رُوحانیت کی طرف کیوں توجّہ نہ دیں، رُوح اور رُوحانیت ایک ایسا موضوع ہے کہ اِس میں تمام موضوعات خود بخود محدود ہوجاتے ہیں۔ کیونکہ اللہ کی معرفت میں تمام چیزیں محدود ہیں یا یوں کہنا چاہیے کہ اللہ کی معرفت ایک ایسا موضوع ہے جو کہ تمام موضوعات پر حاوی اور محیط ہے اِس لئے ہمیں رُوح اور رُوحانیت کے موضوع کی طرف توجّہ دینے کی ضرورت ہے۔ رسولِ اکرمؐ نے ارشاد فرمایا ہے کہ: "مَنْ عَرَفَ نَفْسَهُ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهُ" رُوح کی شناخت پروردگار کی شناخت ہے اور ایک اور حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ: "اَعْرَفُكُمْ بِنَفْسِهِ اَعْرَفُكُمْ بِرَبِّهِ" تم میں سے جو زیادہ اپنے نفس کو پہچانتا ہے وہی زیادہ اپنے پروردگار کو پہچان سکتا ہے لیکن چونکہ معرفت ایک اعلیٰ مقام کا نام ہے اِس لئے معرفت کا یہ درجہ ظاہری کوششوں سے حاصل نہیں ہوسکتا، اِس لئے کہ معرفت ایک عمل کا نام ہے، ایک فعل ہے، ایک کام ہے اور جس طرح اسلام کا دُوسرا نام صراطِ مستقیم ہے اور اِس صراطِ مستقیم کے تصوّر میں معرفت کا مرحلہ سب سے اخیر میں آتا ہے یعنی شریعت، طریقت، حقیقت اور اخیر میں معرفت۔ اسی طرح انسان کی خود شناسی جس میں خدا شناسی ہے، وہ بھی سب سے اخیر میں ہے اور اِس منزل تک بندۂ مومن علم و عمل کے ذریعے سے پہنچ سکتا ہے یا یوں کہنا چاہیے کہ صراطِ مستقیم جو ایک مسلمان کے لئے ایک مسافرت اور ایک راستے کی حیثیت سے ہے اُس پر ایک نیک مسلمان، ایک حقیقی مومن علم و عمل سے گامزن ہوسکتا ہے اور اِس علم و عمل کے نتیجے میں معرفت کے مقام پر فائز ہوسکتا ہے۔ جب معرفت کے مقام تک مومن پہنچے تو اُس وقت وہ دیدۂ دل کے مشاہدات سے اپنی ذات کو پہچان سکتا ہے جب وہ اپنی ذات کو پہچانے گا تو اُسی کے ساتھ ساتھ خدا کو بھی پہچان لے گا۔

معرفت اگرچہ ایک لفظ ہے لیکن یہ لفظ اپنے معنوں کے لحاظ سے اِس قدر بلند ہے اور اِس قدر عظیم ہے کہ اِس کی معنویت میں تمام ضروری باتیں سمو جاتی ہیں۔ لیکن افسوس کا مقام ہے کہ لوگ معرفت کے معنوں کو جس طرح سے سمجھ لینا

چاہیے اُس طرح سے نہیں سمجھ پاتے، حالانکہ اِس ایک لفظ میں سب کچھ ہے یعنی اِس کا معنوی تقاضا یہ ہے کہ معرفت کے مقام پر خدا کے سارے بھید حاصل ہوتے ہیں۔ ازل اور ابد کی حقیقتوں کا پتا چلتا ہے، لوحِ محفوظ یعنی لوح وقلم کی معرفت حاصل ہوتی ہے، فرشتوں کی شناخت حاصل ہوتی ہے، تخلیقِ کائنات کے بھیدوں سے آگہی ہوتی ہے، انبیاء علیہم السّلام کے رُوحانی معجزات کا پتا چلتا ہے، وحی جیسی اعلیٰ سے اعلیٰ حقیقت کی خبر ملتی ہے، بلکہ وحی کی کیفیات کا مشاہدہ ہوتا ہے، جبرائیل، میکائیل، اسرافیل، عزرائیل کی شناخت حاصل ہوتی ہے، قیامت جو قرآن کا سب سے مخفی موضوع ہے اُس کا عملی طور پر تجربہ ہوتا ہے۔ ایک حدیثِ قدسی کے مطابق اللہ نے جو فرمایا ہے کہ: ''کُنْتُ کَنْزاً مَخْفِیًّا'' وہ ایک مخفی خزانہ تھا تو اُس گنجِ مخفی کا انکشاف ہوتا ہے، زندگی اور موت کی حقیقتوں سے آگہی ہوتی ہے، رُوح جو اللہ تعالیٰ کی ایک عظیم مخلوق ہے یا کہ کہنا چاہیے کہ رُوح اللہ تعالیٰ کے نور کا ایک عکس ہے اُس کا مشاہدہ ہوتا ہے، عالمِ آخرت جو اِس دُنیا کے برعکس ہے سامنے آتا ہے، دوزخ [اور] بہشت کی حقیقتوں کا علم ہوتا ہے اور [اُس کی] عملی طور پر شناخت ہوتی ہے، خدا کی وحدانیت اور اُس کے اوصاف کا علم ہوتا ہے، اللہ پاک نے قیامت اور بہشت سے متعلّق جو وعدے کئے ہوئے ہیں اور جو نعمتیں مومن کو ملنے والی ہیں اُن کا عملی طور پر پتا چلتا ہے۔

غرض یہ کہ معرفت ایسی چیز ہے کہ اُس سے کوئی چیز باہر نہیں ہے، یہاں تک کہ ہر چیز کی رُوح ہے اور پتھر کی بھی رُوح ہے، پانی کی بھی رُوح ہے، ہَوا کی بھی رُوح ہے، درخت کی [بھی] رُوح ہے، جانوروں کی تو خود رُوح ہے، انسانوں کی تو خود رُوح ہے اور کوئی چیز نہیں جس کی رُوح نہ ہو۔ تو تمام چیزوں کی رُوحوں سے ملاقات ہوتی ہے اور اُن کے بھیدوں کا علم ہوتا ہے اور اُن کے بھید کُھلتے ہیں۔ اِن تمام باتوں کی شہادتیں قرآن میں بھی موجود ہیں، قرآن کے ایک مقام پر ارشاد ہوا ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ: وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَحَشَرْنَا عَلَیْهِمْ كُلَّ شَیْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِیُؤْمِنُوْٓا (۶:۱۱۱)۔ اگر اُن لوگوں سے مُردوں کی اور زندوں کی رُوحیں باتیں کریں اور سب فرشتے اُن کے سامنے آئیں اور جنّ وانس اُن سے بولیں تو پھر بھی وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ دیکھنے سے یہ بات صرف ایک مثال جیسی لگتی ہے لیکن جاننے والا جانتا ہے کہ یہ صرف مثال نہیں ہے بلکہ حقیقت بھی ہے۔ یہ ایک امکانی واقعہ ہے تو مُردوں کی رُوحیں اور زندوں کی رُوحیں، فرشتے اور جنّات وغیرہ مختصراً یہ کہ جہاں معرفت کے سلسلے میں اللہ کا دیدار ہوتا ہے اور اُس کے دیدار کا مقصد یہ ہے کہ معرفت حاصل ہو کہ جب سب سے باطن اللہ ہے تو اللہ اِس معرفت کے سلسلے میں بندۂ مومن پر ظاہر ہو جاتا ہے اور اِس ظہور میں اپنی شناخت دیتا ہے تو کیا کوئی مومن یہ گمان کر سکتا ہے کہ ایسے میں کوئی چیز بندۂ مومن کی نظر سے پوشیدہ رہ سکتی ہے جبکہ سب سے عظیم اللہ ہے، سب سے اکبر اللہ ہے، سب سے بڑا اللہ ہے، سب سے اعلیٰ اللہ ہے۔ تو اِس کے باوجود اِس معرفت کے نتیجے میں وہ بندۂ مومن کی رُوحانی نگاہ کے سامنے آتا ہے تو کیا ایسے میں کسی کو یہ گمان بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ دُوسری چیزیں مومن کی نظر سے اوجھل رہیں، کچھ دُوسری حقیقتیں مومن سے پوشیدہ رہیں یہ ہرگز ایسا نہیں ہے۔

خدا کی معرفت کے سامنے کسی چیز کی کوئی اہمیت نہیں، سب سے بڑا بھید خدا ہے۔ یہ تو آسان بات ہے، ایک نیک مومن آسانی سے سمجھتا ہے کہ بھیدوں میں سب سے بڑا بھید اللہ ہے، خود اللہ یعنی اللہ کی معرفت کہ وہ کس طرح ہے اور سب سے مشکل چیز (Unity) ہے [یعنی] (Unity of God) خدا کی وحدانیت ہے۔ جب باور کیا جاتا ہے کہ اللہ کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور اُس کی یکتائی کا پتا چلتا ہے تو کیا ایسے میں کوئی انسان یہ گمان بھی کرسکتا ہے کہ کچھ بھید اِس کے سوا اِیسے ہیں کہ جن تک مومن پہنچ نہیں سکتا، یہ بات نہیں ہے۔ تو اِس لئے میں نے کہا ازل جس وقت کا نام ہے، ابد جس زمانے کا نام ہے وہ بھی، اور لوح وقلم جن حقیقتوں کا نام ہے وہ بھی، فنا اور بقا جس چیز کا نام ہے وہ بھی، سب چیزیں اور سب حقیقتیں مومن کے لئے منکشف ہوجاتی ہیں، اور کوئی حقیقت مومن پر مخفی نہیں رہتی یہ بات الگ ہے کہ مومن معرفت کے کس مقام تک پہنچ چکا ہے، یہ بات دُوسری ہے کہ [کوئی] مومن معرفت کے کسی ابتدائی مرحلے میں رہ گیا [ہو]۔ لیکن جب عارف صحیح معنوں میں عارف ہے جب معرفت مکمّل ہوجاتی ہے تو اِس تکمیل کے ساتھ ساتھ تمام معرفتیں اِس ضمن میں آجاتی ہیں، کیونکہ اللہ کی معرفت سب سے اُونچی ہے اور اشیاء کی معرفتیں اللہ کی معرفت کے تحت ہیں اور یہ ایک سلسلہ ہے یہ ایک راستے کی طرح ہے یا ایک زینے کی طرح ہے۔

تو اِس لئے ذیلی معرفتیں اللہ کی معرفت کے حصول کے دوران حاصل ہوتی رہتی ہیں اور اصولاً ایسا [ہی] ہونا چاہیے ایسا نہیں کہ خدا کی مکمّل معرفت ہو پھر اُس کے وسیلے سے دُوسری چیزیں حاصل ہوجائیں۔ بلکہ یہ ہے کہ خدا کی ہستی کے لئے اقرار اور راہِ اسلام پر آگے بڑھنے کے ساتھ ساتھ اشیاء کی معرفتیں حاصل ہوتی رہتی ہیں، تو رُوح اور رُوحانیت کی بات تھی کہ رُوح کی شناخت کچھ اِس معنی میں ہے۔ اِس کو خودشناسی بھی کہتے ہیں، خداشناسی بھی کہتے ہیں امام شناسی بھی اسی مطلب کا [ایک] نام ہے اور پیغمبر کے پہچاننے کے بھی یہی معنی ہیں اِس میں سب معرفتیں مل کر ہیں۔ اِس لئے قرآن میں فرمایا گیا تھا جبکہ حضورؐ سے لوگوں نے کوئی سوال کیا: وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الرُّوْحِ قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّيْ وَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِلَّا قَلِيْلًا (۱۷:۸۵)۔ وہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ رُوح کی حقیقت کیا ہے آپ اُن سے فرمادیجئے کہ رُوح میرے پروردگار کے عالمِ امر سے ہے اور اِس کی حقیقت سمجھانے کے لئے تمہارے پاس کوئی علم کا (Background) نہیں ہے، مگر تھوڑا سا [علم] ہے۔ تو مطلب لوگوں کے پاس جو کچھ دُنیوی علم تھا وہ علم اِس قدر کافی نہیں تھا کہ رُوح کی حقیقتوں کو اُس کی مدد سے سمجھا دیا جائے۔

اِس سے معلوم ہوا کہ رُوح کی معرفت بہت ہی اعلیٰ ہے جس کو ایک کم علم شخص سمجھ نہیں سکتا ہے۔ دیکھا جائے اور سوچا جائے تو اللہ تعالیٰ نے عجائبات وغرائبات سے پُر جو چیز پیدا کی ہے وہ رُوح ہے اور اللہ جس طرح حکیم ہے، حکمت والا ہے تو اِس کے مطابق اللہ نے جو چیز سب سے اعلیٰ بنائی ہے وہ رُوح ہے۔ میرا مقصد [یہ] ہے کہ اللہ کی قدرت کی ساری خوبیاں اور اُس کی ساری حکمتیں رُوح سے ظاہر ہیں۔ جس طرح دُنیا میں ایک کاریگر جتنا کاریگر ہو اور جتنا اُس میں ہُنر ہو تو وہ

ہُنر اُس کی کسی تخلیق سے، اُس کی کسی بنائی ہوئی چیز سے ظاہر ہو جاتا ہے اور دُنیا میں لوگ جو چیزیں بناتے ہیں تو وہ چیزیں لوگوں کی قابلیت کی نشاندہی کر دیتی ہیں ۔کوئی ملک کتنا ترقّی یافتہ ہے اُس کا پتا اُس ملک کی مصنوعات سے چلتا ہے،کوئی سائنسدان کس قدر سائنس کو جانتا ہے اُس کا پتا اُس کی تھیوری سے اور اُس کی بنائی ہوئی چیز سے چلتا ہے اِس طرح خدا کتنا عظیم ہے اور وہ کیسا حکیم ہے؟ خدا کی کاریگری کیسی ہے؟ اُس کا پتا رُوح کے دیکھنے سے چلتا ہے لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ دُنیا کے اندر جتنی چیزیں پیدا کی گئی ہیں وہ سب اللہ کی پیدا کی گئی ہیں لیکن اس میں ذرا تحمل ہے یا سوچنے کی بات ہے کہ آیا یہ بات سچ ہے کہ خدا نے اپنے ہاتھ سے دُنیا کی، کائنات کی ہر چیز کو پیدا کیا ہے، کیڑے بھی اُسی نے پیدا کئے، مکھّی بھی، چیونٹی بھی اور ایسی مخلوقات بھی جو ناقص ہیں کمزور ہیں تو کیا یہ خدا کے لئے عیب نہیں ہے کہ ایسا حکیم اور ایسا کامل اور مکمّل خدا اور خالق دُنیا کی ایسی ایسی ناقص چیزوں کو پیدا کر دیتا ہے۔

یہ بات نہیں ہے [چیزیں] منسوب اسی خدا سے کی جاتی ہیں کہ جس نے پیدا کی ہیں، ٹھیک ہے ۔لیکن اصلاً دیکھا جائے تو ہر چیز خدا کی پیدا کی ہوئی نہیں ہے ۔شاید یہ بات آپ کے لئے نئی ہو شاید اِس سلسلے میں آپ کچھ سوالات بھی کریں تو اِس کی کوئی فکر نہیں ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ خدا ''احسنُ الخالقین'' ہے یہ قرآن کا ایک لفظ ہے: فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ (۲۳:۱۴)۔بڑا بابرکت ہے اللہ جو تمام خالقوں سے بہتر ہے۔وہ ''احسنُ الخالقین'' ہے تو اِس کے کیا معنی ہیں؟ اِس کے یہ معنی ہیں کہ اُس کے تحت فاعل ہیں. بہت سے فاعل ہیں، کام کرنے والے ہیں،، بہت سی قوتیں ہیں. بہت سی طاقتیں ہیں جن کی وجہ سے بہت ساری چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں ۔مادّی طور پر آپ سوچیں کہ سورج کیا کیا کام [سر] انجام دیتا ہے،. بہت سی چیزیں سورج سے پیدا ہو جاتی ہیں، تو سورج کو خدا نے پیدا کیا ہے لیکن سورج خدا کے پیدا کئے جانے کے بعد. بہت سی چیزوں کو پیدا کرتا ہے۔سورج ہی بارش برساتا ہے آپ سوچیں! سورج کی وجہ سے ہَوا چلتی ہے، سورج کی وجہ سے کوئی چیز سڑ جاتی ہے اور اُس سڑن میں کیڑے بھی پیدا ہو جاتے ہیں ۔کیا یہ شرکت ہے خدا کی تخلیق میں؟ یا کہ خدا نے خود اِن چیزوں کو یہ صلاحیتیں عطا کر رکھی ہیں تو اِسی طرح سے رُوحانیت میں بھی ایسی ایسی قوتیں ہیں جن کی وجہ سے چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں اور خدا کی خلقت مخصوص ہے۔خدا کی تخلیق اگر مخصوص نہ ہوتی تو آدمؑ کے بارے میں [یا قصّے میں] کیوں اُس نے فرمایا کہ: جس کو میں نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا ہے اُس کو تم نے کیوں سجدہ نہیں کیا (۷:۱۲)۔یہ خطاب ابلیس سے ہوا تھا اِس مقام پر سوچنے کا تقاضا ہے اللہ جو فرماتا ہے کہ جس چیز کو میں نے اپنے ہاتھ سے بنایا ہے تو اگر سب چیزوں کو خدا یکسانیت کے ساتھ پیدا کرتا ہے تو آدمؑ کے معاملے میں یہ تخصیص کیوں ہے؟ اور یہ کیوں فرماتا ہے کہ میں نے اپنے ہاتھ سے جس چیز کو پیدا کیا، اِس سے پتا چلتا ہے کہ آدمؑ کو خدا نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا تھا۔اِس سے مقصود کیا ہے؟ مقصود یہ ہے کہ خدا نے جو روح کو پیدا کیا ہے تو وہ بہت عجیب ہے، لیکن ہم اِس مقام پر یہ بھی کہتے ہیں کہ ہوسکتا ہے کہ کسی رُوح کی تخلیق

ابھی تک نہیں ہوئی ہو اور رُوح کی [جو] تخلیق ہوگی تو بہت اعلیٰ ہوگی اور رُوح کی تخلیق ہوگی تو بہت اچھی ہوگی۔ رُوح کی تخلیق یہ نہیں کہ ہم چلتے ہیں، کھاتے پیتے ہیں، بولتے ہیں، حرکت کرتے ہیں، تو جانور بھی حرکت کرتے ہیں رُوح کی تخلیق صحیح معنوں میں اُس وقت ہوگی کہ ہم خود کو خدا کے حضور میں پیش کریں، خصوصی طور پر عبادت بندگی کریں اور ذکر کریں صبح اُٹھیں ایک گھنٹہ سختی کے ساتھ محنت کریں۔

حدیثِ قدسی میں ہے کہ: نوافل کے ذریعے خدا مومن کا پاؤں بھی بن جاتا ہے تو اِس میں خدا کے الفاظ میں یہ دُعا کی صورت میں ہے اِس میں بندے کو اِسی چیز کے لئے درخواست کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ تو یہ بات کون سی چلتی ہے وہی چلتی ہے کہ خدا کی تخلیق میں یہ فضیلت ہوتی ہے کہ انسان کے پاؤں میں بھی نور آتا ہے اور سارا پاؤں نور ہی نور بن جاتا ہے نورِ مجسّم بن جاتا ہے تو خدا کی تخلیق یہ ہے، اِس لئے کہ وہ ''احسنُ الخالقین'' ہے، خالقین میں سے بہترین ہے اُس کی بنائی ہوئی چیز بہت ہی اعلیٰ ہے، اُس کی بنائی ہوئی چیز اُس سے ملتی ہے [یعنی] وہ نور کو بناتا ہے؟ جب بھی وہ مومن کی رُوحانی تخلیق فرمائے گا تو یہ تخلیق نور کی ہوگی۔ اِس تشریح سے بھی یہ مطلب ظاہر تھا کہ خدا جب ہاتھ بنے گا، پاؤں بنے گا، زبان بنے گا تو [چونکہ] خدا نور ہے تو انسان کے تمام اعضاء میں نور ہی نور قرار پائے گا، اور جب خدا کسی کی زبان بن جاتا ہے تو اُس کا بولنا خدا کا بولنا ہوتا ہے، اُس کا سننا خدا کا سننا ہوتا ہے، اُس کا دیکھنا خدا کا دیکھنا ہوتا ہے، اُس کا چلنا خدا کا چلنا ہوتا ہے۔ اِس سے ہم کو دو تصوّر ملتے ہیں، ایک تصوّر یہ کہ ہمارا یہ جو تصوّر ہے کہ امامِ عالی خدا کا مظہر ہے [وہ] صحیح ہے، اور دُوسرا تصوّر یہ کہ امامؑ کے بعد اُس کے تابعداروں اور فرمانبرداروں کو بھی اپنی اپنی کوشش کے مطابق یہ فضیلت نصیب ہوتی ہے۔ تو اِس ارشاد کا سب سے زیادہ فائدہ اسماعیلیوں کو ملتا ہے کہ اُدھر سے اُن کے امام کے متعلّق جو تصوّر ہے وہ بھی دُرست ہوتا ہے، جب عام مومنین کے لئے خدا سے رسائی ممکن ہے تو ایک برگزیدہ ہستی کی رسائی تو بالکل ہی حقیقت ہے۔

اچھا! بہرحال رُوح کی بات چل رہی تھی اور رُوح کی تخلیق کی بات چل رہی تھی اور اِس سلسلے میں ہم نے ثبوت دیا تھا کہ ہر انسان یہ نہ سمجھے کہ وہ صحیح معنوں میں رُوحانی طور پر پیدا ہوا ہے۔ پیغمبرؐ نے کسی حدیث میں یہ بھی فرمایا ہے کہ: ''جب تک تم دُنیا میں ہو تو سمجھو کہ تم ماں کے پیٹ میں ہو اور جب تم اِس دُنیا سے دُوسری دُنیا میں منتقل ہو جاؤ گے تو اُس وقت تم پیدا ہو جاؤ گے۔'' اور ایک اور حدیث میں فرمایا کہ: [النّاس نیام فاذا ماتوا انتبہوا] ''لوگ سوئے ہوئے ہیں جب وہ مریں گے تو جاگیں گے، بیدار ہو جائیں گے۔'' اِن دونوں حدیثوں کا مطلب بھی یہی ہے کہ انسان عام حالت میں ناتمام ہے [اور] رُوحانی طور پر پیدا نہیں کیا گیا ہے۔ اُس کی رُوحانی تخلیق نہیں ہوئی، اِس کے لئے ایک خاص اصطلاح بھی ہے اور وہ اصطلاح ''موجودِ برحق'' [یعنی] صحیح معنوں میں موجود ہونا ہے۔

خیر مومنین تو مومنین ہی ہیں وہ اپنی کوشش اور اپنی حیثیت کے مطابق ضرور کسی نہ کسی مقام پر ہیں، لیکن اِس کے

باوجود اُن کو یہ احساس ہونا چاہیے کہ صحیح معنوں میں تخلیق جو ہے وہ کچھ آگے ہے اور اُس کے لئے جدوجہد ہونی چاہیے۔ اسی سلسلے میں ایک اور بات جس سے کہ اِس موضوع میں مدد مل سکے گی وہ یہ ہے کہ خدا نے کچھ انکار کرنے والوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ: وہ دیکھنے میں تو زندہ ہیں اور حقیقت میں مردہ ہیں (۷:۱۷۹)۔ آپ کو قرآن میں، حدیث میں اور حقیقت کی کتابوں میں ایسی بہت سی مثالیں ملیں گی جن کا خلاصہ یہ ہے کہ دُنیا کے اندر بہت قسم کے لوگ رہتے ہیں، کچھ تھوڑے لوگ صحیح معنوں میں زندہ ہیں اور بہت سے لوگ ایسے ہیں کہ دیکھنے سے تو وہ زندہ لگتے ہیں، زندہ نظر آتے ہیں مگر حقیقت میں دیکھا جائے تو وہ زندوں میں شمار نہیں ہیں [بلکہ] وہ مردوں میں شمار ہیں، میں قرآن کے اشاروں سے بات کرتا ہوں، قرآنی حقیقت بیان کرتا ہوں، اِس کا نتیجہ وہی نکلا جس کو ہم نے پہلے ہی فرض کرلیا تھا کہ رُوح جو ہے وہ بہت [سی] خوبیوں سے اور بہت ہی اعلیٰ صفات سے متّصف ہے، اِس سلسلے میں پیر ناصرِ خسروؒ کا ایک ارشاد ہے وہ فرماتے ہیں کہ:

زنورِ اوتُو ہستی ہمچو پر تَو
حجاب از پیش برداروتُواوشو

''تم خدا کے نور سے ہو اور خدا کے نور کا ایک عکس ہو جس طرح سورج کا عکس آئینے میں ہوتا ہے، اِس لئے تیرے سامنے جو پردہ ہے اُس کو ہٹاؤ تا کہ درمیان میں جو دوئی ہے وہ ختم ہو جائے اور تم اُس سے مل سکو''۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ رُوح اِس قابل ہے کہ وہ خدا سے ملے۔ آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ خدا سے کیسی چیز مل سکتی ہے اور رُوح کن صفات کی حامل ہو تو خدا سے مل سکتی ہے؟ جواب ہے کہ روح اعلیٰ سے اعلیٰ صفات کی حامل ہو تو خدا سے مل سکتی ہے۔ یہاں تک کہ خدا جیسی صفات اُس میں ہوں تو خدا سے مل سکتی ہے۔ دیکھیں کہ آگ گیلی لکڑی کو قبول نہیں کرتی ہے، جب ہم کسی لکڑی کو آگ کے سُپرد کردیتے ہیں تو اگر وہ سوکھی ہے تو [آگ] آسانی سے اُس کو قبولتی ہے، اگر گیلی ہے تو آگ کا پہلا کام یہ ہوتا ہے کہ پہلے وہ اُس کو سکھا دیتی ہے پھر اُس کو اپنا لیتی ہے۔ اپنانے کے معنی یہ ہیں کہ آگ لکڑی کو نور بنا لیتی ہے، روشنی بنا لیتی ہے اور آگ میں جو صفت ہے وہی صفت لکڑی میں بھی ہوتی ہے۔ اسی طرح کوئی رُوح خدا سے واصل اُس وقت ہوسکتی ہے جبکہ اُس رُوح میں خدا کی روشنی آئے، تب ہی تو یہ رُوح خدا سے واصل ہوسکتی ہے۔ تو رُوح اِس قابل ہے اور خدا کی تخلیق یہی ہے۔ جب مومن کو ایسا ایک اعلیٰ مقام حاصل ہوتا ہے تو وہ تمام چیزوں کا مشاہدہ کرلیتا ہے۔ اِس موضوع کے سمجھنے کے لئے ایک اور چیز میں آپ کو بتاتا ہوں وہ یہ کہ رسولؐ نے فرمایا کہ: اتَّقُوا فِرَاسَةَ الْمُؤْمِنِ فَإِنَّهُ يَنْظُرُ بِنُورِ اللهِ، مومن کی فراست سے، مومن کی دانائی سے بچ کر رہنا اور اُس کے خلاف کوئی عمل نہیں کرنا کیونکہ مومن کو پتا ہوتا ہے جبکہ خدا چاہے جبکہ ضرورت ہو، کیونکہ وہ خدا کے نور کے سہارے دیکھتا ہے۔

اگر یہ ممکن ہے کہ کوئی مومن خدا کے نور کی روشنی میں دیکھے تو پھر یہ ہوا خدا کی آنکھ سے دیکھنا، اور اگر یہ ممکن ہے کہ

کوئی شخص خدا کی آنکھ سے بھی دیکھ سکتا ہے تو پھر اِس سے کوئی چیز بچ نہیں سکتی ہے، نہ ازل نہ ابد، نہ دُنیا نہ آخرت۔ پھر خدا کی نگاہ سے دیکھنے کے بعد کوئی بھید بھید نہیں رہ سکتا، کوئی بھید بھید نہیں رہ سکتا، علمِ غیب علمِ غیب نہیں رہ سکتا، خدا کی نظر، خدا کی آنکھ ایسی ہے کہ کون و مکان اُس کے سامنے ہیں ایک پوائنٹ کی طرح، ایک نقطے کی طرح اُس کے سامنے ہے اور خدا کی نظر سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں رہ سکتی ہے، کوئی بھی بھید بھید نہیں رہ سکتا ہے۔ تو اُس وقت معرفت تمام ہو جاتی ہے، اور جب مومن کے لئے خدا ہی کان بنے، اور جب مومن کے لئے خدا ہی آنکھ بنے، جب مومن کے لئے خدا ہی زبان بنے تو معرفت کے سلسلے میں پھر کیا نہیں ہو سکتا ہے؟ معرفت کے سلسلے میں سب کچھ ہو جاتا ہے۔ اگر آپ کو اندازہ یہ ہو کہ ازل لاانتہا وقت کا نام ہے جو ماضی کی طرف سے اور ابد اُس لاانتہا زمانے کا نام ہے جو مستقبل کی طرف سے ہے، اور آپ لامکان اور مکان، آسمان اور زمین یہ بھی سوچتے ہوں گے [لیکن] میری گزارش یہ ہے کہ یہ حقائق اگرچہ اُونچے ہیں، یہ مرتبے اگرچہ اعلیٰ ہیں لیکن خدا کے نور سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے، ایسا کوئی گوشہ نہیں جہاں تک کہ خدا کے نور کی روشنی نہ جاتی ہو، خدا کے نور کی روشنی ہر جگہ پر پہنچتی ہے اَللّٰہُ نُوۡرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ (۲۴:۳۵)۔ اِس کلیّہ سے ازل و ابد، کون و مکان کوئی چیز بھی باہر نہیں ہے، لامکان بھی اسی کے اندر ہے تو خدا کا نور موجودات پر، ہستی و نیستی پر محیط ہے اور جو مومن خدا کے نور کے وسیلے سے دیکھتا ہے تو ہر چیز کو دیکھتا ہے۔

اب یہ مثال کہ کس طرح ہم سمجھیں کہ انسان کی نگاہ ازل تک جاتی ہے، میں آپ کو بتاؤں! اور دُنیا کی ایک مثال پیش کروں، دُنیا کے سائنسدانوں نے آج کل یہ کیا ہے کہ انہوں نے ماضی کو ریکارڈ کر کے انہوں نے حال بنایا ہے۔ ماضی کو حال کے طور پر پیش کیا ہے وہ یہ کہ کتابوں اور تحریروں کے علاوہ انہوں نے جب سے اِس میں کامیابی حاصل کی کہ انہوں نے فلم بنائی ہے، پندرہ بیس برس پہلے یا تیس چالیس برس پہلے نہ معلوم کب سے یہ فلم بنی ہے اور کب سے یہ ریکارڈنگ بنی ہے تو اُس وقت کی چیزیں انہوں نے محفوظ کر لیں ہیں اور اب یہ چیزیں اُسی طرح سے تازہ ہیں جس طرح کہ یہ پہلے تھیں۔ تو کیا خدا کے لئے یہ کوئی مشکل ہے کہ وہ نقشِ ازل کو حال کی طرح ایک مومن کے سامنے پیش کرے، کیا یہ ناممکن ہے کہ تخلیقِ آدمؑ کے واقعات رُوحانی طور پر پیش کئے جائیں، بلکہ تخلیقِ کائنات کے واقعات کو [بھی] خدا پیش کرے، کیا یہ ناممکن ہے کہ خدا ایک مومن کو اِس کائنات کے مٹانے کا جو (Demonstration) ہے وہ بتائے۔ قرآن میں ہے کہ: ایک وقت ایسا آئے گا کہ اُس میں اللہ تعالیٰ اِس پوری کائنات کو اپنے داہنے ہاتھ میں لے لیگا (۳۹:۶۷)۔ پوری کائنات کو، آسمانوں کو اور ہر چیز کو اپنی داہنی مٹھی میں لے لیگا یہ قرآن کا ارشاد ہے، اور دیکھنے والوں نے دیکھ لیا ہے اِس کا نمونہ، کہ خداوند یہ کر کے بتاتا ہے۔

رُوحانیت کسی اور چیز کا نام نہیں ہے انہی بڑے بڑے واقعات کا نام ہے۔ آپ کو یہ بھی یاد رہے کہ ہر مومن کی رُوحانیت مختلف نہیں ہوتی ہے وہ ایک رُوحانیت ہوتی ہے۔ اگر مومنین کی رُوحانیتیں الگ الگ ہوں اِس سے میری

مُراد مکمّل روحانیت ہے تو پھر پیغمبر کی شناخت کس طرح سے ہوسکتی ہے، خدا کی شناخت کس طرح سے ہوسکتی اور خدا کے قانون کو کس طرح [سے] سمجھ لیا جاسکتا۔ یہ بات نہیں ہے، ایک ہی واقعہ ہے، صراطِ مستقیم ایک ہی ہے، قدم بقدم آگے سے آگے بڑھنا ہوتا ہے، پیروں پر جو کچھ واقعات گزرے، پیغمبروں پر جو کچھ حالات گزرے، وہی حالات مومن کے سامنے آتے ہیں، اور اِس کے بغیر معرفت نہیں ہے، معرفت ایک (Set) چیز ہوتی ہے۔ بلکہ ازل و ابد میں جو کچھ ہے، قیامت میں جو کچھ ہے، انبیاء علیہم السّلام پر جو کچھ واقعات گزرتے تھے یہاں تک کہ انبیاء کو نبوّت کس طرح ملتی ہے اور اماموں کو کس طرح امامت ملتی ہے اور امامؑ اپنے بیٹے کو کس طرح امامت سپرد کرتا ہے، کس طرح نور کی منتقلی ہوتی ہے، کس طرح اسمِ اعظم کام کرتا ہے، فرشتے کس طرح جان لیتے ہیں، قیامت کا جو صور ہے وہ کس طرح بجایا جاتا ہے، یاجوج و ماجوج کا خروج کس طرح سے ہوتا ہے اور اگلی قوموں میں سے کچھ قومیں جکڑ سے یعنی تیز و تند ہَوا سے، طوفان سے کس طرح سے تباہ ہوگئیں۔ یہ سب واقعات جب تک سامنے نہ آئیں تو معرفت مکمّل نہیں ہوتی ہے، شناخت نہیں ہوتی ہے، رُوح اور رُوحانیت ایک ایسی وسیع چیز ہے اور رُوح و رُوحانیت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے۔ یہ اسماعیلی مذہب ہے جس میں یہ ممکن ہے، چونکہ اسماعیلی مذہب انبیاء و ائمہ علیہم السّلام کا دین ہے یہ صراطِ مستقیم ہے، اِس پر چلنے سے خدا ملتا ہے، خدا نے بھی قرآن میں فرمایا ہے کہ مجھ سے ملنا ہے تو صراطِ مستقیم پر میں مل سکتا ہوں۔ یہ موسیٰؑ کی زبان میں فرمایا گیا ہے کہ: اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (۵۶:۱۱) ''میرا پروردگار صراطِ مستقیم پر ہے''۔

اشارہ یہ ہے کہ خدا اور کہیں نہیں ملتا ہے ایک مذہب میں ملتا ہے، ہر جگہ پر نہیں ملتا ہے۔ ایک تصوّر یہ بھی ہے کہ خدا ہر جگہ پر ہے ہر جگہ پر خدا سے ملاقات ہوتی تو [پھر] خدا نے اسلام کے اندر اپنے ایک گھر کا تصوّر کیوں دیا۔ یہ اشارہ ہے کہ خدا سے ملنے کا کوئی مرکز ہے ہر جگہ سے خدا کی معرفت حاصل ہوتی تو پھر اُس نے عرش کا تصوّر کیوں دیا؟ یہ اشارہ ہے کہ خدا کا ایک مخصوص تخت ہے، ہر جگہ سے اگر خدا ملتا ہے تو پیغمبروں کے آنے کی کیا ضرورت ہے۔ خدا کی قدرت ہر جگہ پر ہونے کے باوجود خدا سے رسائی کا ایک مرکز ہے، اُس کا ایک گھر ہے، اس کا ایک رستہ ہے تو خدا کا یہ ارشاد کہ میرا پروردگار صراطِ مستقیم پر ہے، اِس سے مُراد ایک مذہب کی طرف اشارہ ہے کہ اُسی مذہب میں جو خدا کی ذات کی حیثیت سے ہے، خدا مل سکتا ہے۔ رُوح اور رُوحانیت ایسا موضوع ہے اِس کی طرف توجّہ ہونی چاہیے، نہ صرف توجّہ ہونی چاہیے بلکہ اُس کے لئے عملاً کوشش بھی ہونی چاہیے۔ ہاں ٹھیک ہے، عملاً کوشش ساتھ ساتھ جاری رہے لیکن علمُ الیقین کے طور پر جب تک ہم اِن باتوں کو نہیں سنیں گے اور نہیں سمجھیں گے تو ہم کس طرح عینُ الیقین کے مقام کو حاصل کر سکتے ہیں۔ لہٰذا اِن باتوں کا سننا بہت ضروری ہے تاکہ انسان کے اندر ایک کشش پیدا ہو اُس مرکز کی طرف بڑھنے کے لئے اور رُوح کی طرف توجّہ دینے کے لئے ایک جذبہ پیدا ہو اور رُوح کی لذّتوں کے لیے دلچسپی پیدا ہو اور رُوح کی ترقّی سے عشق پیدا ہو۔ جب ہم کو رُوح کی

لذّتوں کا علم نہیں ہوتا ہے تو ہم کو اُس سے کس طرح محبّت حاصل ہو سکتی ہے۔ کسی چیز سے دلچسپی اُس وقت پیدا ہوتی ہے جبکہ ہم اُس چیز کی خوبیوں کو [اور] اُس کے فائدے کو سمجھتے ہیں، اِس لئے ہماری جمعیت کا یہ پروگرام ہے کہ رُوحانیت کی باتیں مختلف صورتوں میں ہوں تو اِس لئے رُوح اور رُوحانیت کی کچھ باتیں کی جا رہی ہیں، جن سے آپ کو بہت سی بنیادی باتوں کا پتا چلے۔

رُوح اور رُوحانیت اسماعیلیوں کا شیوہ ہے ویسے تو دُنیا کے بہت سے لوگ دعویٰ کرتے ہیں کہ اُن کے پاس رُوحانیت ہے لیکن اُن کے پاس کوئی خاص رُوحانیت نہیں ہے۔ چونکہ موضوع سے ہی ظاہر ہے کہ روحانیت صرف ایک ہی مذہب میں ہے، صداقت ایک ہی مذہب میں ہے، معرفت ایک ہی مذہب میں ہے، خدا کی شناخت، انسان کی شناخت ایک ہی مذہب میں ہے، یہ سب اِس مذہب میں ہے جو کہ خدا کا مذہب ہے، خدا کا دین ہے۔ اِس کے لئے مومن کو چاہیے کہ وہ پہلے خود کو عملی طور پر تیار کرے اِس کے بعد وہ عملاً آگے بڑھے اور خصوصاً اِس زمانے میں اِس چیز کی زیادہ سے زیادہ توجّہ کی ضرورت ہے جب کہ مادّی ترقّی نے بہت مسائل پیدا کر دئے ہیں اور مادّی ترقّی نے دین کی اہمیت کو کم کر دیا ہے اور نتیجے کے طور پر لوگ دین سے گریز کر رہے ہیں، بھاگ رہے ہیں اِس لئے کہ اُن کے نزدیک دین کی کچھ خوبیاں نہیں رہیں، اور اگر واقعتہً اسلام ایسا ہے جیسا کہ لوگ پیش کرتے ہیں تو پھر نئی نسل کے لئے مشکل ہو جائے گی، جب کہ اسلام ایسا نہیں ہے جو لوگوں کے گمان میں ہے، اسلام خدا کا دین ہے، اسلام میں دینی ترقّی بھی ہے اور دنیاوی ترقّی بھی ہے اسلام میں کسی بھی چیز کی کوئی کمی نہیں ہے، لیکن افسوس کی بات یہ ہے کہ اسلام کو نہیں سمجھا جاتا کاش! قرآن کی روشنی میں اسلام کو سمجھ لیا جاتا کاش! رُوح اور رُوحانیت کی روشنی میں اسلام کو سمجھ لیا جاتا کاش! اسلام کی شناخت ہوتی اور جن وسائل سے اسلام کی شناخت حاصل ہوتی ہے اُن وسائل کی طرف توجّہ دی جاتی۔

بہر حال ہمیں مقامِ شکر [حاصل] ہے کہ ہم آج امامؑ کے مُرید ہیں ہمیں اُس کے دروازے کے سامنے زمین کو چومنا چاہیے اور تعظیم بجالانی چاہیے کہ اُسی مہربان نے ہم کو یہ راستہ بتلایا۔ آج [ہم] خوشی سے رُوحانیت کی، رُوح کی باتیں کر رہے ہیں اور اِس گہرائی سے کہ جس سے اندازہ کرنے والا اندازہ کر سکتا ہے کہ یہ باتیں کیسی ہیں اور کس بلندی کی باتیں ہیں اور اِس میں واقعتہً دعویٰ ہے کہ ایک طرح سے اسماعیلی مذہب میں رُوح کی شناخت ہے، رُوح کے بھید ہیں، سوائے اسماعیلیوں کے کون کہہ سکتا ہے کہ کوئی بھید بھید نہیں رہتا اور سب سے بڑا بھید خدا کی معرفت ہے اور جب خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے تو خدا کے بہت سارے بھیدوں کا پتا چلتا ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ مومن علم کو گھیر نہیں سکتا ہے اور دولت کو جمع نہیں کر سکتا ہے دولت کو سمیٹ نہیں سکتا ہے، دامن اُس کا تنگ ہوتا ہے دامن اُسکا چھوٹا ہوتا ہے، دولت کو وہ سمیٹ نہیں سکتا ہے یہ بات الگ ہے۔ لیکن معرفت بہت بڑی چیز ہے یہ آپ کو یقین دلانے کے لئے [ہے] کہ اسماعیلی

مذہب میں اور معرفت کے مقام پر ایسی ایسی باتیں ممکن ہیں، مجھے یقین ہے کہ اِس گفتگو میں آپ کے لئے بہت سی اہم باتیں بتلائی گئی ہیں ان میں بہت سی باتیں آپ کے لئے نئی ہیں بنیادی قسم کی باتیں ہیں آپ بھی اِن باتوں کو ذہن نشین کرلیں۔

ٹرانسکرائب: حبیب اللہ ٹائپنگ: اکبر علی پُروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: مومن کی صلاحیتیں، قصۂ آدم کی چند تاویلات

کیسٹ نمبر: ۲۹ تاریخ: ۲۶/ جنوری/ ۱۹۷۹، کراچی

Click here for Audio

مومن [کے لئے] علمی اور دینی طور پر گفتگو کی ضرورت اِس لئے ہے کہ مومن کے اندر اور ہر انسان کے اندر اُس کی ہستی میں مختلف قوتیں کارفرما ہیں۔ مثال کے طور پر ایک تو اُس کی رُوح ہے، ایک اُس کا جسم ہے اور ایک اُس کی عقل ہے۔ جس طرح جسم کی پرورش کے لئے جسمانی غذاؤں کی ضرورت رہتی ہے اور یہ ضرورت ہمیشہ کے لئے موجود ہے اسی طرح رُوح کی پرورش کے لئے بھی ایک مخصوص غذا چاہئے اور بالکل اسی طرح عقل کی تربیت اور پرورش کے لئے بھی ایک عقلی غذا کی ضرورت ہے۔ اِس منطق کو آپ ضرور تسلیم کریں گے کہ انسان میں جسم کے علاوہ رُوح اور عقل بھی ہے بلکہ ایک اور عنصر بھی ہے وہ عشقِ الٰہی ہے۔ بے شک خدا کے عشق کی ترقّی کے لئے [یعنی] عشقِ خدا کی غذا کے لئے گنان ہیں، گنان کسی بھی صورت میں ہوسکتے ہیں بالکل اسی طرح عقل کے لئے علم کی ضرورت ہے، علمی غذاؤں کی ضرورت ہے کیونکہ مومن کی عقل کی ترقّی علم سے ہے، حکمت سے ہے،، جس طرح رُوح کا سکون عبادت میں ہے۔

اگر انسان کی ہستی سے متعلّق اِن تمام غذاؤں کا اہتمام ہوجائے تو مومن کامیاب ہوسکتا ہے یعنی مومن کا جسم بھی دُرست رہے کہ اُس کو کوئی بیماری نہ ہو، اُس میں کوئی کمی نہ آئے، اُس میں کوئی ذوق [کی] کوئی کمزوری نہ ہو، اِسی طرح رُوح بھی دُرست رہے کہ اُس کے لئے عبادت کی خوراک مہیّا ہوتی رہے اور عقل کے لئے بھی غذائیں مہیّا ہوتی رہیں کہ [جس سے] علمی طور پر اُس کو تقویت ملے اور اسی طرح عشق کے لئے بھی خوراک ملے جو امام کی محبّت ہے، جو گنان ہے، جو نظم ہے، جو منقبت ہے تو پھر مومن اِن چار چیزوں کی مدد سے کامیاب ہوجاتا ہے۔ ہمارے پاک مذہب میں اِن چار چیزوں کو اہمیت دی گئی ہے یعنی امامؑ نے جسم کی صحت برقرار رکھنے کے لئے بہت سی ہدایات فرمادی ہیں اور رُوح کے لئے اہتمام یہ ہے کہ عبادت، بندگی اور ذکر کا سلسلہ جاری ہے اِس کے لئے جماعت خانے میں اہتمام کیا گیا ہے۔ عقل کی غذا اِس لئے ہے کہ وعظ و نصیحت ہوتی ہے فرامین پڑھے جاتے ہیں اور گنان میں جو علم کا حصّہ ہے اُس میں سے عقل کی غذا بنتی ہے اور عشق کے لئے یہ اہتمام ہے کہ گنان پڑھا جاتا ہے۔ لیکن بات یہ ہے کہ علم جو عقل کی غذا ہے وہ اعلیٰ سے اعلیٰ ہونا

چاہیئے، جس طرح کہ جسم کی مثال میں جب ایک انسان جسمانی طور پر کمزور ہوتا ہے تو ڈاکٹر کے وہاں اُس کا معائنہ ہوتا ہے اور دیکھتے ہیں کہ اُس میں کیا بیماری ہے اور یہ بھی دیکھتے ہیں کہ خوراک کیا کھائی جاتی ہے۔ جسم کی کمزوری نظر آنے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر معائنے کے بعد، دیکھنے کے بعد یہ مشورہ دیتا ہے کہ اُسے کیا کھانا چاہیئے اور کس چیز سے پرہیز [کرنا] چاہیئے اور دوا کے طور پر کن کن چیزوں کو استعمال کرنا چاہیئے۔ اِس کا مطلب علم ہے اور اعلیٰ سے اعلیٰ علم، تو ہر وقت اعلیٰ سے اعلیٰ علم کی ضرورت ہے تا کہ ہماری جو عقل ہے اُس کو دُرست غذا مہیّا ہو جائے اور ہم ترقّی کر سکیں۔

اعلیٰ سے اعلیٰ علم کا ایک مطلب یہ بھی ہے کہ ہم ریسرچ کر سکتے ہیں رُوحانیت کے معاملے میں انسان کے اندر مومن کے اندر جو رُوحانی قوتیں ہیں جو رُوحانی صلاحیتیں ہیں اُن کو زیادہ سے زیادہ اُجاگر کرنے کے لئے ہم تجربات کر سکتے ہیں۔ اِس زمانے میں جو تحقیق کا زمانہ ہے، اِس زمانے میں جو ریسرچ کا زمانہ ہے، دُنیا والے ہر چیز پر تجربہ کرتے ہیں، ریسرچ کرتے ہیں اور ہر چیز کو ترقّی دینے کی کوشش میں ہیں اور اِس میدان میں اُن کو بہت سی کامیابی ہوئی ہے کہ انہوں نے بہت سے نئے طریقے ایجاد کئے ہیں۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ جہاں دُنیا والوں نے دنیوی علوم میں ترقّی کرنے کے ساتھ ساتھ رُوحانیت کی طرف توجّہ دی ہے یہ [یعنی] (Psychic) کے میدان میں، ٹیلی پیتھی کے لئے کوشش کرتے ہیں اور اِس قسم کی بہت سی چیزیں انہوں نے پیدا کی ہیں اِن کو وہ سائنس کی حیثیت میں مانتے ہیں۔ بہر حال دیکھا جائے تو وہ رُوحانیت کی چیزیں ہیں اور اگر لوگوں کا یہ حال ہے کہ وہ کسی نہ کسی صورت میں رُوحانی قوتوں کی طرف توجّہ دے رہے ہیں تو ہمیں کیا ہوا ہے کہ اسماعیلی ہوتے ہوئے بھی ہم اپنی رُوحانیت کو اُجاگر کرنے کے لئے کوشش نہیں کر رہے ہیں۔ بہتر یہ ہے کہ اِس زمانے میں (Scientific) اُصول سے بھی ہم دیکھیں کہ ہمارے اندر کیا کیا قوتیں ہیں۔ مثلاً کہنا یہ ہے کہ گریہ وزاری کے ذریعے سے مومن جب خود کو بہت عاجز قرار دیتا ہے تو اُس وقت اسکے باطن میں سے، اسکے اندر سے کون کون سی قوتیں اُبھرتی ہیں اِس کا تجربہ کرنا چاہیئے اور تجربہ کیا گیا ہے کہ جب مومن گریہ وزاری کرتا ہے اور خود کو عاجز قرار دیتا ہے اور خود کو [اور] اپنی خودی کو فنا کرتا ہے تو عجیب بات ہے کہ اُس کے اندر سے قسم قسم کی قوتیں اُبھرتی ہیں۔ ایک یہ کہ اُس کے باطن میں روشنی کا آغاز ہوتا ہے، ایک یہ کہ اُس کو سکون ملتا ہے، ایک یہ کہ اُس کو خوشی محسوس ہوتی ہے، ایک یہ کہ وہ محسوس کرتا ہے [اور] یقین کرتا ہے کہ اُس کے گناہ معاف ہو گئے، ایک یہ کہ اُس کے اندر سنجیدگی آتی ہے، بات میں لذّت پیدا ہوتی ہے اور گفتگو کا جو سلسلہ ہے وہ جاری رہتا ہے۔ بہت کچھ اُس کو ملتا ہے اور یہ سب کچھ ایک ہوشمند مومن سمجھ سکتا ہے تو کیا اِس سے پتا نہیں چلتا ہے کہ یہاں ایک خزانہ ہے۔ یعنی اِس قسم کی عبادت کے اندر ایک خزانہ ہے۔ جہاں پر پتا چلے کہ ایک خزانہ ہے اُس میں کیا کھوج نہیں لگانا چاہیئے، کُریدنا نہیں چاہیئے، تحقیق نہیں کرنی چاہیئے؟ مومن کو یقین ہے کہ اِس قسم کی عبادت کے اندر خزانہ ہے۔ اور اگر قرآن کی بات کرنی ہے تو قرآن نے کس قدر تاکید کی ہے دل سے عبادت کرنے کے لئے، قرآن میں

عاجزی اور انکساری کی کتنی تعریف ہوئی ہے، امامؑ نے اپنے مقدّس فرامین میں عاجزی اور انکساری کی کتنی تعریف کی ہے اور بڑائی اور غرور کی کتنی مذمّت کی ہے اور ہم کو یہ یقین ہے کہ عاجزانہ عبادت میں کامیابی ہے۔

اِس کے علاوہ قرآن کی روشنی میں پیغمبروں کے طریقۂ کار کو دیکھا جائے کہ اُن کی عبادت کا طریقہ کیا تھا؟ وہ کس طرح عبادت کیا کرتے تھے؟ کیا وہ فخر سے اور خوشی سے عبادت کرتے تھے یا وہ عجز و انکساری سے عبادت کرتے تھے کیا وہ آنسو بہاتے تھے یا ہنستے تھے، یہ دیکھنا چاہئے۔ جب وہ خدا کے بھیجے ہوئے ہدایت کے نمونے ہیں، رہنما ہیں تو اُن کے طریقۂ کار کو ذرا دیکھنا چاہئے اور فرامین کو سامنے رکھنا چاہئے قرآن کے علاوہ ''پیر پندیاتِ جوانمردی'' میں عبادت کا طریقہ بیان کیا گیا ہے، امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ نے عبادت کے سلسلے میں جتنے ارشادات فرمائے ہیں اُن کے اندر عبادت کا طریقہ ہے، گریہ وزاری کا طریقہ ہے اور نفسیات کے جو ماہر ہیں اُن سے پوچھنا چاہئے کہ انسان جب عجز و انکساری کی طرف جاتا ہے تو اِس سے کیا (Result) نکلتا ہے؟ آپ کو ہر مقام سے اثبات میں جواب ملے گا نفی میں نہیں (Positive) انداز میں جواب ملے گا کہ اِس سے انقلاب آتا ہے، دل کو سکون [میسّر] ہوتا ہے، ہم یہ نہیں چاہتے ہیں کہ یکا یک جماعت خانے کا انداز بدل جائے وہ تو بحیثیتِ مجموعی جو کچھ بھی مناسب ہے سب کو دیکھ کر قابلِ برداشت ایک ہدایت دی جائے گی لیکن انفرادی طور پر جن کو شوق ہے زیادہ جدوجہد کرتے ہیں، [اپنے] نفس کے خلاف جہاد جاری ہے تو اُن کو کچھ کرنا چاہئے۔

دین حق میں آٹھ گھنٹے کی عبادت ہے تو وہ آٹھ گھنٹے کی عبادت جماعت خانے میں تو نہیں ہوسکتی ہے۔ اِس ترقّی کے زمانے میں آپ کس طرح سب جماعت کو آٹھ گھنٹے کی عبادت کے لئے پابند کرسکتے ہیں یہ تو مناسب نہیں ہے۔ لیکن کچھ درویش صفت لوگ ہوسکتے ہیں اور ہر مذہب میں یہی ہوا ہے کہ کچھ لوگ مخصوص ہوتے ہیں وہ زیادہ کوشش کرسکتے ہیں۔ جس طرح دنیوی بات میں سب یکسان نہیں ہیں کچھ دنیوی طور پر بہت زیادہ کامیاب ہیں اُن کے پاس بہت دولت ہے ٹھیک ہے اُس سے جماعت کو فائدہ ہے اور وہی لوگ بہت زیادہ مالی طور پر جماعت کی مدد کرسکتے ہیں اسی طرح کیا ایک طبقہ نہیں ہونا چاہئے کہ کچھ درویش صفت ہوں کہ وہ الگ [ہوں] وہ اِس قابل ہیں کہ وہ عاجز ہوں وہ یہی کرسکتے ہیں کہ بس اُن کے اندر عاجزی ہے انکساری ہے۔ رسول اللہؐ کے زمانے میں کیا سب یکسان تھے، تو پھر اصحابِ صفّہ کیا تھے؟ رسول اللہؐ کے زمانے میں ایک طبقہ تھا وہ درویشوں کا طبقہ تھا بس وہ یہی کرسکتے تھے کہ ایک گوشے میں بیٹھیں، عبادت بندگی کریں تو ہمیں تو دُنیا کو بھی رکھنا ہے اور دین کو بھی برقرار رکھنا ہے لیکن ہوسکتا ہے کہ ہم میں دنیوی قابلیت کم ہو اور درویشی کا ایک عنصر ہم میں زیادہ ہو، کیونکہ سب لوگ برابر برابر نہیں ہوسکتے ہیں۔ جس طرح ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے جو بھائی دولتمند ہیں، سیاست میں حصّہ لینے والے اور علم میں آگے ہیں اداروں میں ہیں اور گورنمنٹ میں کام کرتے ہیں اُن سے ہم کو فائدہ ہے جب بھی موقع ملتا ہے تو ہم اُن کے سامنے سر جھکاتے ہیں اُن سے ہم خوش ہوتے ہیں وہ ہمارے مددگار ہیں اُس سے ہماری جماعت اور ہمارے مذہب کی

نیک نامی ہوسکتی ہے اسی طرح ایک ایسا طائفہ، ایک ایسا گروہ بھی چاہئے جو کہ مزید عبادت کرنے میں کامیاب ہو جائے۔

میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب میں کینیڈا میں گیا تو اُس وقت وہاں پر ہندوؤں کی ایک تحریک چل رہی ہے یہ بات بہت دلچسپ ہے میں آپ کو بتاؤں گا اُس سے آپ کافی مطلب سمجھ پائیں گے۔ تو یونیورسٹی کی اور باہر کی نئی نسل اُس تحریک سے متاثر تھی وہ ایک (Meditation) کرواتے ہیں کہ ایک (Sitting) میں دس ڈالر لیتے ہیں اُس کو (Transcendental Meditation) کہتے ہیں کچھ ایسا ہے۔ تو کچھ ہندوؤں کے نمائندے ہیں جنہوں نے کچھ مشقیں کی ہیں اور فوری طور پر اُن کو تھوڑی سی کامیابی بھی ہوئی ہے اِس چیز نے ہماری جماعت کے ایک خاص طبقے کو خصوصاً (Educated) اور جن کی آزاد خیالی ہے جو سوچنے میں (Free) ہوسکتے ہیں اور ہونا چاہئے وہ اِس چیز سے متاثر تھے۔ اب جماعت کے ایسے افراد کو کس طرح سے مطمئن کیا جائے؟ میں آپ سے سوال کرتا ہوں اگر آپ کے یہاں کوئی مشق نہیں ہے کوئی عبادت نہیں ہے، پرائیویٹ کی چیز کوئی نہیں کرسکتا اُس پر پابندی ہے تو آپ ریسرچ نہیں کرسکتے ہیں تجربہ نہیں کرسکتے ہیں اور بس بالکل لکیر کے فقیر ہو کر رہ سکتے ہیں۔ یہ تو پھر آپ سے تمام قوتیں سلب کی گئیں تو وہاں پر مسئلہ ہوا۔ میں اُن کو کسی طرح سے مطمئن نہیں کرسکتا تھا سوائے اِس کے کہ میں ایک مجلس منعقد کروں اور اُس میں رُوحانیت کی مشقیں کر کے اُن کو متاثر کروں اور مولا کی مہربانی سے میں اِس کام میں کامیاب ہوگیا۔ میں نے کچھ اُن کو مشقیں بتائیں اور کچھ اِس قسم کی گریہ وزاری یا اِس قسم کی عبادت اور ایسی پرائیویٹ چیزیں میں نے جب اُن کو بتائیں تو وہ مطمئن ہو گئے اور انہوں نے کہا کہ الحمدللہ! ہمارے مذہب میں سب کچھ ہے کیا یہ فضول چیز ہے؟ نہیں۔ تو میرے کہنے کا مطلب اور کچھ نہیں ہے بس یہی ہے کہ آپ کو یقین دلانا ہے، آپ کو اطمینان دینا ہے اور کوئی مقصد نہیں کہ آپ جو کچھ کام کرتے ہیں وہ صحیح ہے یہ ایک پرائیویٹ چیز ہے پابندی اُس چیز پر ہونی چاہئے جو بُری ہے جو باعثِ بدنامی ہے جس سے بُرائی پھیل سکتی ہے، اُس پر پابندی ہونی چاہئے۔ جو عبادت و بندگی ہے کوئی شخص آٹھ گھنٹے سے لے کر سولہ گھنٹے تک یہ عبادت کرسکتا ہے خدا نے قرآن میں فرمایا ہے کہ: وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا (۸:۴۵) ”خدا کی یاد کثرت سے کیا کرو“۔ بہت زیادہ خدا کی یاد کرو تو دُرست ہے اور جہاں تک جماعت خانے کی عبادت ہے وہ ضروری ہے اور بہت لازمی ہے۔ لیکن امام بحیثیتِ مجموعی جو فرامین فرماتے ہیں سب جماعتوں کو دیکھ کر اُن کی مجبوریوں کو دیکھ کر، دُنیا کی ترقّی کو دیکھ کر، کاروبار کو دیکھ کر، کسی بیمار کو بھی دیکھ کر، کسی بوڑھے کو بھی دیکھ کر اور کسی ایسی ماں بہن کو بھی دیکھ کر جس کے گھر میں بچّے رو رہے ہیں اُن سب کو دیکھ کر ایک فرمان فرماتے ہیں جو سب کے لئے قابلِ عمل ہو جو سب کے لئے قابلِ برداشت ہو تو امام بحیثیتِ مجموعی ایسا فرمان فرماتے ہیں لیکن انفرادی طور پر آپ اگر امامؑ سے (Approach) کریں اور کوئی مزید ہدایت اپنی ذاتی ترقّی کے لئے طلب کریں تو مولا آپ کو ہدایت دے سکتے ہیں اجازت دے سکتے ہیں اِس میں بھلائی ہے، لیکن بحیثیتِ مجموعی جو فرمان ہے وہ الگ ہے انفرادی جو ہدایت

ہے وہ الگ ہے۔

میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اِس میں بہت ترقّی ہے، میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اِس میں بہت ہی فائدہ ہے۔ ابھی آپ نے تھوڑی دیر کے لئے گریہ وزاری کی میں سمجھتا ہوں مجھے یقین ہے کہ بہت سے دل صاف ہو گئے، بہت سوں کو سکون حاصل ہو گیا، اِن الفاظ کے اندر (Polishing) تھی اِن الفاظ سے دلوں کی دُھلائی ہوتی تھی، باطن کی تطہیر ہو جاتی تھی۔ مجھے معلوم ہوا میں جانتا تھا، مجھے یقین ہے ہمیشہ ایسا ہوتا ہے گنان سے، مناجات سے، گریہ وزاری سے، تسبیح سے اور باہم مل کر اخلاص ومحبّت سے جب ہم مولا کو پکارتے ہیں خصوصاً ایک ایسے مقام میں جہاں ہم کو کوئی خوف نہیں ہے کہ کسی کو ہماری آواز سے تکلیف ہوتی ہے۔ جب ہمارے احساسات (Free) ہوتے ہیں تو ہم یک من ہو کر خدا کی طرف متوجّہ ہو جاتے ہیں عبادت کرتے ہیں بندگی کرتے ہیں تو اُس سے یقیناً ہم کو سکون آتا ہے۔

دیکھئے ہفتے بھر میں گھر یا کاروبار کے آپ کام کاج کرتے ہیں تو ایک دن آپ ضرور کسی باغ میں کسی سبزہ زار میں سیّاحت کرتے ہیں کیوں؟ اِس لئے [کہ] طبیعت کو خوش کرنا ہے یہ تو طبیعت کی بات ہو گئی۔ اِسی طرح یہ بھی ایک علاج ہے کہ اپنے دل کو رُوحانی مسرّتوں سے نوازیں اپنے باطن کو ذرا پاک و پاکیزہ کریں، ہم ہاتھ مُنہ صبح اور دو تین دفعہ دن میں دھوتے ہیں لیکن باطن کو بھی کبھی دھونا چاہئے اور باطن کس طرح دھویا جاتا ہے؟ اسی طرح مزید ترقّی کے لئے۔ اور دُوسری بات یہ ہے کہ بہت سے مومنین کی رُوحانی ترقّی رُکی ہوئی ہے جس سے بعض دفعہ امام کو بھی دُکھ ہوتا ہے اور امام کو تکلیف ہوتی ہے، چٹھّی بدلنے میں اور اِس میں اُس میں مہمانیاں گزاری جاتی ہیں کہ یا مولا! ہماری رُوحانی ترقّی نہیں ہو رہی ہے اور بعض دفعہ کسی مومن کی طرف سے یہ بھی ممکن ہے کہ اُس کو بدگمانی ہو، سو (۱۰۰) میں سے نہیں تو ہزار میں سے کسی کو بدگمانی یہ ہو کہ اب اِس میں کیا ہے؟ ہم نے اتنے عرصے تک ''بڑے کام'' کو لیا اِس سے ہم کو فائدہ نہیں ملا، مثال کے طور پر ہم دسوند دیتے ہیں جماعت خانے کی حاضری میں ہم باقاعدہ ہیں صبح بھی اُٹھتے ہیں پھر بھی ترقّی نہیں ہے تو ایسے شخص کے دل میں کیا کوئی بدگمانی پیدا نہیں ہوگی، کیا اِس ''بڑے کام'' کے متعلّق ہم میں [جو] احترام ہونا چاہئے اُس میں کمی نہیں آئے گی اور امام کے متعلّق ہمارا جو احترام ہے اُس میں کمی نہیں آئے گی، یہ کیوں ایسا ہے، کس کی وجہ سے ہے؟ ہماری خود کی وجہ سے کہ ہم اُصولات کے مطابق عبادت نہیں کر سکتے ہیں اور کوشش نہیں کر سکتے ہیں اپنے من کی پاکیزگی نہیں کر سکتے ہیں گریہ وزاری نہیں کر سکتے ہیں تو یہ قیاس اور یہ مثال اِس لئے میں نے پیش کی کہ اِس قسم کے سوالات دورانِ سفر ہمارے سامنے ضرور آتے ہیں اور جب اِدھر اُدھر ہم جماعتوں کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں تو وہ یہی شکایت کرتے ہیں کہ اُن کی دسوند دُرست ہے، وہ صبح وشام عبادت میں حاضری بھی دیتے ہیں اور نورانی عبادت میں بھی وہ باقاعدہ ہیں لیکن اِس کے باوجود اُن کی ترقّی نہیں ہو رہی ہے۔ تو یہ گویا کہ دین کے خلاف ایک شکایت ہے، حالانکہ وہ جس طرح سوچتے ہیں وہ صحیح نہیں ہے

اُن میں کمی ہے، بہت سوں نے ہمیں لکھ کر سوال دیے اور اُن کے سوال سے یوں لگتا ہے جیسے کہ وہ عبادت میں صحیح ہیں، حالانکہ وہ صحیح نہیں ہیں، قاعدے میں قانون میں وہ جس شان سے عبادت کرنا چاہئے نہیں کر سکتے ہیں۔

ہمیں ایک بہت بڑے مشنری نے ڈائمنڈ جوبلی کے زمانے میں جماعت میں وعظ سنایا وہ کہتے تھے کہ ایک وقت میں ایک مومن حضرت مولانا امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ کے حضور میں آئے اور انہوں نے اپنے متعلّق شکایت کی۔ گزارش کرنے لگے کہ یا خداوند! آپ کو ظاہر و باطن معلوم ہے کتنے برس سے میری کچھ رُوحانی ترقّی نہیں ہو رہی ہے تو امام تھوڑا سا جلال میں آ گئے کہنے لگے کہ بتاؤ کہ اِس میں تمہارا قصور ہے یا ہمارا؟ کہنے لگے کہ اِس میں یا تو تمہارا قصور ہے یا ہمارا قصور؟ مولا نے اِس مطلب کو (Short) کیا اور بہت ہی مختصر کیا۔ اِس میں یا تو تمہارا قصور ہے یا میرا قصور ہے یعنی یا تو یہ ہے کہ میں نے تم کو جو اسمِ اعظم دیا ہے اُس میں کوئی تاثیر نہیں ہے کوئی معجزہ نہیں ہے یا یہ ہے کہ تم نے جس شان سے [عبادت] کرنی چاہئے اُس شان سے نہیں کی تو اتنے میں وہ مومن رو پڑے اور آنسو بہانے لگے اور زار و قطار رونے لگے کہنے لگے یا خداوند! غلطی میری ہو سکتی ہے قصور میرا ہو سکتا ہے آپ کا نہیں، پھر مولا نے اُس کو بتایا کہ دیکھو تم میں یہ عیب ہے وہ عیب اُس کو بتا دیا تو مطلب کی بات یہ ہے کہ کیا اِس پر گفتگو نہیں ہونی چاہئے کیا اِس پر (Discussion) نہیں ہونا چاہئے کیا پرائیویٹ میں اِس کی مشقیں نہیں ہونی چاہئے۔ ایک کالج [یا] یونیورسٹی میں اسٹوڈنٹ ناکام ہوتا ہے اور (Result) میں اُس کے نمبر بہت کم آتے ہیں تو اِس کا کیا علاج ہونا چاہئے؟ یہ ہونا چاہئے کہ اُس کے لئے ٹیوشن ہو یہ ہونا چاہئے کہ وہ کچھ دُوسرے طالبِ علموں کے ساتھ مل کر بیٹھے، (Discuss) کرے یا کسی اُستاد کی مدد لے پھر لازمی ہے کہ اُس کے اچھے نمبر آئیں گے۔ تو یہی بات ہے کہ ہم جو پرائیویٹ مجلس کرتے ہیں تو اُس کا مقصد یہ ہے کہ ہم عبادت میں آگے بڑھیں، بندگی میں آگے بڑھیں، اِس لئے کہ اُس میں [ہم] علم کی باتیں بھی کرتے ہیں رُوحانیت کی باتیں کرتے ہیں کبھی کبھار تجربات بتاتے ہیں، کبھی کبھار کچھ تیاری سے متعلّق باتیں کرتے ہیں۔ اِس سے میرے خیال میں شکوک دُور ہو سکتے ہیں مدد مل سکتی ہے اور اِس سے مومن کی عقل میں اُس کے شعور میں اُس کے عقیدے میں نکھار آ سکتا ہے پھر [وہ] مان سکتا ہے کہ اگر قصور ہے تو مومن کا اپنا ہے کوتاہی ہے تو اُس کی اپنی ہے دین کا کچھ [قصور] نہیں، بڑے کام کا کچھ [قصور] نہیں۔

مولا تو ہر وقت مہربان ہے مولا چاہتا ہے کہ مومن ترقّی کرے، مولا چاہتا ہے کہ اُس کی رُوحانی اولاد کی ترقّی ہو، مولا چاہتا ہے لیکن اِس چاہنے کے باوجود یہ کام کیوں نہیں ہوتا ہے؟ جب مولا کا ارادہ ہے تو ہونا چاہئے، پھر ظاہر ہے کہ جو کچھ ہمیں کرنا چاہئے وہ ہم سے نہیں ہو رہا ہے ہمارا ابھی کچھ حصّہ ہے اِس میں، ہم ایسے فضول نہیں ہیں ہم ایک ہستی ہیں ہم کو طرح طرح کی قوتیں اور صلاحیتیں دی گئی ہیں اور افسوس کا مقام یہ ہے کہ ہم اپنی صلاحیتوں سے کام نہیں لے رہے ہیں یہی شکایت ہے اگر مومن کو پتا چلتا ہے کہ اُس کے اندر کیا کیا قوتیں ہیں، کیا کیا صلاحیتیں ہیں تو میں سچ کہتا ہوں کہ وہ آرام نہیں لیتا ہے۔

اگر وہ باخبر ہوتا اپنی قوتوں سے اپنی صلاحیتوں سے واقف ہوتا تو وہ ہمیشہ اپنے اندر یہ تڑپ رکھتا کہ اِن صلاحیتوں سے کام لے۔ پرندے کو پتا ہے کہ اُس میں پرواز کی قوت ہے تو وہ اُڑتا ہے جب اُس کو علم نہ ہو تو وہ کیسے اُڑے، تو ہمیں پرواز کی قوت دی گئی ہے یعنی ہم رُوحانی طور پر خود کو آگے بڑھا سکتے ہیں خود کو آگے بڑھا سکتے ہیں ہر معنی میں اور ہر لحاظ سے۔ تو ہم کو رُوحانی لشکر قرار دیا گیا ہے، کس معنی میں؟ اگر ہم میں کچھ قوتیں [یا] صلاحیتیں نہ ہوتی تو ہم کو لشکر قرار نہ دیا جاتا۔ آپ میں سے بہت سے حضرات سُن چکے ہونگے، جو بڑے کام میں ہوتے ہیں اور جن کو بڑا کام دیا جاتا ہے اُن کو رُوحانی لشکر کہا جاتا ہے اور رُوحانی لشکر! جنگ کے بغیر جہاد کے بغیر لشکر کے کچھ بھی معنی نہیں ہیں، شاید کوئی جنگ ہے، لہٰذا آپ کا نام لشکر ہے تو جنگ کون سی؟ یہی نفس کے خلاف، نفس کے خلاف جو جہاد ہے اُس جہاد کی وجہ سے آپ رُوحانی لشکر ہیں، جب امامؑ کے رُوحانی لشکر ہیں اور امام اِس لشکر کا ہائی کمانڈ ہے اور اِس کا مالک ہے اِس کا اعلیٰ اختیار ہے تو پھر آپ کو ایک سپاہی یا ایک مجاہد کی حیثیت سے کام کرنا چاہیئے وہ یہ کہ ہمیں اپنے نفس کے خلاف جنگ لڑنی ہے۔ تو اِس سے مومن کی صلاحیتوں میں کمی آتی ہے جب کہ وہ یہ تصوّر رکھتا ہے کہتا ہے کہ میری قسمت، میری تقدیر، مقدّر معلوم نہیں کیا ہے، مولا کی مرضی ہے جو چیز ہمیں دی گئی ہے اگر اُس کو مولا کی مرضی پر ڈالیں تو مولا اِس سے خوش نہیں ہوتا ہے۔ مولا نے اپنے اختیار سے جو کام، جو قوت، جو فریضہ ہمارے اختیار میں کر دیا ہے اُس کو تسلیم کرنا چاہیئے اِس سے مولا کی خوشی ہے اپنے کام کو کم کر کے مولا پر ڈالیں اور کہیں کہ مولا کی مرضی، اِس سے میں سمجھتا ہوں کہ مولا خوش نہیں ہوتا ہے کیا یہ مولا کی تعریف نہیں ہے کہ اُس نے بہت ساری قوتیں ہم کو دیں ہیں بہت ساری ذمہ داری ہم کو سونپی ہے، اِس لئے کہ ہم اُس کے رُوحانی فرزند ہیں، اِس لئے کہ ہم اُس کے مجاہد ہیں، رُوحانی فرزند میں بھی بہت سے معنی آتے ہیں ایک اچھا لائق فرزند ہو تو اپنے باپ کے کام میں سے بہت سا حصّہ سرانجام دے سکتا ہے، تو یہ اسماعیلی تصوّر ہے۔

دُوسروں کے تصوّر میں اور ہمارے تصوّر میں ایک بہت بڑا فرق یہ ہے کہ دُوسرے لوگ ہر بات کو قسمت پر اور تقدیر پر ڈالتے ہیں ہمارے یہاں یہ نہیں ہے۔ ہمارے یہاں خدا تک جا ملنا ممکن ہے ہمارے یہاں بہت کچھ کام کیا جا سکتا ہے، یہ اسماعیلیوں کی شان ہے، امامؑ کے مُریدوں کی شان ہے کہ وہ اعلیٰ سے اعلیٰ کام کرتے ہیں محنت کرتے ہیں، محنت! آپ نے اپنی محنت کو کبھی کاؤنٹ کیا؟ کبھی شمار کیا؟ کس قدر آپ کو شان ہیں کتنا کام کرتے ہیں؟ عبادت کے معاملے میں، میں کہتا ہوں کہ کبھی آپ یہ بھی سوچیں ایک پلڑے میں دُنیوی محنت جو آپ کرتے ہیں وہ رکھیں اور دُوسرے پلڑے میں رُوحانی محنت مشقّت رکھیں، انصاف سے دیکھیں! دُنیوی محنت کتنی ہے اور اُخروی یا کہ رُوحانی محنت کتنی ہے؟ دونوں کو انصاف سے دیکھیں اور آپ یہ بھی دیکھیں کہ دُنیا کی زندگی کی مدّت کتنی لمبی ہے اور آخرت کی جو عمر ہے وہ کتنی لمبی ہے اُس کو بھی دیکھیں۔ اگر آپ اِس نتیجے پر پہنچیں کہ آخرت کی زندگی کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے اور دُنیا کی زندگی جو ہے

وہ دو دن کی ہے تو اِس سے آپ اِس نتیجے پر پہنچیں گے کہ آخرت کے لئے زیادہ سے زیادہ محنت درکار ہوگی، کیونکہ اُس کی مدّت بہت لمبی ہے، اُس کا زمانہ کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے اور دُنیا کی زندگی جو ہے [یعنی] آپ کی عمر آخرت کی عمر کے مقابلے میں بہت محدود بہت چھوٹی ہے۔ لہٰذا آپ کو اصل میں دیکھا جائے تو دُنیا کے لئے تھوڑی سی محنت کرنی چاہئے۔ چلئے خدا نے یہ بھی معاف کیا تو اِس معافی کے بعد آپ کم سے کم جتنی محنت دُنیا کے لئے کرتے ہیں اتنی محنت آخرت کے لئے کریں تو پھر بھی مولا کی اُس میں رحمت ہوگی اور مولا کی رحمت کی وجہ سے وہی محنت آپ کے لئے کافی ہوگی جو آپ حصولِ آخرت کے لئے، حصولِ رُوحانیت کے لئے تھوڑی سی کرتے ہیں اور اُس میں مولا اپنی طرف سے کچھ برکتیں بھی ڈالے گا اُس میں وزن آجائے گا۔ لیکن سچ پوچھو تو حالت یہ ہے کہ ہم رُوح کے لئے، آخرت کے لئے، دین کے لئے جو کوشش کرتے ہیں وہ بہت تھوڑی ہے جو مشقّت ہم اُٹھاتے ہیں وہ بہت تھوڑی ہے۔

اُس کی مثال یہ ہے کہ جب ہم سوتے ہیں اور سونے سے پیشتر جب ہم بستر میں جانے کے لئے سوچتے ہیں تو ہم کو صبح کے اُٹھنے کا ڈر نہیں ہوتا ہے، ہم کو خوف نہیں ہوتا ہے، ہم مطمئن ہو کر آرام سے سوتے ہیں۔ اگر ہمارے دل میں خوف ہو تو صبح ایک دم سے چونکیں [اور اگر] ہمارے دل میں شوق ہو تو بروقت جاگیں اور ہمارے دل میں تڑپ ہو تو ہماری عبادت کا جو سلسلہ ہے وہ جاری رہے اور اُس میں کوئی خیال کوئی وسوسہ کوئی دُوسری بات مخل نہ ہو۔ ایسا نہیں ہے، ہم میں عشق نہیں ہے امام سے، دُنیا سے ہے، دُنیا سے کافی ہے، اپنے کاروبار سے کام کاج سے بال بچّوں سے یہ سب دُنیا ہے اِس کو دُنیا کہتے ہیں تو دُنیا سے ہماری محبّت ہے۔ لیکن مولا سے ہماری محبّت برائے نام ہے زور زور سے کبھی خود میں مولا کی محبّت کو پیدا کرنے کے لئے کوشش کرتے ہیں وہ شاید عارضی طور پر پیدا بھی ہو جاتی ہے لیکن مستقل نہیں ہے۔ اگر ہم چاہیں کہ ہمارے اندر مولا کی محبّت مستقل ہو دائمی ہو تو اُس کے لئے جدوجہد کرنے کی ضرورت ہوگی، ہم اُٹھیں، بیٹھیں، جاگیں، سوئیں، کھائیں، پیئیں اور آرام کریں ہر حالت میں مولا کو یاد کریں خود کو محبّت کی رسّی سے اُس سے وابستہ کریں اور اُس کے دامن سے کبھی ہاتھ کو نہ چھوڑیں، ہم دائم الذّکر ہو جائیں، جب دائم الذّکر نہیں ہیں تو صبح کے وقت جو ہم عبادت کرتے ہیں وہ لگتی نہیں ہے، وہ ٹھہرتی نہیں ہے، ہمارے اندر نیکی کی قوتیں موجود ہوں اور اگر ہم نے اپنے لئے بہت سارے فرشتے دوست بنا لئے ہوں تو صبح کے وقت وہ فرشتے ہماری مدد کریں گے، ہماری عبادت کے دوران وہ مدد کریں گے اور ہماری عبادت میں ایک دم سے طرح طرح کی برکتیں پیدا ہو جائیں گی اور ہماری عبادت ہم کو ایک خاص مقام تک پہنچا دے گی، اِس کے لئے ہماری کمی ہے، کیا ہم کو اِس کمی کا احساس نہیں کرنا چاہئے؟ یہ دانشمندی نہیں ہے کہ ہم اپنے اُوپر تبصرہ کریں اپنے حالات پہ تبصرہ کریں غور کریں، جاگیں، خوابِ غفلت سے جاگیں اور عبادت کو ناکافی سمجھیں، ہم گمان میں پڑے ہیں کہ ہم عبادت کرتے ہیں اور اُس کے وزن کو ہم نہیں سمجھ پا رہے ہیں کہ اِس کا (Result) کیا آتا ہے۔

جس طرح ایک سُست لڑکا برائے نام اسکول جاتا ہے لیکن اُس کا دل (Lesson) میں نہیں، وہ کھیل کود میں اور آنے جانے میں، کھانے پینے میں اور شوقیہ چیزوں میں اپنے وقت کو ختم کرتا ہو اور جب امتحان آتا ہے تو نمبرات اُس کے بہت کم ہوتے ہیں اور (Result) کچھ نہیں آتا ہے پھر وہ کبھی تو ماسٹر سے جھگڑا کرتا ہے، کبھی گھر میں کسی سے جھگڑا کرتا ہے کہ یہ نہیں ہے وہ نہیں ہے۔ تو ناکامی کے وقت انسان کی یہ عادت ہے کہ اِس میں اُلجھ جاتا ہے، اُس میں اُلجھ جاتا ہے وہ اپنے اُوپر ذمّہ داری لینے کے لئے تیّار نہیں ہے یہ انسان کی فطرت ایسی ہے۔ اِس کے لئے خدارا!! دانشمندی یہ ہے کہ کمی اور کوتاہی کو خود ہی قبول کریں، دیکھیں شروع میں کیا ہوا شیطان اور آدم کے درمیان جو جھگڑا ہوا تھا آدمؑ نے چھوٹی سی غلطی کی [اُس کو] اپنے اُوپر لیا اور شیطان نے کیا کیا؟ بس خدا سے حجّت بازی شروع کی، کہا کہ نہیں یہ نہیں ہوسکتا تھا، وہ نہیں ہو سکتا تھا یہ ایسا تھا وہ ایسا تھا تو خدا کے ساتھ اُس نے بحث شروع کی، دیکھا کہ شیطان میں اور آدم میں کیا فرق ہے؟ آدمؑ نے آنسو بہائے چھوٹی سی غلطی کی تھی، اُس غلطی میں بھی حکمت تھی اُس میں بھی آبادی تھی، دُنیا میں نہ آتے تو اتنی ساری نسلِ انسانی آباد نہ ہوتی اتنا سارا جہان پُر رونق نہیں ہوتا۔ اِس کے باوجود اُس نے تسلیم کیا کہ اُس سے غلطی ہوگئی پھر رویا، بہت رویا، بہت رویا بہت رویا، اگر ہم سے غلطی نہ بھی ہو تو ادب کا تقاضا یہ ہے کہ ہم خود کو قصوروار قرار دیں اور جب ہم کہتے ہیں کہ مولا کا اختیار ہے یہ اگر ادب کے طور پر کہتے ہیں تو صحیح ہے، اگر ذمّہ داری سے ہم خود کو سبکدوش قرار دینا چاہتے ہیں تو بات صحیح نہیں ہے اور اگر کوئی نیکی ہم سے بنتی ہے تو اُس کو بھی مولا سے منسوب کرنا یہ تو ادب ہے ٹھیک ہے۔ ہم نے کیا ہے لیکن چونکہ بنیادی قوتیں مولا نے ہم کو دی تھیں سرمایہ مولا نے دیا تھا، اور اُس سرمایہ سے ہم نے کوئی تجارت کی تو وہ تو مولا نے کیا یہ تو کہنے کی بات ہے۔

تو اِس لئے میں یہ چاہتا ہوں کہ مومنین تبصرہ کریں، غور کریں اور خود کو ہر وقت قصوروار ٹھہرائیں، اِس پس ماندگی میں اور پھر ہوسکتا ہے کہ مومن آگے بڑھے۔ کوئی مشین نہیں چل پڑتی ہے تو یہ مکینک کا کام ہے کہ اُس کو دیکھے اور اُس میں سے جو (Fault) ہے اُس کو دُور کرے، اُس کی اصلاح کرے، اُس کی صفائی کرے۔ تو انسان ایک طرح سے ایک مشینری کی طرح ہے ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو مشینری ہے تو مومن کو چاہئے کہ اپنا تجزیہ کرے اپنے آپ کو دیکھے اور اِس کا علاج کرے پھر کوئی وجہ نہیں ہے کہ مومن ترقّی نہ کرے۔ [یہ] بہت ہی ضروری ہے کہ اسماعیلی جو اِس قابل ہیں کہ وہ رُوحانی ترقّی کریں وہ ضرور ترقی کریں، اور دُوسرے وہ روئیں دھوئیں سر پیٹیں اور افسوس کریں، کوشش کریں تو اِس سے کیا بن سکتا ہے اور جو بن سکتا ہے تو یہاں بن سکتا ہے یعنی اسماعیلیوں کے یہاں۔ کیونکہ اِن کا امام ہے، چونکہ اِن کے یہاں نور کا سرچشمہ ہے چونکہ اِن کے یہاں رُوحانی طبیب ہے، چونکہ اِن کے یہاں سب کچھ یہ دولت ہے، نعمت ہے، چونکہ یہ ست پنتھ پر چل رہے ہیں تو منزلِ مقصود کو پہنچنا عجب نہیں ہے وہ بہت ممکن ہے۔ تو آج ہم نے جو مجلس منعقد کی ہے وہ ہماری اُن محترم بہنوں کے اعزاز میں ہے جو انڈیا سے تشریف لائی ہیں اور میرے خیال میں وہ آج یہاں تشریف لائی

ہیں،نہیں آئی ہیں ۔مقصد،یہ پروگرام ایسا تھا شاید اُن کو کچھ مجبوری ہوئی،بہر حال یہ ایک بہانہ تھا اور اِس بہانے سے ہم نے چاہا تھا کہ سب عزیزان اِس میں آجائیں تو اچھا ہوا کہ آپ اتنے آئے اور اِس تعداد میں آئے اور اِس سے اِن شاءاللہ فائدہ ہوگا اور اگر کوئی اِس عبادت کے بارے میں،علم کے بارے میں کوئی سوال ہو جس کو حل کرنا چاہئے تو آپ سوال کر سکتے ہیں۔

ایسا ہے کہ دُنیا میں جو تکالیف آتی ہیں اُن تکالیف کے سلسلے میں صورتِ حال یہ ہے کہ انبیاو اولیا کبھی تکالیف سے گریز کرنے کی کوشش نہیں کرتے ہیں یہ اُن کا مقام ہے،وہ جانتے ہیں کہ اُن کی عظمت و بزرگی کا ثبوت اور اُن کی ترقّی اور خدا سے قربت ونزدیکی اسی میں ہے کہ اُن پر زیادہ سے زیادہ بلائیں نازل ہو جائیں وہ[یہ] جانتے ہیں ۔لیکن مومنین چونکہ انبیاو اولیا کے مقام پر نہیں ہوتے ہیں وہ صرف مومنین ہی کے مرتبے پر فائز ہو سکتے ہیں لہٰذا وہ اگر چاہیں تو بلاؤں سے پناہ مانگ سکتے ہیں اور خدا کی امان میں ہونے کے لئے دُعا گزار سکتے ہیں،اِس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے اور اگر کوئی تکلیف ہے تو اُس کے بارے میں یہ جاننا کہ وہ کس قسم کی تکلیف ہے؟ کیا وہ ہماری تقصیرات،ہماری غلطیوں کی وجہ سے ہے یا خالص اللہ کا امتحان ہے؟ اِس کے جاننے کے لئے بھی کوئی بات نہیں ہے اگر ہم اُس وقت اپنے گناہوں کی طرف توجّہ دیں تو یہ ایک ادب ہے ۔ہمیں یہ نہیں کہنا چاہئے کہ ہمارا کچھ قصور نہیں ہے،یہ محض اللہ کا امتحان ہو رہا ہے اِس سے زیادہ فائدہ نہیں ہے زیادہ فائدہ اِس میں ہے کہ ہم خود کو قصوروار ٹھہرائیں گو کہ وہ یعنی خدا کی طرف سے امتحان ہو یا آزمائش ہو لیکن ہمیں اُس کو یوں لینا چاہئے کہ جیسا کہ ہمارے گناہوں سے[ہم پر] یہ امتحان ہو رہا ہے،یہ تکلیف آرہی ہے۔اِس سے ہم کو فائدہ ملے گا جس طرح کہ آدم علیہ السّلام نے خود کو قصوروار ٹھہرایا،چونکہ وہ پیغمبر تھے اور پیغمبر کو ایسا کام کرنا چاہئے کہ جس میں اُمّت کے لئے مثال ہو،ہدایت ہو اور جس سے[ایک] نمونۂ عمل پیش ہو سکے،اِس طرح ہمیں اِس کے جاننے کی ضرورت نہیں ہے جو ہم پر تکلیف گزر رہی ہے وہ کس نوعیت کی ہے اور زیادہ سے زیادہ ہم اگر چاہیں تو ہر پہلو سے اُس میں عبادت ہی کو کر سکتے ہیں تو کبھی اگر ہم کو گمان گزرے کہ امتحان ہے تو ہم اُس میں ثابت قدمی کے لئے خدا سے دُعا مانگیں اور کبھی ہم کو لگے کہ یہ ہمارے فلاں گناہ کی وجہ سے ہے تو اُس میں ہم خدا کے سامنے گڑگڑائیں اور توبہ کریں تو ہر حالت میں بندگی چاہئے پستی چاہئے اور گریہ وزاری،تو یہ ہے۔

.....وہ اُن کی ترقّی جو ہے وہ اصلاً رُوحانی ترقّی نہیں ہے وہ یعنی سفلی قسم کی رُوحانیت ہے،رُوحانیت دو قسم کی ہوتی ہے ایک اعلیٰ قسم کی رُوحانیت ہوتی ہے[اور] ایک ادنیٰ قسم کی رُوحانیت ہوتی ہے اور جو ادنیٰ قسم کی رُوحانیت ہوتی ہے وہ کسی دنیاوی غرض میں استعمال ہو سکتی ہے جس طرح کہ جادوگر لوگ جادو کرتے ہیں وہ بھی ایک قسم کی رُوحانیت ہے،لیکن یہ اعلیٰ نہیں ہے ادنیٰ ہے لہٰذا وہ استعمال ہو سکتی ہے وہ سَلب نہیں ہوتی ہے اور اعلیٰ ہے تو وہ اعلیٰ رُوحانیت جو ہے وہ سَلب ہو سکتی ہے ۔سَلب ہو سکتی ہے،کیونکہ اعلیٰ رُوحانیت کا مقصد یہ نہیں ہے کہ دنیوی کام میں اُس کو استعمال کیا جائے[اور] جو ادنیٰ قسم کی

رُوحانیت ہے وہ ادنیٰ ہی ہے، لہٰذا وہ ادنیٰ مقامات پر استعمال ہوگی رُوحانیت میں ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو دنیوی مقاصد میں استعمال ہوتی ہیں، اِس لئے (Transcendental Meditation) جو کچھ بھی انہوں نے نام رکھا ہے وہ سفلیات میں سے ہیں تو اِس سے اُن کو کچھ فرق نہیں پڑتا ہے۔ اعلیٰ اور ادنیٰ قسم کی رُوحانیت میں یہ (Difference) ہے، یہ فرق ہے کہ رُوحانیت کی زمین تک سب لوگ جاسکتے ہیں لیکن رُوحانیت کے آسمان پر سوائے فرشتوں کے کوئی نہیں جاسکتا اور مومنوں کی رُوحیں فرشتوں کی حیثیت سے رُوحانیت کے آسمانوں پر پرواز کرسکتی ہیں۔

قرآن ہی میں ہے کہ اللہ نے شیاطین کو وہاں تک محدود رکھا ہے جو رُوحانیت کی زمین ہے لیکن یہ شیاطین جب آسمانِ اوّل کی طرف پرواز کرنے لگتے ہیں تو آسمانِ اوّل پر جو اللہ نے محافظ رکھے ہیں جو چمکتے ہوئے چراغ ہیں وہ چراغ اِن پر شعلے برسا برسا کر اِن شیاطین کو رُوحانیت کے آسمان سے لوٹا دیتے ہیں [۶:۳۷۔۷]۔ تو اِس سے ظاہر ہے کہ رُوحانیت کی زمین تک سب جاسکتے ہیں روشنی دیکھ سکتے ہیں۔ روشنی اگر ایک مومن کے لئے ہے تو وہ رہنمائی اور ترقّی کی علامت ہے، روشنی اگر کسی منافق کے لئے ہے، بے دین کے لئے ہے، کافر کے لئے ہے وہ باعثِ گمراہی ہے ایک ہی چیز دو کام کرتی ہے۔ سورج کو لیجئے جو ایک نور ہے یہی سورج دُنیا کو جلا بھی سکتا ہے اور دُنیا کو آباد بھی کرسکتا ہے، پانی کو دیکھئے پانی سے دُنیا کی آبادی ہے اور اسی پانی سے دُنیا کی بربادی ہے۔ تو اِس لئے جو روشنی ہے اُس روشنی کے دو نام ہیں قرآن میں، وہ [روشنی] ہدایت کا چراغ بھی ہوسکتی ہے اور [وہ] روشنی شیاطین پر برسانے والے شعلے بھی قرار پاسکتی ہے، [یعنی] دو فعل [ہوئے]۔ نور کو کبھی نار بھی کہا گیا ہے اور نار کو کبھی نور بھی کہا گیا ہے نور اور نار ایک ہے یہی نور نار بن جاتا ہے اور جن کو جلانا چاہئے جلاتا ہے اور مومنین کے لئے نار نور ہے آپ اُس قصّہ کو پڑھیں کہ پہلے پہل موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور کے مقام سے وادیٔ ایمن سے ایک روشنی کو دیکھتے ہیں اُس کو آگ قرار دیتے ہیں، آگ سمجھتے ہیں پھر آگ کی تلاش میں قریب جاتے ہیں تو الٰہی زبان میں ندا آئی، آواز آئی کہ اِس آگ کے اندر جو ہیں وہ بابرکت ہیں [۲۷:۷۔۹]۔ خدا کے وہاں اِس کی گنجائش تھی کہ اُس نور کو نار کہے آگ قرار دے کہا کہ اِس آگ کے اندر جو ہیں وہ بھی اور اِس آگ کے گرداگرد جو ہیں وہ بھی برکت والے ہیں، برکت میں ہیں [۲۷:۷۔۹] تو اِس سے معلوم ہوا کہ کبھی نور کو نار کہا جاتا ہے اور نار کو نور کہا جاتا ہے۔ یہی بات ہے کہ امام سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ نے ارشار فرمایا ہے کہ روشنی تو بہت سارے لوگ دیکھ سکتے ہیں، روشنی دیکھنے سے پتا نہیں ہے کہ وہ بھلائی کے لئے ہے یا بُرائی کے لئے ہے۔ تو دو قسم کے (Results) نکلتے ہیں جن کا ہادی اور رہنما ہے تو وہ اُسی روشنی سے بھی آگے اور آگے سے آگے اُن کو بڑھاتا ہے اور جن کا ہادی اور رہنما نہیں ہے وہ اسی روشنی میں مبتلا ہو کر اُسی کو سب کچھ سمجھ کے آگ کے شعلوں میں رہتے ہیں وہی نور اُن کے لئے نار بن جاتا ہے۔ تو میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ رُوحانیت کی زمین پر روشنیاں ہیں۔ بہت روشنیاں! مومن کے لئے روشنی ہے لیکن کافر کے لئے وہ گمراہی ہے، گمراہی اِس

معنی میں کہ لوگ اُس کو خدا کا جلال اور جمال سمجھتے ہیں حالانکہ قرآن نے ابھی ابھی کہا کہ وہ اُن چراغوں کے شعلے ہیں جو شیاطین کو واپس کرنے کے لئے مقرّر ہیں اور اُس میں بہت رونق ہے، اُس میں بہت کشش ہے، بہت رنگینی ہے۔ دیکھا کہ اللہ کس قدر ''خیر الماکرین'' ہے اُس کی حکمت کس قدر عجیب وغریب ہے کہ لوگ یہی سمجھتے ہوں گے کہ بس رُوحانیت کی آنکھ کھل گئی تو بس ہدایت پا گئے یہ بات نہیں۔ ہدایت ہادیٔ برحق سے وابستہ ہے اُس کی شناخت ہو اور رُوحانیت کے راستے کی نشاندہی ہو سکے تو آگے بڑھا جا سکتا ہے اِس لئے اِس روشنی کے ساتھ ساتھ لوگ بہت کچھ کر سکتے ہیں۔ لیکن اُس میں آخرت اور دین کا فائدہ نہیں ہے دُنیا کا فائدہ ضرور ہے کہ دُنیا کا فائدہ وہ کماتے ہیں (Transcendental Meditation) کرا کے دس ڈالر لیتے ہیں اور انہوں نے بہت بہت دولت کمائی ہے۔ مغرب میں جو مذہب کی بھوک ہے، تشنگی ہے انہوں نے اِس سے فائدہ اُٹھا کر کوئی چیز بنائی ہے وہ دیتے ہیں اور اپنا مطلب پورا کرتے ہیں۔

یہ سوال کہ اگر فرشتے اُوپر کی طرف جا سکتے ہیں تو جبرائیل ایک مقام پر کیوں رُک گئے اور حضورؐ کے ساتھ وہ اُوپر کو کیوں نہیں گئے؟ تو [جواب] یہ ہے کہ اگر ہم اُن فرشتوں کے ساتھ آنحضرتؐ کو بھی ایک عظیم فرشتہ قرار دیں تو اِس طرح سے بھی ہمارا سوال حل ہو سکتا ہے کہ فرشتوں کے درجے ہیں اور آنحضرتؐ وہ فرشتہ عظیم تھے جو کہ خدا کے قرب تک جا سکتے تھے اور دُوسرے فرشتوں کو یہ مقام حاصل نہیں تھا، اور اگر ہم مومنین کی رُوحوں کو فرشتے قرار دیں تو وہ بات بھی صحیح ہے کہ اُن کے بھی اپنے اپنے مقامات ہیں اِن کے اپنے اپنے درجات ہیں۔ اور مزید تشریح اگر کرنی ہے تو وہ یہ کہ جبرائیل کے متعلّق یہ سوال کرنا چاہئے کہ جبرائیل کیا ہے؟ آیا جبرائیل ایسا کوئی مخصوص فرشتہ ہے جس کا اِس دُنیا سے کوئی تعلّق نہ ہو کیا وہ ازلی فرشتہ ہے جو ہمیشہ سے ہے یا کہ جبرائیل کسی مومن کی رُوح کا نام ہے یا کہ جبرائیل ہماری قوتوں میں سے ایک قوت ہے، یہ سوال کبھی انڈیا سے آیا تھا اور ہم نے اِس کا جواب تحریر میں لایا ہے اور یہ بھی شائع ہو چکا ہے کسی مقالے میں پنج مقالوں میں سے کسی میں [مقالہ: تین سوال انڈیا سے، کتاب: علمی خزانہ، ص: ۱۵۹]۔ مطلب کی بات یہ ہے کہ جبرائیل ایک مومن کی رُوح ہے اور ساتھ ہی ساتھ جبرائیل مومن کی اپنی قوتوں میں سے ایک قوت بھی ہے، اور جبرائیل ایک فرشتہ بھی ہے کم سے کم یہ تینوں باتیں صحیح ہیں۔ پھر نتیجے کے طور پر آنحضرتؐ جو معراج کو گئے تو اُس وقت اُن کی جو مختلف قوتیں تھیں وہ قوتیں یکسان اور ایک ہی درجے میں نہیں تھیں تو اُن میں جو جبرائیل کی قوت تھی وہ آخری مقام سے پہلے ختم ہو گئی، رُک گئی، الگ ہو گئی۔

لہٰذا آنحضرتؐ میں جو دُوسری قوتیں تھیں یا آنحضرتؐ کی جو ''انا'' تھی وہ حقیقت کے آخری مقام تک پہنچ سکتی تھی اور جبرائیل فرشتہ [کی قوت] جو آنحضرتؐ کی عقل کی حیثیت سے تھی وہ پیچھے رہ گئی کیونکہ خدا تک عقل نہیں جا سکتی ہے۔ خدا کی اپنی حقیقت کسی کی دستگیری کرتی ہے انسان کی عقل خدا تک نہیں جا سکتی ہے، انسان کی عقل کا ایک مقام ضرور ہے اُس کی اہمیت ضرور ہے لیکن ایسا نہیں ہے کہ انسان کی عقل خدا کو (Cover) کرے اُس پر حاوی ہو جائے۔ اِس کی مثال

مادّی طور پر ہم یوں دے سکتے ہیں کہ جب ہم آنکھ اُٹھا کے سورج کو دیکھنا چاہتے ہیں تو یہ دیکھنا ہے یہ سوچنا ہے کہ کیا ہماری نظر کا تیر سورج کے سر چشمے تک پہنچ سکتا ہے یا کہ سورج کی کرنیں ہماری آنکھ تک پہنچ سکتی ہیں دونوں باتوں کو سوچنا چاہیئے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ ہماری نگاہ کا جو تیر ہے وہ دس بارہ میل تک بھی نہیں پہنچ سکتا، بات اصل یہ ہے کہ جب ہم آنکھ اُٹھا کر سورج کو دیکھنا چاہتے ہیں تو سورج کا نور اپنے تیز بہاؤ سے ہمارے استقبال کو آتا ہے ہماری آنکھ کو پہنچتا ہے۔ خدا کے معاملے میں بھی کچھ یوں ہے کہ: لَّا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ (۶:۱۰۳) خدا کو کوئی نظر پا نہیں سکتی، بلکہ خدا تمام نظروں کو پا سکتا ہے یعنی مطلب یہ ہے کہ خدا خود کو کسی تک پہنچا دیتا ہے۔ لہٰذا معراج کے معاملے میں عقل جو جبرائیل ہے وہ پیچھے رہتی ہے اور جس کو وصال ہوتا ہے وہ خدا کی (Unity) خدا کی ہدایت، خدا کی تائید کی قوت سے اور وحی و الہام کی قوت سے جو عقل سے بالا ہے اُس کی قوت سے کوئی کچھ سمجھتا ہے یہ اِس کا اشارہ ہے۔ بہر حال مومنوں کے رُوحانیت کی طرف پرواز کے سلسلے میں اِس گفتگو سے کوئی نفی ثابت نہیں ہوتی ہے اور امامؑ نے فرمایا ہے کہ فلان فلان پیر فرشتے ہو گئے اِس لئے کہ انہوں نے فلاسفی بہت پڑھی تھی [زنجبار، ۱۴/۹/۱۸۹۹، خزینۂ جواہر] تو دین کی فلاسفی پڑھنے سے کوئی فرشتہ ہو سکتا ہے تو یہاں فلاسفی سے دینی حکمت تاویل اور علمُ الیقین مُراد ہے اِس کے سمجھنے سے کوئی فرشتہ بن سکتا ہے۔ اب اگر ہم اِس دُنیا میں رہتے ہوئے جس طرح اِس وقت اِس مجلس میں ہم علمی طور پر ذہنی طور پر پرواز کر رہے ہیں جب ہم اِس وقت معراج کی باتیں کرتے ہیں اور آسمانِ رُوحانیت کی باتیں کرتے ہیں تو یہ ہماری پرواز ہے۔ تو جب ہم علمُ الیقین میں پرواز کر سکتے ہیں تو یقیناً عین الیقین کے مقام پر بھی پرواز کر سکیں گے، اِس سے ثابت ہوا کہ علم ہی ہم کو وہ صلاحیت عطا کر سکتا ہے جس سے کہ ہم فرشتے بنیں، [یعنی] کسی کا فرشتہ بننا علم اور عبادت سے ہے۔ فرشتوں کی بات پوچھیں کہ فرشتہ کیا ہوتا ہے؟ اُس میں دو باتیں ہیں عبادت [اور] علم، فرشتے کی عبادت آٹو میٹک ہے، جس طرح گلاب کے پھول سے مسلسل خوشبو مہکتی ہے لیکن گلاب سے خوشبو [تو] کبھی ختم ہوگی اور فرشتے کی عبادت کبھی (Stop) نہیں ہوتی ہے۔ تو اِس معنی میں فرشتے کی عبادت آٹو میٹک ہے۔ ہم بھی اگر کچھ کچھ آٹو میٹک ہو جائیں عبادت میں تو اسی موجودہ وقت میں فرشتہ بھی ہو سکتے ہیں، ہم اگر پوری طرح سے آٹو میٹک نہ ہو جائیں تو اکثر و بیشتر عبادت کیا کریں تو ہم کسی حد تک فرشتے کے مقام پر ہو سکتے ہیں۔

آپ کے سوال کا جواب اِس طرح سے دیا جائے گا کہ فرشتے جو ہیں وہ دو قسم کے ہیں ایک ہیں جلالی [یعنی] بڑے فرشتے، اور ایک ہیں جمالی [یعنی] چھوٹے فرشتے، چھوٹے فرشتے اور بڑے فرشتے۔ اب اگر ہم انسان ہیں تو ہمیں جلالی فرشتے بننا ہے بڑے فرشتے بننا ہے، ویسے بھی ثابت ہے جیسا کہ آپ نے سنا ہے کہ عقلِ کُل جو ہے وہ ایک عظیم فرشتہ ہے جو خدا کے قلم کی حیثیت سے ہے اور نفس کُل جو ہے وہ ایک عظیم فرشتہ ہے جو خدا کی لوح کی حیثیت سے ہے۔ لیکن اِس کے علاوہ چھوٹے فرشتوں کی مثال یہ ہے کہ ہمارے اندر جتنی قوتیں، صلاحیتیں ہیں وہ جمالی فرشتوں کی حیثیت سے ہیں اور یہ

ایک سوال ہے کہ آدمؑ جن فرشتوں کا مسجود قرار پایا تھا وہ جلالی تھے یا جمالی تھے؟ یہ ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور اِس سوال کے حل کرنے سے آپ کے اِس سوال میں بڑی مدد ملتی ہے اگر ہم کہیں کہ آدمؑ اپنے وقت میں کائنات کے سب فرشتوں کے مسجود تھے تو پھر اُس میں مطلب یہ ہوگا کہ عقلِ کُل بھی اُس وقت نادان تھا نفسِ کُل بھی کچھ نہیں سمجھتا تھا اور ''حملۃ العرش'' عرش اللہ کے جو عرش کے اُٹھانے والے فرشتے ہیں وہ بھی کچھ نہیں سمجھتے تھے جب ہی تو آدم نے اُن سب کو علم دیا اِس کا (Result) اِس طرح سے نکلے گا۔ اگر ہم کہیں کہ یہ بات نہیں ہے معاملہ آدمؑ کے اپنے آپ میں تھا اپنی ہستی کے اندر جتنے فرشتے ہیں اُن سے متعلّق بات تھی۔۔۔۔

تابعداری کریں گے، سجدے کریں گے اور دُوسری بات یہ ہے کہ فرشتوں نے جو آدم کو سجدہ کیا تھا وہ اِس طرح سے سجدہ نہیں کیا تھا جو نماز میں سجدہ کیا جاتا ہے۔ آپ کے لئے ایک نئی بات ہے اور اِس نئی بات کے ساتھ ساتھ کئی سوالات بھی اُبھر سکتے ہیں اِس کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ دیکھئے کہ تاویل کی زبان میں کہا گیا ہے کہ آدمؑ کے لئے سجدہ کرو سجدہ سے یہاں تابعداری مُراد ہے اور سجدے کی مُراد، سجدے کی تاویل بھی تابعداری ہے، فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ (۲۹:۱۵) اِس میں (Double Meaning) ہے۔ ''فَقَعُوْا'' گرو سجدہ کرتے ہوئے، ایک تو گرنا [اور] ایک سجدہ کرنا، حالانکہ ظاہر میں دیکھا جائے تو سجدہ کرنا خود گرنا ہے سجدہ کرو میں بھی یہ مطلب آسکتا تھا۔ سجدہ کرو، جھکو، گرو اور سجدہ کرو اِس کے کچھ اور معنی ہیں۔ وہ یہ کہ کبھی میں نے اُن ذرّات کا ذکر کیا ہے شاید اتفاق سے آپ اُس مجلس میں تھے یا نہیں یہ معلوم نہیں، جب قیامتِ انفرادی برپا ہوتی ہے (Individual) قیامت ہوتی ہے تو اُس وقت لاتعداد ذرّات آتے ہیں۔ وہ ذرّات ایک طرح سے ہماری اپنی قوتیں ہیں وہ ذرّات ایک طرح سے دیکھا جائے تو اُن دُنیا والوں کی رُوحوں کے اجزاء بھی ہیں تو وہ ذرّات اِس طرح سے گرتے ہیں مومن کی ہستی میں وہ ذرّات داخل ہو جاتے ہیں۔ کچھ ذرّات یہاں سے گرتے ہیں اندر [اور] کچھ ذرّات یہاں رہتے ہیں۔ تو ان کے گرنے کے لئے خدا نے فرمایا ''فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ'' تابعداری کرتے ہوئے جب یہ سب ذرّات ہمارے باطن میں گر جاتے ہیں تو یہ ذرّات تابعداری کرتے ہیں کس طرح؟ جب ہماری رُوح نکلتی ہے تو اِس کے ساتھ یہ ذرّات مل کر اُوپر کو آتے ہیں جب ہم تسبیح پڑھتے ہیں تو یہ ذرّات تسبیح پڑھتے ہیں، جب ہم گنان پڑھتے ہیں تو یہ ذرّات مل کر گنان پڑھتے ہیں، جب ہم ذکر کرتے ہیں تو یہ ذرّات مل کر ذکر کرتے ہیں یہ ہوا اِن فرشتوں کی تابعداری اور سجدہ۔ تو یہ جلالی فرشتے نہیں ہوئے جمالی فرشتے ہوئے یہ ایک انفرادی کیفیت ہوئی ورنہ کس طرح ممکن ہے کہ خدا کی سلطنت اور خدا کی بادشاہی آدمؑ سے قبل انجان ہو، کوئی فرشتہ خدا کو نہ پہچانے، کوئی فرشتہ کسی دُنیا کی چیز کا نام نہ سمجھے اور حالانکہ کتنے کتنے آدم گزرے ہیں ہمارے یہاں تو ایک آدم کا تصوّر نہیں ہے۔ بہت سارے آدموں کا تصوّر ہے، تو کس طرح ایک آدم خدا کی بادشاہی کو (Cover) کرتا ہے، بہرحال یہ آپ کے سوال کا جواب ہوگیا۔

اِن کا سوال ہے [جو کہ] بڑا اچھا سوال ہے کہ اگر ہم یہ مانتے ہیں کہ دُنیا کے اندر جس طرح ہدایت کا ایک ذریعہ ہے اسی طرح گمراہی کا بھی ایک ذریعہ ہے اِس موجودہ وقت ،میں لیکن آدم کے زمانے میں جس شیطان نے آدم کی تابعداری سے یا سجدے سے انکار کیا اِس کا سبب کیا ہوا کہ اُس سے قبل کوئی شیطان نہیں تھا اِن کا یہ سوال ہے ۔لیکن اِس سوال کے لئے میں نے ابھی ابھی کہا کہ ہمارے یہاں ایک ہی آدم [کے] ہو گزرنے کا تصوّر نہیں ہے ہمارے یہاں کئی کئی آدموں کا تصوّر رہے ۔لہٰذا آدم سے قبل آدم تھا اور ابلیس سے قبل ابلیس تھا اور یہ سلسلہ لامتناہی کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے کہ دُنیا کی کوئی ابتدا نہیں اور اِس کی کوئی انتہا نہیں یہ تو ہمیشہ سے چلتی آئی ہے اور امام نے بھی ایسا تصوّر دیا ہے ۔لہٰذا ابلیس سے آگے ایک اور ابلیس تھا اور اُس سے آگے ایک اور ابلیس تھا اور اسی طرح لاابتدا اور لانتہا۔

ابھی ابھی میں نے کہا نا کہ آدم نے تو چھوٹے سے قصور کو بھی بڑا مانا اور ابلیس نے خدا کے ساتھ حجّت بازی کی اسی بات میں یہ سوال حل ہو جاتا ہے ۔قرآن میں جو کچھ ہے اُس کے بارے میں مظہر کا کہنا صحیح ہے کہ شیطان نے خدا پر یہ الزام لگایا تھا کہ تو نے مجھ کو گمراہ کیا قرآن میں ہے کہ: رَبِّ بِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ (۱۵:۳۹) بسبب اِس کے کہ تم نے مجھے گمراہ کر دیا اور میں اِس کا انتقام بدلہ آدم سے اور اِس کی اولاد سے لے لوں گا یہ شیطان نے کہا تھا۔حالانکہ خدا نے شیطان کو گمراہ نہیں کیا تھا یہ ایک اور وضاحت طلب سوال ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اِس کی وضاحت ضرور کروں کہ اِس کے باوجود کہ خدا قرآن میں خود ہی فرماتا ہے کہ وہ جس کو چاہے ہدایت دیتا ہے اور جس کو چاہے گمراہ کر دیتا ہے (۱۴:۴) یہ کہنے کے باوجود میں کہتا ہوں کہ خدا براہِ راست نہ کسی کو گمراہ کرتا ہے اور نہ وہ براہِ راست کسی کو ہدایت دیتا ہے آپ سوال کریں کیوں؟ میں کہوں [گا] کہ اُس نے دو ذرائع پیدا کئے ہیں ۔ ہدایت کا ذریعہ اور گمراہی کا ذریعہ ۔دونوں کو پیدا کرنے کے بعد خدا سے یہ کام الگ اور دُور ہو جاتا ہے اور اِس پر جب کہ انسان کو اختیار دیتا ہے ۔ پہلے ہمیں یہ طے کرنا چاہئے کہ واقعتہً خدا نے انسان کو اختیار دیا ہے یا نہیں دیا ہے، یہ سمجھنا ہے اگر ہم مانتے ہیں کہ خدا نے انسان کو اختیار دے رکھا ہے پھر گمراہ کر دینے اور ہدایت دینے کا جو کام ہے یا جو فعل ہے وہ خدا سے الگ اور دُور رہتا ہے پھر آپ پوچھیں کہ پھر خدا نے کیوں یہ کہا کہ وہ جس کو چاہے ہدایت دیتا ہے اور جس کو چاہے گمراہ کر دیتا ہے، اِس کا سبب کیا ہے؟ میں آپ کو اِس کی توجیہہ کروں گا کہ دیکھیں! اِس کی نسبت ہوتی ہے دُور سے ۔خدا کے نہ کرنے کے باوجود کسی کام کی نسبت اُس سے ہوتی ہے اُس کام کو خدا سے منسوب کیا جا سکتا ہے (Adopt) کیا جا سکتا ہے، وہ اِس طرح میں ایک مثال بیان کرتا ہوں، ایک بادشاہ ہے اُس بادشاہ نے اپنے وزیرِ اعظم سے کسی بیابان میں بستی بسانے کے لئے کہا ۔وزیرِ اعظم نے چھوٹے وزیروں سے کہا جو بادشاہ کا آرڈر تھا چھوٹے وزیروں نے رئیسوں سے کہا، رئیسوں نے اپنے ماتحت کے افسروں سے کہا، اِس طرح ہوتے ہوتے یہ بادشاہ کا آرڈر نیچے سے نیچے آیا یہاں تک کہ کچھ قُلّیوں تک [یعنی] کام کرنے والے (Workers) تک یہ آرڈر ملا تو کچھ مدّت کے بعد وہ بستی

بسائی گئی۔کام کس نے کیا؟[کام] بادشاہ سے دُور کیا گیا پھر دیکھیں کہ آرڈر اُوپر سے نیچے کو آیا اور اختیار کام کے سلسلے میں نیچے سے نیچے آتا رہا یہاں تک کہ (Workers) کو اختیار مل گیا، کام صحیح معنوں میں (Workers) نے کیا۔کام بن چکا تو پھر اِس کی رپورٹ اُوپر کو جانا چاہتی ہے (Workers) نے کام ختم کیا تو اِن کے اُوپر جو عملدار تھے انہوں نے کہا کہ ہم نے کام کیا، اپنے اُوپر کے افسروں سے جا کر کہا کہ ہم نے کام کیا۔اُن کے اُوپر کے افسروں نے اُوپر والوں سے کہا کہ ہم نے کام کیا اور ہر مقام پر ہم نے کام کیا، یہ ہوتا رہا یہاں تک کہ منسٹروں تک یہ بات گئی تو منسٹروں نے وزیرِاعظم سے کہا کہ ہم نے کام کیا اور وزیرِاعظم نے بادشاہ سے کہا کہ ہم نے کام کیا جو آپ نے دیا تھا پھر بادشاہ نے اعلان کیا کہ میں نے اپنے وقت میں یہ کام کیا۔اب آپ بتائیں کہ یہ کام کس نے کیا؟ ہر ایک صحیح کہتا ہے چونکہ یہ فعل ایسا ہے کہ یعنی عزت اور برتری کی وجہ سے اُوپر [کو جاتا ہے] غلط کام بھی اُوپر کو جاتا ہے لیکن موردِ الزام کون ہے؟ بادشاہ کا یہ منشا نہیں ہے کہ کام غلط ہو جائے جو غلطی ہوگئی تو وہ بہت نیچے رہ گئی اور جو خوبی ہوگی تو وہ اُوپر کو جائے گی، کیونکہ منشا میں خوبی مطلوب ہے، خوبی مقصود ہے، کچھ خرابی نہیں [اور] کچھ سستی مقصود نہیں ہے۔لہٰذا خدا اِس معنی میں کہہ سکتا ہے کہ میں نے کیا اِس معنی میں کہہ سکتا ہے بہت کچھ سامان ہے اور بہت کچھ ذرائع ہیں اِس کی وجہ سے خدا بادشاہ ہے، بادشاہ کہہ سکتا ہے کچھ بھی کہہ سکتا ہے، حالانکہ وہ بذاتِ خود، وہ ذاتی طور پر کسی کو گمراہ نہیں کرتا ہے، ہدایت بھی نہیں دیتا ہے وہ بادشاہ ہے۔لیکن کہہ سکتا ہے اور کہنے کے باوجود وہ ذمہ دار نہیں ٹھہرا سکتا ہے ابھی جو مثال دی گئی اُس میں اِس کی کافی وضاحت ہے تو اسی طرح خدا نے جو ذرائع پیدا کئے ہیں اور ہر چیز پیدا کی ہے اُس میں عدل ہے انصاف ہے اختیار ہے تو پھر معاملہ ختم۔اِس سے خدا پر کوئی الزام نہیں ہوسکتا ہے کہ اُس نے بُرائی کیوں پیدا کی اُس کا مقصد ہے۔خدا کا یہ مقصد نہیں ہے کہ یعنی بُرائی ہو خدا کا یہ مقصد ہے کہ بُرائی سے بچا جائے۔

ٹرانسکرائب: حبیب اللہ ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علّامہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائیؒ کا پُرحکمت بیان

عنوان: مقالہ: تین (۳) اعلیٰ سوال

کیسٹ نمبر: ۳۰۔اے   تاریخ: ۱۶ر فروری ر ۱۹۷۹، کراچی

Click here for Audio

بڑی خوشی ہے کہ آج ہماری اِس چھوٹی سی محفل میں بہت سے عزیز ایسے ہیں جو علم کی قدر و قیمت کو سمجھتے ہیں جو اعلیٰ سطح کے پڑھے ہوئے ہیں۔ اِسلئے مجھے اُمید ہے کہ جو میں گزارش کرونگا اور جو میں ایک علمی گفتگو کرونگا اُس کو اچھی طرح سے قبول کیا جائیگا۔ یہ ایک آرٹیکل ہے [جو] میرے ایک عظیم دوست نے کچھ سوالات مہربانی کئے ہوئے تھے۔ مجھے گفتگو کرنے، سوچنے کا انھوں نے موقع فراہم کیا تھا جس سے میں نے کوشش کی ہے کہ اُنکے سوالات کو اچھی طرح سے سمجھوں اور اُنکے جوابات کو مہیّا کروں۔ اِس آرٹیکل کا نام ہے "تین اعلیٰ سوال"۔

"یا علی مدد! اشتیاق واخلاص اور آداب واحترام سے بھرپور دست بوسی قبول کیجئے، قربانت شوم، آپ نے اپنے پیارے مکتوب میں جو ۲۵ جنوری ۱۹۷۹ء کا ہے، رُوحانیتِ عالیہ کے تین پُرحکمت سوال فراہم کردئے ہیں، جن میں سب پہلے اور تیسرے کا تعلّق کتاب "سوسوال" سے ہے، میں آپ کے اِس پُرخلوص اعتماد اور دینی محبّت ومہربانی کے لئے ہمیشہ شکرگزار رہوں گا۔

سوال نمبر ا: جب آخرت کا گھر زندہ ہے (۲۹:۶۴) اور زندہ انسان اور اِس کے بعد حیوان ہے، لہٰذا رُوح کو کسی نہ کسی جسم میں (یہاں) آنا ہے، تو اِس صورت میں مومن کی اِس زندگی کا، اُس زندگی کے ساتھ جو چھ کروڑ سال میں رُوحانیت وجسمانیت کے مکمّل دائرے کو طے کرنے میں ہے کیا ربط ہے؟ بالخصوص نصف دائرے کے ساتھ جو رُوحانیت پر مبنی ہے؟"

یعنی پوچھتے ہیں ایک سوال سے متعلّق، دوبارہ سوال کرتے ہوئے پوچھتے ہیں کہ اگر مومن کی رُوح چھ کروڑ سال کے دائرے سے گزر کر دُنیا میں آئی ہے تو [اُس کا] اُس کی گزشتہ زندگی کے ساتھ کیا تعلّق ہے؟ کیا وہ زندگی بالکل گزر گئی یا اُس کے ساتھ اِس کا کوئی رابطہ ہے اور اگر رابطہ ہے تو کس طرح؟ انہوں نے اِس میں ایسا سوال کیا ہے۔ اِس سوال کا جو جواب ہے وہ اجزا میں ہے، پارٹس میں ہے۔ سب سے پہلا جُز ہے:

جواب (الف): ''جیسا کہ یہ امرِ واقعی ہے کہ رُوحِ انسانی اپنے خاص مقام پر قادرِ مطلق کے تمام عجائب وغرائب کی مظہرِ کامل اور صفاتِ خداوندی کا آئینۂ صافی ہے'' یہ رُوح کی تعریف ہوئی، یعنی اللہ تبارک وتعالیٰ کی ساری قدرتیں، اللہ کے سب معجزات اور عجائبات اِس پر ختم ہیں [یعنی] رُوح میں۔ یعنی اِس میں سب کچھ ہے اور اِس رُوح کے مشاہدے سے اللہ تعالیٰ کی سب قدرتیں دیکھی جاسکتی ہیں، سب عجائبات اور سارے معجزات کا مشاہدہ ہوسکتا ہے رُوح ایسی ہے'' اور اِس حقیقت کا روشن ترین ثبوت انسانِ کامل کا مبارک ومقدّس وجود ہے''۔ یعنی انسان کی رُوح میں خدا کی سب قدرتیں کس طرح جمع ہیں اُس کا ثبوت انسانِ کامل ہے،'' یعنی پیغمبرؑ اور امامؑ جو ہر زمانے میں موجود اور حاضر ہے کیونکہ انسان اور انسانیت کی رُوحانی ترقّی کا عملی نمونہ وہی ہے، چنانچہ جب ہمارا تصوّر یہ ہے کہ مومن کی زندگی ایک ایسے دائرے پر ہمیشہ سے گزرتی چلی جارہی ہے کہ جس کی نہ تو کوئی ابتدا ہے اور نہ ہی کوئی انتہا اور وہ دائرہ رُوحانیت وجسمانیت دونوں پر محیط ہے۔ اب اگر اِس صورتِ حال پر ذرا غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ کس طرح انسان کی جزوی زندگی دائرۂ اعظم کی کلّی زندگی کے ساتھ مربوط اور وابستہ ہے، وہ یہ کہ آدمی خواہ جسمانیت کی طرف جی رہا ہو یا رُوحانیت کی جانب، ہر حالت میں دائرۂ کلّی سے باہر نہیں، وہ اگر آج دائرے کے جسمانی حصّے میں ہے تو بالواسطہ رُوحانی حصّے سے بھی ربط وتعلّق رکھتا ہے''۔

یہ تشریح ہوئی اِس بات کی کہ جس بہت بڑے سرکل کا یہاں سوال پیدا ہوا ہے، اُس بڑے سرکل سے انسان کا رابطہ ہے، تعلّق ہے، کنیکشن ہے، اِس لئے کہ اگر انسان آج اِس عظیم سرکل کے ہاف [حصّے] میں جسمانیت کی طرف جی رہا ہے تو پھر دُوسرے ہاف سرکل کے ساتھ بھی (Indirect) تعلّق رکھتا ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ وہ اِس دائرے سے باہر گیا ہے [بلکہ] اُسی دائرے میں ہے جس پر کہ وہ پہلے بھی گھومتا آیا ہے۔ گو کہ اب اِس طرف ہے جس طرح کہ سیارۂ زمین کو لیجئے، اگر ہم سیارۂ زمین کے اِس جانب ہیں اور امریکہ، کینیڈا کے لوگ اُس جانب ہیں تو ہمارا بھی اُس [حصّے] سے تعلّق ہے کیونکہ [وہ] ہماری زمین کا عقبی حصّہ ہے، تو ہم زمین پر رہتے ہوئے زمین کے عقب سے بھی تعلّق رکھتے ہیں۔ اسی طرح ہماری جسمانی زندگی جو یہ زندگی ہے اور رُوحانی زندگی جو گزر چکی تو دونوں ہاف، ہاف سرکل ہیں اور ملا کر ایک سرکل بنتا ہے۔ جب ہم کسی ایک سرکل پر ہیں تو دوسرے ہاف سرکل سے بھی ہم تعلّق رکھتے ہیں۔

(ب): ''اگر ہم اپنے متعلّق دو اناؤں کے قائل ہو جائیں، یعنی انائے عُلوی اور انائے سفلی، تو اِس وقت دَورِ اعظم کو ایک انتہائی عظیم گھڑی سے تشبیہہ دینی پڑے گی اور ہماری زندگی کی دو انائیں اِس گھڑی کی سُوئی کے دونوں سرے قرار پائیں گی''، یہ بہت عجیب نظریہ ہے اور میرے نزدیک بہت ہی عجیب ہے، اِس میں یہ تصوّر پیش کیا گیا ہے کہ ہماری جو خودی ہے وہ دُہری ہے یا کہ ہماری جو انائیں ہیں [وہ] دوٗ ہیں یا یوں کہنا چاہئے کہ ہماری جو زندگیاں ہیں وہ دوٗ ہیں، ایک

یہ زندگی ایک وہ زندگی۔اب اِس میں اشارہ یہ ہے کہ ہم اُس زندگی میں اَب بھی جی رہے ہیں یعنی ہم دونوں عالم میں ہیں بیک وقت(At a Time) ہم وہاں پر بھی ہیں اور یہاں پر بھی ہیں، اگر ہم وہاں ہیں تو بہت بڑے ہیں اور یہاں ہیں تو بہت چھوٹے ہیں۔

اِسی مادّی زندگی میں[سے] ایک مثال پیش کرینگے۔آدمی جب سوتا ہے تو اُس کی جو زندگی ہے[وہ] دو حصّوں میں بٹ جاتی ہے، میں بہت اچھی مثال آپ کو پیش کرونگا اور بہت کامیاب مثال۔کیا زندگی دو حصّوں میں نہیں بٹتی ہے؟ایک یہ زندگی جو جسم میں ہے۔جسم میں بھی تھوڑا سا احساس ہے، ہم اونگھتے ہیں کوئی چیز[ہمارے جسم] میں چُبھ جائے تو ہم محسوس کرینگے، کوئی جگائے تو ہم جاگیں گے، ایسا نہیں کہ بستر پر جو ہم لیٹتے ہیں[اور] جو ہمارا جسم ہے وہ بالکل بے جان ہوگیا ہو ایسا نہیں ہے۔ہم زندہ ہیں، اور دُوسری زندگی جو ہے وہ خواب میں ہے۔ہم ایک تو عالمِ خواب میں ہیں چلے گئے اور ایک بستر پر ہیں۔عالمِ خواب میں جب ہم جاتے ہیں وہ شعور کے اعتبار سے کسی قدر زیادہ روشن ہے اور بستر پر جو ہماری زندگی ہے وہ بالکل ایسی زندگی ہے جس طرح اُس بچہ کی زندگی ہوتی ہے جو ماں کے پیٹ میں ہوا کرتا ہے، تو کیا اِس مثال سے یہ ثابت نہیں ہے کہ زندگی بھی ہے وہ دو حصّوں میں بٹ سکتی ہے۔اچھا! اِس سے بڑھ کر، اس قسم کی تقسیم ہمارے شعور کی تقسیم ہے، اِس عالم میں اور اُس عالم میں۔تو ہماری یہ موجودہ زندگی اُس بچہ کی زندگی کے مشابہ ہے جو ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے۔کتنا کمزور ہوتا ہے وہ بچہ جو ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے، شعور کے لحاظ سے۔بہت ہی کمزور۔اُس کو ہم زندگی قرار دیتے ہیں، زندگی کہتے ہیں اور زندگی سمجھتے ہیں لیکن ایسی زندگی نہیں ہے جو اِس وقت ایک بالغ انسان کی ہوتی ہے۔لہٰذا ہمارا یہ شعور جو اِس دُنیا میں ہے، اُس شعور کے مقابلے میں ایسا کمزور ہے جس کی مثال میں نے خواب سے دی[جو کہ] بہت[ہی] اچھی مثال ہے اور دُنیا سے آخرت میں چلے جانے کی مثال بھی خواب ہی سے دی جاسکتی ہیں۔جب ہم خواب میں جاتے ہیں تو چل کر نہیں جاتے ہیں بس یکا یک عالمِ خواب میں پہنچتے ہیں،[ایک] رابطہ قائم ہوتا ہے اور رُوحانی طور پر چلنا، پھرنا، آنا جانا نہیں ہوتا ہے اور جب جاگتے ہیں تو چل کر واپس نہیں لوٹتے یہ مادّی مثال سے مختلف ہے، ہم یکا یک خود کو عالمِ بیداری میں پاتے ہیں، اور جب خواب میں جاتے ہیں تو خود کو عالمِ خواب میں پاتے ہیں جب ہم عالمِ آخرت میں چلے جائیں گے تو اُس وقت بھی ہمارا یہ حال ہوگا کہ یکا یک ہم خود کو عالمِ آخرت میں پائیں گے۔

دُوسری مثال بھی اِس سلسلے میں بہت ضروری ہے، یہ کہ بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ انسان خواب میں خود کو کسی تکلیف میں مبتلا پاتا ہے کسی عذاب میں، اور کسی بیماری میں کسی لڑائی میں[پاتا ہے] یا کسی جگہ میں بند ہوتا ہے یا کہیں سے گرتا ہے یا کچھ درندوں/جانوروں کے درمیان خود کو پاتا ہے اور جس سے اُس کو بہت ہی کوفت اور تکلیف ہوتی ہے۔لیکن خدا کی قدرت سے یکا یک وہ چونکتا ہے، جاگتا ہے۔جب جاگتا ہے تو شکر اِس معنی میں بجالاتا ہے کہ وہ خواب تھا وہ کہتا ہے

کہ کہیں بیداری میں یہ مصیبت ہوتی تو اِس سے چھٹکارا ہی ممکن نہیں ہوتا، شکر ہے کہ وہ تکلیف جو تھی وہ خواب کے عالم میں تھی۔ اسی طرح مومن جب عالمِ آخرت میں منتقل ہو جائے گا تو اُس وقت اُس کی یہ مادّی اور دنیوی زندگی ایک پُر تکلیف خواب کی طرح اُس کو لگے گی اور یہ جو زندگی ہے اُس کو بہت ہی مختصر لگے گی۔

بہر حال بات یہاں یہ ہے کہ ہماری دو۲ انائیں ہیں انا جس کو آپ انگلش جاننے والے "I" کہتے ہیں اور جس چیز کو مرکز کی حیثیت حاصل ہے ہمارے اندر اور جس کی وجہ سے ہم کہتے ہیں میری رُوح، میری عقل، میرا سر، میرے ہاتھ، میرے پاؤں ہر چیز کو اسی سے (Adopt) کرتے ہیں، کس سے؟ "I" سے۔ چونکہ "I" جو ہے وہ ایک بے مثال چیز ہے جس طرح خدا کی کوئی مثال نہیں ملتی ہے، خدا بے مثال ہے اسی طرح انسان کے اندر کے اندر بھی ایک بے مثال چیز ہے اور وہ "I" ہے۔ وہ رُوح نہیں ہے، وہ عقل نہیں ہے وہ ہاتھ پاؤں اور ظاہر وہ باطن کی کوئی چیز نہیں ہے وہ ایک بے مثال حقیقت ہے۔ وہ پائی نہیں جاتی ہے لیکن نہ پائے جانے کے باوجود وہ ہے ایک حقیقت اور وہی سب کچھ ہے۔ تو اِس قسم کی جو "I" ہے وہ دو ہیں۔ جس کو اردو میں اور فارسی میں ''انا'' کہا جاتا ہے تو ہماری دو۲ انائیں ہیں جس کو بعض دفعہ خودی بھی کہا جاتا ہے، ہماری دو۲ خودیاں ہیں ایک یہ جو سُفلی ہے ادنیٰ قسم کی ہے [اور] ایک وہ جو عالم بالا میں ہے۔ اگر ہم اِس تصوّر کو مانیں تو اِس کا مطلب یہ ہوگا کہ چھ کروڑ برس کا جو ڈائل ہے، زندگی کا ڈائل وہ گویا کہ گھڑی ہے (Watch) ہے اور اُس کے اندر چلنے والی شئی کیا ہے؟ وہ ہماری خودی ہے۔ اُس صورت میں ہماری زندگی کے دو۲ سِرے ہونگے، دو۲ یعنی (Two Ends) ہونگے ایک وہ [اور] ایک یہ، تو اگر چھ کروڑ برس کا جو ڈائل ہے وہ ہماری بڑی زندگی کی گھڑی ہے تو اُس پر ہماری جو خودی ہے وہ گھڑی کی سوئی ہے۔ لیکن گھڑی کی سوئی کس طرح چلتی ہے، آپ جانتے ہیں اُس کے دو۲ سِرے ہوتے ہیں، ایک سرا مرکز پر رہتا ہے دُوسرا سرا گھومتا ہے، تو ہماری زندگی دُنیا میں اِس طرح سے آئی ہے۔ چھ کروڑ برس کی مسافتوں کو طے کر کے دُنیا میں آئی ہے اور جائے گی۔ یہ ہر وقت آئے گی اور جائے گی لیکن ایک زندگی جو ہے سوئی کے مرکز والے سِرے کی طرح وہاں پر قائم اور دائم ہے۔

''اِس مثال سے یہ حقیقت سُورج کی طرح روشن اور ظاہر ہو جاتی ہے کہ ہمارا رابطہ نہ صرف انائے سُفلی کے وسیلے سے عالمِ جسمانی کے ساتھ قائم ہے بلکہ ہم اپنی انائے عُلوی کے ذریعے سے عالمِ رُوحانی کے ساتھ بھی منسلک ہیں اور یہ مثال خود مونوریالزم یعنی (حقیقتِ واحدہ) سے بہت ہی قریب ہے۔'' ہمارے امام نے ایک بہت اعلیٰ تصوّر دیا ہے اور وہ مونوریالزم ہے۔ مونوریالزم کا مطلب ہے تمام حقیقتوں کی یکجائی، یعنی تمام حقیقتوں کی (Unity)، وحدت، اور یہ نظریہ اتنا اعلیٰ ہے، اِس قدر جامع ہے کہ ہمارے سب سوالات یہیں پر ختم ہو جاتے ہیں اور اِس میں خدائی رحمت کا جو تصوّر ہے [وہ] کہیں بڑھ کر ہے اُس تصوّر کے مقابلے میں جو یہود کا ہے۔ اسلام کا تصوّر یہی ہے کہ مونوریالزم اور یہود کا تصوّر وہ ہے کہ

انہوں نے کسی ایک مخصوص ہستی کو مان لیا۔ تجزیہ کرنے سے یقینی طور پر معلوم ہو جاتا ہے کہ کوئی واحد خدا کائنات و موجودات کو چھوڑ کر نہیں ہے، خدائی جو ہے وہ ایک ''متحدہ حقیقت'' ہے اور اگر وقت ملے تو میں اِس پر زیادہ روشنی ڈالونگا اور یہ اتنا اعلیٰ اور اعلیٰ سے اعلیٰ نظریہ ہے کہ اِس میں ہمارے سب سوالات ختم ہو جاتے ہیں اور اِس میں رحمتوں کی بھی انتہا ہے۔ یعنی سب رحمتیں اور سب مہربانیاں ختم ہیں کہ اگر یہ معلوم ہو جائے کہ انسان کی جو اُو پر والی "I" ہے یا جو ''انا'' ہے وہ خدا سے مل کر ہے وہ کبھی الگ نہیں ہوئی تو پھر یہ بات جنّت سے، رضوان سے اور ہر چیز سے بڑھ کر ہے، ہر چیز سے بڑھ کر ہے اور اِس کے برابر میں کوئی رحمت نہیں ہے۔ یعنی یہ انکشاف ہو جائے کہ ہم خود ہی ''کنجِ مخفی'' ہیں اور اسلام کا تصوّر ایسا ہے، اسلام کی تعلیمات کا یہ رجحان ہے کہ وہ آہستہ آہستہ مومن کو اِس حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں اور اگر آپ کو کسی آیت سے یا کسی حدیث سے ریفرینس پیش کرنے کی ضرورت ہے تو ایک حدیث کی طرف اشارہ کرنگا وہ یہ کہ بار بار مجلس میں جماعت خانہ میں اِس حدیثِ قدسی کی وضاحت کی جاتی ہے کہ خدا نے فرمایا کہ: میں ''کنجِ مخفی'' تھا میں نے چاہا کہ میں پہچانا جاؤں اور جس کے لئے میں نے مخلوق کو پیدا کیا۔ اب اِس کے خلاصے کے طور پر یہ ہے کہ کسی مومن نے خدا کو پہچان لیا تو نتیجہ کے طور پر خدا بجائے اِس کے کہ وہ خدا، بادشاہ یا مالک کی حیثیت میں خود کو پیش کرے اُس مومن کے سامنے خدا نے خود کو ایک پڑے پڑے خزانے کی حیثیت میں اُس مومن کے سامنے پیش کیا، اُس عارف کے سامنے۔ تو مطلب اِس کا یہ ہوا کہ مومن اُس خزانے کا مالک ہو گیا جس نے کہ خدا کو تمام شرطوں کے ساتھ پہچانا، کیا اِس میں مونو ریالزم کا تصوّر نہیں ہے؟ کیا اِس میں یہی بات نہیں ہے کہ ہماری دو انائیں ہیں، ایک ''انا'' وہ ہے جو خدائی میں ہے [اور] ایک ''انا'' یہ ہے جو عبدیت میں یعنی مخلوق کی حد میں ہے۔ کیونکہ جو بقایا زندگی یا (Life) آئی ہے وہ کرن کی طرح آئی ہے، بہت سی چیزیں اِس طرح آئی ہیں ہم اِس آرٹیکل میں اِس کی وضاحت کرنے والے ہیں۔

ہماری رُوح جو دُنیا میں آئی ہے وہ مادّی چیزوں کی طرح (Source) سے (Cut off) ہو کر اصل سے الگ ہو کر ہرگز نہیں آئی ہے وہ رسّی طرح آئی ہے، وہ ندّی کی طرح آئی ہے، وہ دریا کی طرح آئی ہے وہ کرن کی طرح آئی ہے وہ [گھڑی کے] اُس سرے کی طرح آئی ہے جس کا دُوسرا سرا اڈائل کے مرکز میں لگا ہوا ہوتا ہے۔ اِس معنیٰ میں یہ صحیح ہے کہ مونو ریالزم کا جو تصوّر ہے وہ دُرست ہے اور ہماری ایک ''متحدہ حقیقت'' خدا کی خدائی میں ہے اور اِس بھید کو کُلی طور پر سمجھنے کے لئے تعلیمات کی ضرورت ہے، عبادت کی ضرورت ہے تا کہ ہم میں حوصلہ ہو۔ اَب اِس وقت ہم جو کمی محسوس کرتے ہیں اور اپنی کمزوریوں کو سامنے رکھتے ہوئے ہم کو ڈر محسوس ہوتا ہے [اور] ہم پر خوف اور وحشت کی کیفیت طاری ہو جاتی ہیں کہ ہم کس طرح مونو ریالزم کو مانیں اور ہماری حقیقت خدا سے کس طرح وابستہ ہے، وغیرہ وغیرہ۔ یہ شکوک و شبہات ہمارے سامنے اِس لئے آسکتے ہیں کہ ہم میں البتہ علم کی، تعلیمات کی، عبادت کی اور ذکر کی کمی ہو سکتی ہے ورنہ حقیقت یہی

کچھ ہے جس کا میں نے اشارہ کیا۔

''(ج): اِس میں کوئی شک نہیں کہ رُوح ایک اعتبار سے دُنیا میں آئی ہے اور دُوسرے اعتبار سے نہیں آئی ہے،'' ایک اعتبار سے آئی ہے اور دُوسرے اعتبار سے نہیں آئی ہے۔ چونکہ اعلیٰ سے اعلیٰ درجے میں آپ جائینگے تو ایک قول یا ایک بات کسی بڑی حقیقت کو پیش کرنے کے لئے ناکافی ہو جاتی ہے، (Positively)، (Negatively) ہمیشہ اعلیٰ حقیقتوں کو پیش کیا جاتا ہے یہ ایک اُصول ہے، آپ اِس کو ذہن و خاطر میں رکھیں۔ کہتا ہے کہ ''اِس میں کوئی شک نہیں کہ رُوح ایک اعتبار سے دُنیا میں آئی ہے اور دُوسرے اعتبار سے نہیں آئی ہے۔'' اُس کی مثال کیا ہے آگے چل کر بتائینگے۔ ''یا یوں کہنا چاہیے کہ اگر مانا جائے کہ رُوح دُنیا میں آگئی ہے، تو پھر اِس کا آنا ایسا ہرگز نہیں جیسے کسی مادّی چیز کا آنا ہوتا ہے، جبکہ خود مادّی چیزوں کے آنے میں بھی آسمان زمین کا فرق ہے، چنانچہ جب کوئی آدمی آتا جاتا ہے تو وہ اِس میں ایک جگہ سے دُوسری جگہ منتقل ہو جاتا ہے، وہ کس قدر محدود اور مجبور ہے کہ جب یہاں آتا ہے تو وہاں موجود نہیں، اور جس وقت یہ وہاں جاتا ہے تو یہاں حاضر نہیں، اِس کے برعکس جب ہَوا آتی جاتی ہے تو اِس سے کہیں کوئی خلا پیدا نہیں ہوتا، جس کی وجہ یہ ہے کہ ہَوا آدمی کی طرح محدود نہیں بلکہ وہ بسیط ہے یعنی اپنے دائرے میں ہر جگہ موجود ہے۔''

بڑی اچھی مثال ہے، آدمی جو آتا ہے تو اپنی جگہ سے (Cut off) ہو کر اور خلا پیدا کرتے ہوئے آگے آتا ہے اور یہاں سے جب چلا جاتا ہے تو پھر یہاں خلا پیدا ہو جاتا ہے۔ اِس کے برعکس ہَوا کو لیجئے گو کہ وہ بھی ایک مادّی چیز ہے تو ہَوا جب آتی ہے تو اُس کے پیچھے کوئی خلا پیدا نہیں ہوتا ہے یعنی اُس کی جگہ خالی نہیں ہوتی ہے تو اِس لئے اُس کا آنا نہ آنے کی طرح ہے وہ آتی بھی ہے ایک لحاظ سے نہیں بھی آتی ہے ایک لحاظ سے ''اور رُوح اِس سے بہت زیادہ بسیط ہے''۔ یعنی رُوح جو ہے وہ ہَوا کی مثال سے بڑھ کر ہے، جب ہَوا ایک مادّی چیز ہے اُس کے لئے ممکن ہے کہ وہ ایک لحاظ سے آئے اور دُوسرے لحاظ سے نہ آئے تو پھر رُوح کے لئے اِس سے زیادہ ممکن ہے کہ وہ آئے بھی اور نہیں بھی آئے جس کی مثال میں نے پیش کی کہ گھڑی کی سوئی کو دیکھیں کہ سوئی آتی بھی ہے اور نہیں بھی آتی ہے۔ اِس سرے کو دیکھیں تو وہ چلتی ہے اُس سرے کو دیکھیں تو وہ ٹھہری ہوئی ہے تو رُوح کی یہ مثال ہے کہ [وہ] اصل میں ابھی بھی واصل ہے۔

''پھر آسمان کی گردش پر ذرا غور کیا جائے کہ آتا جاتا تو ہے مگر اِس کی کُلّیت اپنی جگہ پر ٹھہری ہوئی ہے۔'' (As a Whole) بحیثیتِ مجموعی آسمان اپنی جگہ پر ہے وہ گیا کہاں؟ اور آیا کہاں؟ بس ٹھیک ہے وہ اپنے دائرے میں، اپنے ڈائیل میں گھومتا ہے، پھر بھی یہ مادّی چیز ہے، جسمانی چیز ہے، رُوح نہیں ہے۔ ''لہٰذا اِس کا آنا نہ آنے کی طرح ہے'' یعنی آسمان کا آنا نہ آنے کی طرح ہے۔ ''آنے کو تو سورج کی روشنی بھی آتی ہے، ندّی بھی آتی ہے اور دریا بھی آتا رہتا ہے لیکن یہ چیزیں ایک آدمی کی طرح کب آتی ہیں۔'' ندّی آتی ہے تو اپنے اندر چلتی ہے لیکن اُس کی لمبائی کو دیکھیں کیا اُس

کا جو راستہ ہے وہ خالی ہو جاتا ہے، اُس کی جسامت وضخامت اور مسافت اور لمبائی جو ہے وہ کم ہو جاتی ہے نہیں وہ تو پڑی پڑی ہے، اِس لئے جب ندّی کا یہ حال ہے جب دریا ایسا ہے تو جب ہَوا ایسی ہے، جب آسمان ایسا ہے کہ اُس کا آنا اور نہ آنا دونوں برابر ہے تو رُوح کُلّی طور پر (Cut off) ہو کر کب آ گئی؟'' کیونکہ اِن کا یہ سرا اگر یہاں پہنچا ہوا ہے تو وہ سرا اصل سرچشمہ میں ہے۔'' یعنی ندّی، دریا کا جو (Source) ہے اُس (Source) کے ساتھ دریا کا وہ سرا لگا ہوا ہے۔'' کیونکہ اِن کا یہ سرا اگر یہاں پہنچا ہُوا ہے تو وہ سرا اصل سرچشمہ میں مربوط اور منسلک ہے، اِن مثالوں میں سوچنے سے عالمِ رُوحانیت کے ساتھ رُوح کے ربط وتعلّق کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے۔

(د): ''جب ٹی وی سے کسی انسان کی آواز سُنائی دیتی ہے اور صورت نظر آتی ہے تو کوئی چھوٹا سا بچّہ یہ گمان کرسکتا ہے کہ بس یہی کچھ جو سامنے ہے مکمّل آدمی ہے، حالانکہ ایک باشعور انسان کے نزدیک اِس کی حقیقت کچھ اور ہے اور ایک سائنس دان کی نظر میں صورتِ حال اِس سے بھی زیادہ روشن ہے، کہ جو چیز آنکھوں کے سامنے ہے وہ اصل آدمی نہیں ہے بلکہ اِس کی بولتی چالتی ایک تصویر ہے، چنانچہ ہماری یہ دُنیوی زندگی اُس اُخروی اور رُوحانی زندگی کا ایک زندہ عکس ہے''، یعنی تصویر ہے'' جو عالمِ بالا میں ازل سے قائم ہے، جس کی مثال ایک طرح سے سُورج ہے کہ وہ کُلّی طور پر اپنی جگہ چھوڑ کر آئینے میں اُتر نہیں سکتا، اور نہ ہی وہ اِس کے اندر سمو کر محدود ہوسکتا ہے۔''

اِس میں دو باتیں ہیں پہلے تو ٹی وی کی بات آ گئی، ٹی وی پر ہم شکلوں کو آوازوں کو دیکھتے ہیں کیا اِس سے ہم یہ سمجھیں گے کہ جو آواز ہے [یا] جو شکل ہے بس وہ یہی ہے اور سامنے ہے۔ اِس سے یہ سمجھانا مقصود ہے کہ عالمِ آخرت سے اور مونو ریالزم کے درجے سے ہماری زندگی کی ایک لہر آئی ہے، یہاں جس نے اِس شخصیت کے اندر ربط [یا] کنیکشن قائم کیا ہے اور اِس کنیکشن سے ایک (Life) ظاہر ہو رہی ہے، ایک زندگی، ایک شعور بن رہا ہے۔ اِس شخصیت کے سیٹ کو ہم اُٹھائیں، اِس کو اُلٹائیں، اِس کو توڑیں تو خود بخود ہم خود کو وہاں پائینگے اور اپنے آپ کو وہاں محسوس کرینگے جو عالمِ بالا ہے، جس طرح کہ سورج کے لئے کیا ضرورت ہے کہ اپنے کام کو انجام دینے کے لئے زمین پر اُترے یا کیا ضرورت ہے کہ وہ آئینے کے اندر سموئے۔ بس اُس کا یہی کرنا کافی ہے کہ وہ روشنی کو بھیجتا ہے، سورج کی روشنی آتی ہے اور عکس ڈالتا ہے (Reflection) آئینے میں، آئینے کے اندر جو سُورج ہے اُس کو دیکھ کر کوئی دانشمند یہ نہیں کہہ سکتا ہے کہ سُورج بس یہی کچھ ہے، حالانکہ یہ ایک عکس ہے سُورج کا اور اصل جو سُورج ہے [وہ] اپنے مقام پر ہے، اُس کو اپنی جگہ چھوڑنا نہیں ہے تو رُوح اِس سے بڑھ کر ہے، وہ اپنے سرچشمہ کو کیسے چھوڑے۔ وہ اپنے عکس کو ڈال سکتا ہے اِس شخصیت کے آئینے کے اندر، سُورج نظر آسکتا ہے اور کوئی سمجھنے والا یہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ یہ سُورج ہے، یہ سُورج نہیں ہے یعنی'' سُورج آئینے کے اندر سمو کر محدود نہیں ہوسکتا ہے۔ مگر ہاں یہ دُرست ہے کہ وہ اِس پر اپنا عکس ڈالتا ہے، جس کو دیکھ کر کوئی سادہ لوح آدمی یہ خیال

کرتا ہے کہ سُورج آئینے میں آیا لیکن سُورج خود آیا کہاں ہے یہ تو اُس کا عکس ہے، اِس مثال سے ہمیں رُوح کے تصوّر کے سلسلے میں کافی مدد مل سکتی ہے۔"

"(ھ): اب ہم بڑی آسانی کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہماری اصل رُوح دُنیا میں آئی ہی نہیں، مگر اِس کا سایہ یہاں آیا ہے۔" یعنی ہماری یہ زندگی جو ہے وہ سایہ ہے۔ "سایہ سے مُراد ہماری جسمانی اور جزوی زندگی ہے، جو رُوحانی اور کُلی زندگی کے درخت سے وابستہ ہے، درخت ہمیشہ اپنی جگہ پر قائم ہے، اور سایہ اپنی حدود میں حرکت کرتا ہے، اسی طرح ہماری ایک اصل یعنی کُلّی رُوح ہے، ہماری ایک کُلی رُوح ہے اور ایک جزوی رُوح ہے۔ اِس تفصیل سے یہ حقیقت روشن ہو کر سامنے آتی ہے کہ ہم اپنے شعور کی سب سے اعلیٰ سطح پر ہمیشہ ہمیشہ اصل سے واصل اور مربوط ہیں، اِس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ ہماری سابقہ زندگی اور اِس کے وہ تمام کارنامے جو دَورِ اعظم پر محیط ہیں، اور جیسے ہی ہم شعوری طور پر اس کے ساتھ مدغم ہو جائیں گے، تو سابقہ زندگی کی ہر ہر تصویر کا مشاہدہ کیا جا سکے گا" یعنی جو ہم نے چھ کروڑ سال میں جو اعمال انجام دئے ہیں ہماری اصل رُوح میں محفوظ ہیں، ہمارے کارنامے، کیونکہ خدا نے فرمایا ہے کہ جب تم یہاں سے عالمِ آخرت میں پہنچو گے اور جب تمہاری آنکھ کھلے گی تو ہم تم کو تمہارے سب اعمال دکھائینگے اور ایک آیت جو اہم ہے وہ سامنے آئیگی اور جیسے ہی ہم شعوری طور پر اِس کے ساتھ مدغم ہو جائینگے تو سابقہ اور موجودہ زندگی کی ہر ہر زندہ تصویر کا مشاہدہ کیا جا سکے گا۔ ازل میں ہم نے کیا کیا تھا؟ اور ہم پر کیا واقعات گزرے تھے وہ سب تصویروں کی صورت میں ہمارے سامنے آئینگے، دُنیا کے سائنسدانوں نے جب یہ ترقّی کی کہ وہ انسانوں کی زندگی کو زندہ تصویروں میں محفوظ رکھ سکتے ہیں، جس کو ہم فلم وغیرہ کہہ سکتے ہیں تو کیا خدا کے حکم سے یہ کوئی مشکل ہے کہ ہمارے جو "کراماً کاتبین" ہیں وہ بجائے اِس کے کہ قلم سے لکھیں ہمارے سب اعمال کو (Filmize) کریں، ریکارڈ کریں اور فلمائیں اور جب ہم عالمِ آخرت میں جائینگے تو سابقہ اور موجودہ اعمال میں سے ہم جس (Portion) کو چاہینگے وہ خدا کے حکم سے ہمارے سامنے آئے گا۔ جس سے کہ ماضی بھی مٹ جائے گا [اور] مستقبل بھی سب چیز ہمارے سامنے (Present) ہی (Present) یعنی (Past) اور (Future) جنّت میں نہیں ہے [وہاں صرف] (Present) ہے۔

جس طرح کہ خواب میں ماضی نہیں ہے، مستقبل نہیں ہے سب حال ہی حال ہے۔ یعنی خواب میں کوئی بھی بات جو گزشتہ ہو ہمارے سامنے (Present) کی حیثیت سے آسکتی ہے۔ ہمارے بچپن کی کوئی بات بھی (Present) کی حیثیت سے یعنی موجودہ وقت کی صورت میں ہمارے سامنے آسکتی ہے، تو پھر خدا کے لئے کیا مشکل ہے۔ دیکھئے! خدا جو کچھ فرماتا ہے وہ زمانے کے مطابق فرماتا ہے، اللہ کا یہ فرمانا کہ تمہارے اُوپر اعمال کے لکھنے والے فرشتے ہیں، جن کا نام "کراماً کاتبین" ہے، بزرگ لکھنے والے، باکرامت لکھنے والے۔ تو اِس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ دُنیا کے سائنسدانوں کے

آلات سے بڑھ کر کام کرتے ہیں اور ہمارے سب اعمال کو تصویروں کی صورت میں ریکارڈ کرتے ہیں لہٰذا اگر ہماری ایک سابقہ زندگی ہے جو چھ کروڑ برس میں ہم نے گزاری ہے تو وہ لوحِ محفوظ میں یعنی رُوحانیت کے عالم میں زندہ تصویروں کی حیثیت سے محفوظ ہیں۔ ہم جب جائینگے تو ہماری رُوح نے اگلی زندگی میں جو کچھ کیا تھا وہ سب کارنامے ہمارے سامنے ہونگے۔

''(و): اگر ہم عالمِ رُوحانیت یعنی رُوحِ ارواح (روحوں کی رُوح) کی تشبیہہ ایک انتہائی عظیم کائناتی ریڈیو اسٹیشن سے دیں'' یعنی اگر ہم اپنی بڑی رُوح کو اِس یونیورس کے لئے ایک بہت بڑا ریڈیو اسٹیشن قرار دیں'' اور تمام جزوی رُوحوں کو اِس کی ریڈیائی لہروں سے بجنے والے لاتعداد ریڈیو قرار دیں، تو اُس وقت ہمیں یہ بھی فرض کر لینا ہوگا کہ وہ اسٹیشن نہایت ہی عجیب و غریب اور بڑا معجزانہ قسم کا ہے، وہ جان، عقل، علم، ارادہ اور قدرت جیسی تمام اعلیٰ صفات رکھتا ہے، اِس لئے دُنیا کے اسٹیشنوں کے لئے جو کچھ ناممکن ہے اُس کے نزدیک وہ ممکن ہے اور اِس سے سب کچھ ہوسکتا ہے، اِس مثال سے مومن کی انائے علوی اور انائے سفلی کا باہمی رابطہ صاف طور پر ظاہر ہو جاتا ہے۔''

چونکہ سوال میں رابطہ کے بارے میں پوچھا گیا تھا کہ ہماری اُس عظیم زندگی سے جو گزر چکی ہے جو چھ کروڑ برس پر پھیلی ہوئی ہے جو چھ کروڑ برس کے عرصے پر محیط ہے، اُس سے ہمارا کیا ربط ہے؟ کیا کنیکشن ہے یہ سوال کیا گیا تھا، تو اِس کا جواب یوں دیا گیا کہ وہ ایک ریڈیو اسٹیشن ہے رُوحانیت کا بہت بڑا لیکن دُنیا کے اسٹیشن سے وہ مختلف اِس لئے ہے کہ اُس میں جان ہے، اُس میں عقل ہے، اُس میں علم ہے، اُس میں ارادہ ہے۔ دُنیا کے کسی اسٹیشن سے یہ نہیں ہوسکتا ہے کہ انفرادی طور پر نشر کرے، انفرادی طور پر (Message) دے اور یہاں سے بھی کوئی جواب واپس وہاں جائے لیکن اِس اسٹیشن میں یا اِس ریڈیو میں یہ بھی ممکن ہے، یہ سمجھنے کی بات ہے۔

''(ز): اِن تمام تفصیلات کا خلاصہ اور نچوڑ یہ ہے کہ رُوحِ انسانی نہ صرف ازل اور ابد میں اپنے اصل کے ساتھ ایک ہے بلکہ وہ موجودہ وقت میں بھی کئی رشتوں سے رُوح الارواح کے ساتھ مربوط اور منسلک ہے اور اِس حقیقت کی ایک عام مثال یہ ہے کہ جس طرح جسم رُوح کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا اسی طرح جزوی رُوح بھی کُلی رُوح کے سوا زندہ اور قائم نہیں رہ سکتی ہے،'' مطلب اِس کا یہ ہوا کہ ہمارے جسم کی جان ہے، ہمارے جسم کی جان ہے، اِس لئے جسم کھڑا ہوتا ہے، چلتا ہے پھرتا ہے، زندہ ہے، اسی طرح ہماری جو جان ہے اُس کی بھی ایک جان ہے تو اُس کی جان کیا ہے؟ وہی حقیقت انائے علوی جس کا ذکر ہوا اور جس کا ایک پیکر دُنیا میں ظاہر ہے اور وہ انسانِ کامل ہے یعنی پیغمبر اور امام۔ پیغمبر اور امام اِس معنی میں ہیں ہماری ترقّی کے نمونے ہیں۔

''اِس کے معنی یہ ہوئے کہ نہ صرف ہمارا جسم ایک جان رکھتا ہے بلکہ ہماری جان کی بھی ایک جان ہے اور وہ عالم

گیر رُوح ہے''یعنی جو (Universal Soul) ہے وہ ہماری جان کی جان ہے''یعنی کائناتی رُوح، جس کے اور بھی بہت سے نام ہیں، جیسے رُوحِ اعظم، رُوح الارواح، رُوحِ کُلی، عالمِ رُوحانیت، عالمِ بالا، لوحِ محفوظ، کرسیٔ الٰہی وغیرہ'' یہ سب اسی انائے علوی کے بہت سے نام ہیں'' چنانچہ رُوحِ جزوی اور عالمِ رُوحانیت جسم اور جان کی طرح مربوط اور منسلک ہیں اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ مومن کی طویل ترین رُوحانی زندگی (جو دَورِ اعظم کے نصف دائرے سے تعبیر ہے) رُوحِ کُلی سے الگ نہیں، لہٰذا اسی معنی میں مومن اپنی سابقہ رُوحانیت سے ربط و تعلّق رکھتا ہے اور اِس کا تصوّر کرتا ہے، اور جن لوگوں کو بنیاد ہی سے اِن ازلی اور ابدی حقائق کا تصوّر نہ ہو تو اُن کی مذمّت کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا'' جو سورۂ یاسین میں ہے'' کہ: ہم نے ایک دیوار اُن کے آگے بنادی ہے اور ایک دیوار اُن کے پیچھے پھر اُوپر سے اُن کو ڈھانک دیا ہے تو وہ کچھ دیکھ نہیں سکتے ہیں (۳۶:۹)''۔ یعنی اگر یہ ممکن نہ ہوتا کہ انسان درجۂ کمال پر پہنچنے کے بعد ازل کو بھی پاسکتا ہے ابد کو بھی پاسکتا ہے اگر یہ بات نہ ہوتی تو خدا نے طنز کے طور پر یہ کیوں فرمایا کہ ہم نے اُن منکرین کے سامنے بھی ایک دیوار بنا دی ہے اور اُن کے پیچھے بھی ایک دیوار بنادی ہے اور اُوپر سے اُن کو ڈھانپ دیا ہے۔ تو اِس سے دُنیا کی یہ دیواریں مُراد نہیں ہیں یہ جہالت و نادانی کی دیواریں ہیں جو جاہلوں کے سامنے کھڑی کر دی گئی ہیں اور وہ لوگ جہالت کے پردے میں اور لاعلمی کی تاریکی میں پڑے ہوئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ خدا جب کچھ لوگوں کو طنز کے طور پر یہ فرماتا ہے کہ وہ ازل کو اور ابد کو نہیں دیکھتے ہیں تو اِس سے ظاہر ہے کہ اِس کا دیکھنا ممکن ہے۔

''اِس آیۂ کریمہ کی روشنی میں بغور دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان علمی اور عملی طور پر نہ صرف ابد کے احوال تک رسائی کرسکتا ہے بلکہ وہ اسی طرح ازل کو بھی پہنچ سکتا ہے''، ایسا نہیں کہ ہمارا جو رُخ ہے وہ ابد کی طرف ہے تو ہم ابد کو پہنچیں گے اور ازل جو سابقہ وقت ہے وہ تو ہم سے گزر چکا اور اُس سے رسائی ناممکن ہے، یہ بات نہیں ہے، جب یہ ایک سرکل ہے تو ہم ابد کی طرف جاتے جاتے ازل کو پائینگے۔ کسی دائرے میں جب کوئی آدمی بھاگتا ہے، چلتا تو جہاں سے وہ اسٹارٹ کرتا ہے وہ چلتا ہے، بھاگتا ہے تو اِس گول چکر میں وہ اُس جگہ پر مڑے بغیر، پیچھے منہ کئے بغیر اسی مقام کو پہنچتا ہے۔ جب ہم عالمِ آخرت میں جائینگے تو اُس وقت ازل اور ابد ایک ہو کر ہمارے سامنے آئینگے۔ ابھی ابھی میں نے تشریح کی تھی کہ عالمِ آخرت میں ازل، ابد، حال (Present) بن کر ہمارے سامنے آتا ہے، جس کی مثال میں نے ابھی ابھی خواب سے دی تھی کہ دُنیا میں بھی ہم نے یہ دیکھا کہ ماضی و مستقبل حال بن جاتا ہے۔ جب ہم اپنے بچپن کے واقعات کو خواب کی صورت میں پاتے ہیں تو یہ ہوا ماضی کا مستقبل بن جانا اور بعض دفعہ کچھ پیشگی طور پر کچھ باتیں دیکھتے ہیں تو یہ ہوا مستقبل کا حال بن جانا اسی طرح جب عالمِ رُوحانیت میں ہونگے تو اُس وقت ہمارا ازل اور ابد ایک ہو جائے گا اور ابھی ابھی میں نے دُوسرے لفظوں میں تشریح کی تھی کہ وہاں پر ازل کے واقعات، فرشتے ہمارے سامنے فلموں کی صورت میں پیش کرینگے جو ہماری اگلی زندگی

تھی اُس میں کچھ ہوا تھا مونور یا لزم کے ساتھ یا خدا کے ساتھ یا اپنے ساتھ جو کچھ واقعات گزرے تھے وہ کارنامے ہمارے سامنے آئینگے، تخلیقِ آدم اور کائنات کی پیدائش اور یہ سب چیزیں ہمارے سامنے آئیں گی تو یہ ہوا ازل کو پہنچنا بلکہ ہم اِس کیفیت میں ہونگے کہ خدا یا کہ وہ حقیقت جو حقیقتِ واحدہ ہے یا مونور یا لزم ہے وہ ہمارے سامنے اِس کائنات کی تخلیق کا مظاہرہ کرے گی۔ ہمارے سامنے یہ فلم بھی آئیگی کہ دُنیا کس طرح بنتی ہے اور یہ فلم بھی آئیگی کہ دُنیا کس طرح مٹائی جاتی ہے۔ قرآن میں خدا نے فرمایا ہے کہ: ایک وقت ایسا آئے گا کہ جس میں ساری کائنات کو میں اپنی مٹھی میں کرلونگا[۳۹:۶۷] تو یہ اشارہ ہے اِس زمانے کی زبان میں کہ جب حالات اور واقعات تصویروں کی شکل میں ہمارے سامنے آئینگے تو یہ ہوا اللہ کا مٹھی میں کائنات کو لینا اور وسیع اور پھیلی ہوئی چیز کو محدود کر دینا۔'' کیونکہ ازل اِس کی رُوحانیت کا ماضی اور ابد مستقبل۔''

اِس کے بعد سوال نمبر ۲۔

''سوال نمبر ۲: اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۞ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى (۵۳:۱۹۔۲۰) تو بھلا تم لوگوں نے لات وعُزیٰ اور تیسرے پچھلے منات کو دیکھا؟ کی کیا تاویل ہوتی ہے؟

جواب: (الف): بزرگانِ دین نے اپنے اپنے زمانے کے مطابق اِس آیۂ کریمہ کی پُرحکمت تاویلیں کی ہوں گی، میں اپنی بساط کے مطابق اِس سلسلے میں جو کچھ گزارش کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ بُت اور بُت پرستی نہ صرف دین کے ظاہر اور جسمانیت میں موجود ہے بلکہ یہ باطن اور رُوحانیت میں بھی پائی جاتی ہے۔'' یہ عجیب بات ہے،'' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ظاہر اور باطن کو مثال اور ممثول کے طور پر پیدا کیا ہے،'' یعنی اِس دُنیا کے ظاہر میں جو کُچھ ہے اُس کا ایک نمونہ باطن میں بھی ہے'' اور مخلوق کے ظاہر میں جو کُچھ جسمانی طور پر موجود ہے وہی دین کے باطن میں رُوحانی حیثیت میں بھی ہے، چنانچہ رُوحانیت کے جتنے درجات مقرّر ہیں وہ سب کے سب قانونِ توحید کی رُو سے بُت ہیں سوائے اُس درجے کے جو سب سے اُوپر ہے تا کہ اِس تصوّر کے سہارے سے مومن مؤحّد کو مرتبۂ آخرین حاصل ہو سکے''۔

عجیب بات ہے اور عجیب سوال ہے جو کہا گیا ہے وہ یہ کہ آپ کی ترقّی کے پیشِ نظر اگلی منزل کی جو تعریف کی جاتی ہے اور آپ کو اِس تعریف کی کشش سے وہاں پہنچایا جاتا ہے۔ جب آپ وہاں پہنچتے ہیں تو پھر اُس کی مذمّت کر کے اگلی منزل کی تعریف کی جاتی ہے، یہ عجیب اُصول ہے! اِس وقت ایک عام مومن جس مقام پر ٹھہرا ہوا ہے اُس کے پیشِ نظر اگلی کسی چیز کو نور قرار دیا جاتا ہے وہ ہے واقعتہً اِس معیار سے دیکھیں تو نور ہے جب آپ وہاں پہنچیں گے تو پھر اگلا جو معیار ہے اُس کے پیشِ نظر اِس کو آگ کہا جاتا ہے، یہ عجیب بات ہے! لیکن عجیب نہیں ہے قانونِ فطرت یہی ہے۔ میں اِس کی ایک مثال بتاؤں بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے تو خون پیتا ہے جو سینہ سے جمع ہوتا ہے وہ بہت خراب خون ہے میں

اُس کی وضاحت نہیں کرسکتا ہوں وہ یہ خون پیتا ہے ناف کے راستہ سے۔فرشتہ کہتا ہے کہ اے بچہ اب اِس کو چھوڑ دُنیا میں نکل جا تیرے لئے وہاں دودھ کا اہتمام اور انتظام ہوگا، بچہ کہتا ہے ارے فرشتے! میری خوراک اور میری غذا سے بڑھ کر کوئی لذیذ اور میٹھی چیز ہوسکتی ہے تم مجھ کو اِس سے محروم کرنا چاہتے ہو، وغیرہ۔لیکن بہرحال جب وہ پیدا ہوتا ہے تو وہ دودھ پینے لگتا ہے،[دودھ] پیتا ہے ایک عرصے تک جتنے عرصے تک کہ پینا چاہیے۔اُس کے بعد فرشتہ پھر کہتا ہے ارے بچہ! اب تم دودھ کو چھوڑو اِس سے بہتر غذائیں کھاؤ جو دُنیا کی نعمتیں ہیں وہ کہتا ہے ارے صاحب! تم تو ہمیشہ یہی کہتے ہو کہ چھوڑو میں کیسے چھوڑوں! اتنی شیرین چیز کوئی ہوسکتی ہے جو میری ماں کا دودھ ہے، وہ انکار کردیتا ہے۔لیکن بہرحال اُس کی ماں بھی یہی کوشش کرتی ہے کچھ کالک لگائے کچھ کرے مرچ لگائے وغیرہ، بعض علاقوں میں کوئی ایسی چیز کرتے ہیں جس سے کہ بچہ (Bore) ہوجائے اور دودھ کو چھوڑے، یہی ہوتا ہے نا! اچھا!!۔

تو رُوحانیت میں بھی یہ بات ہوتی ہے جو چیز جس منزل کے لئے اچھی ہے، مناسب ہے، بہترین ہے پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُس کی مذمّت کی جاتی ہے۔اسی طرح لوگ تو یہ سمجھتے ہیں کہ جہاں قرآن میں بُت پرستی کا ذکر ہے اور بُت پرستی کی مذمّت کی جاتی ہے تو وہ صرف انہی بُتوں کو سمجھتے ہیں جو دُنیا میں ہیں، لیکن خدا کا کلام ایسا ہے کہ وہ (Cover) کرتا ہے، تمام درجات کو اور تمام ضروری باتوں کو (Cover) کرتا ہے، یعنی میرے کہنے کا مطلب [یہ ہے کہ] خدا کی ہدایت کا رُوحانیت کے بُتوں پر بھی اطلاق اُس کا ہوتا ہے اور ظاہری بُتوں پر بھی اِس کا اطلاق ہوتا ہے۔تو رُوحانیت کے بُت کیسے ہیں؟ رُوحانیت کے بُت دُنیا کے بُت سے اچھے تو ہیں لیکن اُوپر کے معیار سے دیکھا جائے تو وہ بُت ہیں۔لہٰذا توحید کا جو قانون ہے وہ ایک وقت کے بعد اُن درجات کو چھڑاتا ہے اور چھڑانے کے لئے ہدایت کرتا ہے۔کسی بھی درجے میں ٹکے رہنا اور چمٹ جانا، آگے نہیں بڑھنا جو ہے وہ بُت پرستی ہے کیونکہ انسان کے لئے جو اعلیٰ سے اعلیٰ مقام ہے جو توحید کا مقام ہے، جو مونو ریالزم ہے، جو وحدانیت ہے جو خدا شناسی ہے، جہاں پر کہ خدا ایک چُھپے ہوئے خزانے کی حیثیت سے خود کو پیش کرتا ہے کہ یہ لو تم اِس کے حقدار ہو اُس کے حصول تک، کسی بھی منزل میں ٹھہرنا بُت پرستی ہے۔اچھا! یہی کہا گیا ہے کہ

''چنانچہ رُوحانیت کے جتنے درجات مقرّر ہیں وہ سب کے سب قانونِ توحید کی رو سے''۔کسی اور لحاظ سے نہیں قانونِ توحید کی رُو سے ''بُت ہیں سوائے اُس درجے کے جو سب سے اُوپر ہے، تاکہ اِس تصوّر کے سہارے مومن موّحد'' یعنی توحید کو جاننے والا مومن ''کو مرتبۂ آخرین حاصل ہوسکے''۔جاننا چاہیے کہ رُوحانیت کے تمام درجات صراطِ مستقیم ہی پر واقع ہیں، چنانچہ یکے بعد دیگرے اِن درجات کو پہچانتے ہوئے منزلِ آخرین کی طرف قدم بڑھانا ہدایت ہے''۔یعنی آگے جاتے ہوئے کچھ گمراہی نہیں ہے، بُت پرستی نہیں ہے، ٹھہر جانا اور رُک جانا بُت پرستی ہے، آگے جانا ہدایت ہے، پہچاننا

چاہیے رُوحانیت کے تمام درجات کو ہر چیز کو، یہاں پر میں ایک مثال پیش کروں۔آپ نے سُنا ہو گا کہ قرآن میں حضرت ابراھیم علیہ السّلام کی کتنی تعریف کی گئی ہے کہ وہ مؤحّد تھا،مؤحّد معنی خدا کی یکتائی جاننے ولا،خدا کی (Unity) جاننے والا، بہت تعریف کی گئی ہے حضرت ابراھیمؑ کی۔لیکن قصّہ آپ کو معلوم ہے کہ اُس نے سب سے پہلے ستارے کو ربّ مانا،''ھٰذَا رَبِّیۡ''(۶:۷۶۔۷۸)اور جب وہ غروب ہوااور چاند نکلا تو چاند کو ربّ مانا،جب چاند بھی غروب ہوگیا اور سُورج نکلا تو سُورج کو ربّ مانا جب سُورج غروب ہوگیا تو کہا کہ میں ڈوبنے والوں کو دوست نہیں رکھتا ہوں، میں کائنات کے مالک کو مانتا ہوں۔اب میں سوال کرونگا کہ بُت پرستی کا اطلاق ابراھیمؑ پر ہوگیا یا نہیں ہوگیا۔میں گستاخی کرونگا کہ ہوگیا،کیوں؟ اُس نے ستارے کو ربّ کہا، چاہے ہزار لفظوں سے کہا چاہے ایک لفظ سے کہا تو''ھٰذَا رَبِّیۡ''(۶:۷۶۔۷۸)تو کہا کیا ستارہ پرستی نہیں ہوئی! ستارہ پرستی ہوگئی۔چاند کو بھی اُس نے خدا مانا،سُورج کو بھی خدا مانا تو اُس نے ستارے کے طلوع سے لے کر اُس کے غروب تک، ستارے کو ربّ مانا اور پھر چاند کے طلوع سے لے کر غروب تک ربّ مانا اور پھر سُورج کے طلوع سے لے کر غروب تک ربّ مانا کیا یہ بُت پرستی نہیں ہوئی؟ ستارہ پرستی نہیں ہوئی۔لیکن نہیں! ابھی میں نے کہا نہ حدود کو پہچانتے ہوئے آگے جانا۔کیا آپ اگر پیر کو خدا مانتے ہیں ٹھیک ہے۔لیکن اِس پر نہیں ٹھہرنا اور پھر اِس کے اُوپر جو درجہ ہے اُس[میں] جانا پھر اِس کے اُوپر بھی اگر کوئی درجہ ہے تو اُس میں جانا اور اِس کے اُوپر بھی اگر کوئی درجہ ہے تو اُس میں جانا۔اِس طرح اگلے درجے کو خدا ماننا یہ کفر نہیں ہے، جو ابراھیمؑ کی مثال سے ظاہر ہے۔کسی ایک درجہ کو دائمی طور پر ماننا اور اسی پر ٹھہرے رہنا یہ بُت پرستی ہے۔

(ب):''جاننا چاہیے کہ رُوحانیت کے تمام درجات صراطِ مستقیم ہی پر واقع ہیں، چنانچہ یکے بعد دیگرے اِن درجات کو پہچانتے ہوئے منزلِ آخرین کی طرف قدم بڑھانا ہدایت ہے اور اِس کے برعکس منزلِ مقصود کے بغیر کسی مرحلے یا درجے میں پابند رہنا توحید کی نظر میں بُت پرستی ہے اور گمراہی ہے،لہٰذا قرآنِ حکیم ایک طرف جسمانی بُت پرستی کو ترک کر کے دینِ حق قبول کرنے کی دعوت دیتا ہے تو دُوسری طرف رُوحانی بُتوں کو چھوڑ کر منزلِ توحید تک رسا ہو جانے کی ہدایت بھی کرتا ہے، کیونکہ پروردگارِ عالم کے قانونِ صدق و عدل کا تقاضا ہمیشہ یہی رہتا ہے، کہ اُس کا ہر فرمان متعلّقہ ہدایت و رہنمائی میں ہر طرح سے کامل اور مکمّل ہو۔

''(ج):عزیزوں کو یہ نکتہ بھی یاد رہے کہ باطنی بُت بھی ظاہری اصنام کی طرح ہر قسم کے ہوا کرتے ہیں، چنانچہ مذکورۂ بالا آیۂ کریمہ میں جن تین بُتوں کا ذکر ہُوا ہے، وہ مثال کے طور پر رُوحانیت کی ابتلائی دیویاں ہیں،آیۂ مذکورۂ بالا میں جن تین بُتوں کا ذکر ہوا ہے وہ مثال کے طور پر رُوحانیت کی ابتلائی دیویاں ہیں''،آزمائشی دیویاں ہیں،امتحانی بیویاں ہیں۔''جن کے اسماء کے معنوں میں اُن کے احوال پوشیدہ ہیں اور اگر حقیقت اور معرفت کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ

وہی فرشتے ہیں، جن کو رُوحانیت کے بُت پرست خدا کی بیٹیاں قرار دیتے ہیں،اِس لئے کہ اگر چہ ملائک اصلاً خاصۂ رجولیّت اور نسوانیت سے بالاتر ہوتے ہیں لیکن اُن کا ظہور مرد کی صورت میں بھی ہوتا ہے اور عورت کی شکل میں بھی۔ جیسے قرآنِ مقدّس میں اِس مطلب کا ذکر آیا ہے کہ: اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى (۵۳:۲۱) کیا تمہارے لئے تو بیٹے (تجویز) ہوں اور خدا کے لئے بیٹیاں؟ یعنی جو فرشتے لڑکیوں کی صورت میں ہیں اُن کے متعلّق تمہارا یہ عقیدہ باطل ہے کہ یہ خدا کی بیٹیاں ہیں'' یہ رُوحانیت کی باتیں ہیں،'' نیز ارشاد ہے کہ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى (۵۳:۲۷) جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے وہ فرشتوں کے نام رکھتے ہیں عورتوں کے نام پر۔ اِس کے معنی ہیں کہ وہ لوگ چونکہ رُوحانیت کے حقائق و معارف سے ناواقف اور انجامِ کار سے غافل ہیں لہٰذا وہ زنانہ شکل کے فرشتوں کو دیویاں مانتے ہیں رُوحانیت میں اور یہ باطنی بُت پرستی ہے، جس کی مثال لات، عُزّیٰ اور منات ہیں، کہ یہ اصل میں فرشتے ہیں مگر اہلِ باطل نے اُن کو عورتوں کا نام دے کر دیویاں قرار دیا ہے۔ اب تیسرا سوال ہے جو سب سے بڑا سوال ہے۔

ٹائپنگ: اکبر علی پُروف: نسرین اکبر

استادِ بزرگوار علاّمہ نصیر الدّین نصیرؔ ہونزائی ق س کا پُرحکمت بیان

عنوان: مقالہ: تین (۳) اعلیٰ سوال

کیسٹ نمبر: ۳۰۔ بی   تاریخ: ۱۶ر فروری ر ۱۹۷۹، کراچی

Click here for Audio

امام شناسی، دیدار اور امام کے بارے میں اِس [مقالے] میں بہت اہم باتیں ہیں، اگرچہ آپ تھکے ہوئے ہوں گے لیکن میری گزارش ہے کہ اِس میں ذرا توجہ مبذول کریں کیونکہ اِس میں بہت اہم (Points) ہیں۔

''سوال نمبر ۳: ہر چند کہ حضرت یعقوبؑ نے بھائیوں کی دشمنی کی بناء پر حضرت یوسفؑ کو امامت کا اختیار منتقل کر دیا تھا لیکن با ایں ہمہ اُن کو امام کا دیدار نصیب نہ ہونے میں کیا حکمت تھی، جب کہ حضراتِ پنجتن پاک کی مثال میں اختیارِ ہدایت ایک شخص میں ہونے کے باوجود سب میں نور ہونے کا تصوّر پایا جاتا ہے''۔ سوال کا تعلّق چونکہ ایک کتاب سے ہے جو ''سوسوال'' کی کتاب ہے [سوال نمبر: ۸۹، یُوسف کا کُرتا صفحہ ۱۶۷۔۱۶۹] اِس لئے اِس کا (Background) یہ ہے کہ اُس کتاب کے اندر یہ کہا گیا ہے کہ یعقوبؑ جو اپنے بیٹے یوسفؑ کے لئے رویا کرتا تھا اُس میں ایک خاص وجہ تھی اور وہ وجہ یہ کہ یعقوبؑ اپنے زمانے کا امام تھا اور اُس نے یہ امامت بہت پہلے اپنے بیٹے کو سونپی تھی اور جو نور کا مرکز ہے وہ یوسفؑ کی طرف چلا گیا تھا، لٰہذا یعقوبؑ کا رونا دراصل اپنے جسمانی بیٹے کے لحاظ سے نہیں تھا بلکہ اُس کا رونا دیدار کے لئے تھا۔ یہ تصوّر پیش کیا گیا تھا، اب اِس میں سے ایک بہت بڑا سوال یہ پیدا ہوا کہ جہاں پنجتن پاک میں سب میں نور ہے اور وہ سب باطنی دیدار کر سکتے ہیں، تو اگر یعقوبؑ نے امامت کا اختیار یوسفؑ کو دیا تو پھر بھی یعقوبؑ کو امام کا رُوحانی دیدار کیوں نہیں ہوا؟ یہ بہت بڑا سوال ہے اور یہ ایسا سوال ہے کہ اِس کا جواب بہت ہی سخت اور بہت ہی مشکل ہے لیکن میں نے جس طرح یہاں حل کرنے کے لئے کوشش کی ہے یا ایک لحاظ سے کہا جائے کہ میں نے حل کیا ہے تو اُس کو دیکھا جائے۔

جواب ''(الف): قانون دین کا ہو یا دُنیا کا، نبوت سے متعلّق ہو یا امامت کے بارے میں، ہر حالت میں وہ نہ صرف اٹل قواعد وضوابط پر مبنی ہوتا ہے، بلکہ ساتھ ہی ساتھ اِس میں خصوصی حالات اور مستثنیات کا لحاظ بھی رکھا جاتا ہے''، یعنی یہ کہا گیا ہے کہ قانون میں [یعنی] ہر قانون میں (Exceptional Cases) بھی ہوتے ہیں، کوئی بھی قانون ہو ایسا نہیں کہ [وہ] ٹھوس نہیں ہوتا ہے، سخت اور خشک نہیں ہوتا ہے۔ اُس میں ایک طرح سے لچک ہوتی ہے کہ حالات اور واقعات کا جو بھی تقاضا ہو اُس تقاضے کو پورا کرنے کے لئے اُس میں گنجائش ہوتی ہے۔ یہ پہلا نکتہ ہے، اگرچہ قانون کا اکثر حصّہ اُن

اصولات کا(Collection) ہوتا ہے جو کہ اٹل اُصولات ہیں لیکن اِس کے ساتھ ساتھ اُس کے اندر مستثنیات بھی ہوتے ہیں (Exceptional cases) بھی ہوتے ہیں ۔''تا کہ بوقتِ منشاء اور ہنگامِ ضرورت کوئی حرج وتنگی نہ ہو، اور دینِ حق میں اِس حقیقت کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں'' ۔اب مثال پیش کی جاتی ہے کہ دین میں ایسی کون سی مثال ہے جس کو ہم (Exceptional case) کے طور پر قبول کریں اب اُس کے لئے ''چنانچہ عام طور پر دیکھا جائے تو ہر پیغمبرِ ناطق کے ساتھ صرف ایک ہی اساس ہونے کا تصوّر ملتا ہے'' ۔اساس معنی جس طرح کہ آنحضرتؐ کے زمانے میں علیؑ تھے اساس، تو سوال ہے کہ عام طور پر دیکھا جائے تو ہر ناطق پیغمبر کے زمانے میں ایک ہی اساس ہوتا ہے ۔''مگر حضرت ابراھیمؑ کے اساس دو تھے'' یہ(Exceptional case) ہوگیا ''یعنی اساسِ مستقر حضرتِ اسماعیلؑ اور اساسِ مستودع حضرتِ اسحاقؑ دُوسری مثال یہ کہ زمانے میں ایک ہی امام ہُوا کرتا ہے لیکن بعض دفعہ مستقر اور مستودع دو دو امام بھی ہوئے ہیں'' ۔آپ کے لئے شاید یہ نئی بات ہو ۔''جس طرح حضرت ابراہیم خلیل اللہؑ کی پاک نسل میں امامت کے مذکورہ دو سلسلے چلتے آئے'' ۔ امامت کا ایک سلسلہ اسماعیلؑ سے اور دُوسرا سلسلہ اسحاقؑ سے ''یہاں تک کہ حضورِ اکرمؐ کا زمانہ آیا اور مولانا علیؑ کی ذاتِ گرامی میں دونوں قسم کی امامتیں ایک ہوگئیں'' ۔

''(ب): اسی طرح یہ بالکل دُرست ہے کہ اُصولی طور پر ہمیشہ نورِ امامت باپ سے بیٹے میں منتقل ہوتا ہے'' ۔ باپ سے بیٹے میں منتقل ہوتا ہے اِس میں کوئی شک نہیں ''لیکن جیسا کہ ہم اُو پر عرض کر چکے ہیں اِس میں کچھ مستثنیات بھی ہیں'' ۔اِس میں بھی(Exceptional cases) ہیں ۔''جن کا علم تاریخِ امامت اور تصوّرِ امامت کی روشنی میں حاصل ہوسکتا ہے'' یعنی اُس کا(Knowledge) کہاں سے ملے گا امامت کی(History) سے اور امامت کے تصوّر سے ملے گا کہ باپ سے بیٹے میں جو نور منتقل ہوتا ہے اُس کے سوا بھی کوئی مثال ہے تو اِس کا پتا تواریخ سے اور تصورِ امامت سے چلتا ہے ۔''مثال کے طور پر اگر ہم مانیں کہ زمانۂ آدم کا پہلا اساس مولانا ہابیلؑ تھا اور اِس کی شہادت کے بعد مولانا شیثؑ اساس ہُوا'' ۔ ہابیل اور قابیل کا قصّہ آپ نے سنا ہے نا! تو اہلِ ظاہر تو یہ کہتے ہیں کہ یہ جو جھگڑا ہوا تھا وہ شادی کے سلسلے میں ہوا تھا لیکن گروہِ امامیہ کا یہ نظریہ ہے کہ اصل میں آدمؑ نے حضرتِ شیثؑ کو اپنا جانشین بنانا چاہا تھا یا کہ جانشین بنایا تھا، اساس بنایا تھا، یعنی امامت کی بنیاد کی حیثیت سے اُس کو مقرّر کیا تھا تو اِس پر قابیل کو حسد آگیا ۔کہا کہ یہ منصب مجھ کو ملنا چاہیئے تھا اور پھر قابیل نے مولانا ہابیلؑ کو شہید کر دیا، جب شہید کر دیا تو پھر وہاں جو منصب تھا وہ مولانا شیثؑ کو جو اُس کا بھائی تھا منتقل ہوگیا ۔ تو یہ مثال ہوئی سب سے پہلے بھائی سے بھائی کو امامت منتقل ہو جانے کی ۔ اِس کے علاوہ بھی مثالیں ہیں'' تو اِس صورت میں ہمیں یہ بھی قبول کرنا ہوگا کہ نورِ امامت کبھی کبھار بھائی سے بھائی کو منتقل ہوسکتا ہے ۔ اِس سلسلے میں ہمیں زمانۂ موسیٰؑ کے اساس مولانا ہارونؑ اور اِس کے جانشین مولانا یوشع بن نونؑ کے جسمانی رشتے پر بھی غور کرنا چاہیئے ۔ نیز عہدِ عیسیٰؑ کے

اساسِ اوّل مولانا یحییٰؑ اور اساسِ دوم مولانا شمعونؑ کے بارے میں بھی خوب سوچنا ہوگا کہ اِن مقدّس ہستیوں کے آپس میں کیا رشتہ تھا، اِس بیان سے یہ واضح کرنا مقصود ہے کہ نورِ امامت کے اٹل قانون میں بھی دُوسرے قوانین کی طرح کچھ مستثنا واقعات ہُوا کرتے ہیں، تا کہ اللہ کے دین میں لوگوں کے لئے رحمت ہی رحمت مہیّا رہے اور اُن کو کسی قسم کی مایوسی نہ ہو۔"

"(ج): جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ نورِ نبوّت و امامت باطن کے باطن میں ایک ہونے کے باوجود بمقتضائے زمان و مکان مختلف درجات اور جُدا جُدا حیثیتوں میں ظہور پذیر ہوتا ہے"۔ امامت کا نور اور نبوت کا نور باطن میں نہیں باطن کے باطن میں ایک ہے، پر ظاہری طور پر اِس کے ظہورات الگ الگ حیثیتوں میں ہوتے ہیں، یہی نور کبھی پیغمبر کے رُوپ میں، کبھی امام کے رُوپ میں اور پیغمبر کے رُوپ میں بھی ایک جیسا نہیں، کبھی کسی حیثیت میں اور کبھی کسی درجے میں، کبھی کسی درجے میں [ہے] اور امامت کی صورت میں بھی ایک حیثیت میں نہیں مختلف درجوں میں اِس نور کا ظہور ہوتا ہے۔ کیوں؟ اِس لئے "یہی وجہ ہے کہ امامت کے کئی درجات ہُوا کرتے ہیں جیسے، امامِ مقیم، امامِ اساس، امامِ مُتم، امامِ مستقر اور امامِ مستودع تا کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایتِ کاملہ کے ظاہری اور باطنی وسائل ہمیشہ مہیّا رہیں اور زمانے کو امامِ عالی مقام کی جس مرتبت کی ضرورت ہو اسی مرتبت میں امامِ برحق کارِ ہدایت کو انجام دیں۔"

"(د): اِس مطلب کی دُوسری وضاحت یُوں ہے کہ امام مَلَکی اور بشری دونوں صفات کا مالک ہُوا کرتا ہے"۔ یعنی امام میں فرشتے کی صفات بھی ہیں اور انسانِ کامل کے اوصاف بھی ہیں دونوں ہیں. بہت اچھی بات ہے۔ "اِس مطلب کی دُوسری وضاحت یوں ہے کہ امامِ مَلَکی اور بشری دونوں صفات کا مالک ہوا کرتا ہے۔" مَلَکی معنی فرشتے کی صفت یعنی وہ بیک وقت فرشتۂ عظیم بھی ہے اور انسانِ کامل بھی، یہ صاف بات ہے، "یعنی وہ بیک وقت فرشتۂ عظیم بھی ہے اور انسانِ کامل بھی" یعنی نور کے لحاظ سے فرشتۂ عظیم ہے اور جسم کے لحاظ سے انسانِ کامل ہے" تا کہ وہ عملی طور پر ناسوت سے ملکوت کی طرف لوگوں کی ہدایت و رہنمائی کر سکے"۔ کتنی اچھی بات ہے، بہت اچھی مثال ہے۔ ایک نہر ہے، اُس نہر سے چھوٹے چھوٹے بچّوں کو اور کمزوروں کو پار گزارنا ہے اُس نہر پر کوئی پُل نہیں ہے، ایک طاقتور جوان کیا کرتا ہے نہر کے اُوپر کھڑا ہوتا ہے اُس کا ایک پاؤں اُس طرف اور ایک پاؤں اِس طرف ہوتا ہے اور وہ بالکل نہر کے اُوپر کھڑا ہوتا ہے، کیوں ایسا ہوتا ہے؟ اِن بچّوں کو ایسا نہ کرے تو اِن کو پھینکنا تو نہیں ہے اور آرام آرام سے اُس طرف گزارنا ہے۔

جس عالم میں ہم رہتے ہیں اِس عالم کا نام ناسوت ہے، ناس عربی میں لوگوں کو کہتے ہیں اور ناسوت اُس عالم کو کہتے ہیں جس میں لوگ ہیں اور دُوسرا عالم جس میں فرشتے ہیں اُس کو کہتے ہیں ملکوت۔ امام میں دونوں صفات ہونی چاہئیں کیونکہ لوگوں کو ناسوت سے ملکوت میں پہنچانا ہے، اگر امام صرف فرشتہ ہو اور ملکوت میں رہے تو اُس طرف رہے گا اِس طرف کو نہیں پہنچے گا اور اگر امام اپنے اندر سب بشری صفات رکھیں اور صرف ایک انسان ہو فرشتہ نہ ہو تو اِس طرف رہے گا، پھر

اِس صورت میں [امام] لوگوں کی رہنمائی اور ہدایت کس طرح کریں گے؟ اِس لئے اُس کو دونوں پر حاوی ہونا ہے عالمِ ملکوت پر بھی اور عالمِ ناسوت پر بھی۔ جس طرح میں نے ایک چھوٹی سی نہر سے اور کچھ بچّوں سے اور ایک کامل اور مکمّل ایک جوان سے اِس مطلب کی تشبیہہ دی۔ تو امام اِس لئے ایک طرف سے فرشتگی کی صفات رکھتے ہیں اور دُوسری طرف سے انسانیت کے اوصاف رکھتے ہیں تا کہ لوگوں کو عالمِ ناسوت سے عالمِ ملکوت پہنچائیں، اِس معنی میں وہ عالمِ ناسوت پر بھی اور عالمِ ملکوت پر بھی دونوں پر حاوی اور محیط ہیں۔

''اِس سلسلے میں چونکہ لوگ ایک سطح کے نہیں'' دیکھیں کتنی اچھی بات ہے جس طرح امام کو فرشتوں کی صفات رکھنی چاہیئے اور انسانوں کی صفات دونوں [کی] صفات رکھنی چاہئیں لیکن کیا کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ انسان اکٹھے ہیں اور ایک درجے میں ہیں۔ اگر انسان ایک درجے میں اکٹھے نہیں ہیں اور مختلف ہیں تو امام کے اندر مختلف صفات ہونی چاہئیں، زمانے کے لحاظ سے بھی اور بیک وقت بھی امام کے اندر بہت سی صفات ہونی چاہئیں تا کہ اِن مختلف صفات سے سب آدمیوں کو (Cover) کر سکے اور زمانے کے لحاظ سے یہ کہ یعنی امام کے درجات کو میں نے بیان کیا کبھی کسی درجے میں، کبھی کسی درجے میں، کبھی کسی درجے میں وہ زمانے کے لحاظ سے امام کے اندر مختلف درجات ہو گئے اور شخصیت کے لحاظ سے بھی دیکھا جائے تو امام کے اندر بشریت کا ایک عنصر نہیں بہت سے عناصر ہونے چاہئیں تا کہ اِن مختلف عناصر سے بہت سے لوگوں کو (Cover) کر سکے اور اُن کو ہدایت دے سکے اور امام میں یہ بات ہے۔ امام میں دیکھیں، سوچیں ہر امام میں بہت سی صفات ہیں، بہت سی صفات ہیں، وہ امام ہیں، پیغمبر کے جانشین ہیں، وہ ہمارے رُوحانی ماں باپ ہیں اور وہ ہمارے رہنما ہیں اور وہ ایک سیاست دان بھی ہو سکتے ہیں، وہ ایک ڈاکٹر بھی ہو سکتے ہیں، وہ ایک مشورہ دینے والے دوست بھی ہو سکتے ہیں تو یہ اُس کے مختلف عناصر ہیں، حتیٰ کہ اُس کی ایک نورانی فیملی بھی ہے وہ ایک گھر کا مالک ہے، تو یہ [اوصاف] ہونے چاہئیں تا کہ اِس سے اور اِن مختلف عناصر سے وہ مختلف سطحوں کے انسانوں کو ہدایت پہنچا سکیں اور اُن کی دستگیری اور رہنمائی کر سکیں۔ ''اِس سلسلے میں چونکہ لوگ ایک سطح کے نہیں یعنی اُن کی دینی صلاحیتیں مختلف قسم کی ہوتی ہیں، اِس لئے امامِ برحق اپنی عملی ہدایت و رہنمائی میں نہ صرف جسمانی مشکلات پر قابو پانے کی مثالیں پیش کرتا ہے، بلکہ اِس کے ساتھ ساتھ وہ اپنے نمونۂ عمل سے یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ رُوحانی دشواریوں کے آنے پر مومن کو کیا کرنا چاہیئے، تا کہ مومنین کی ظاہری و باطنی زندگی کا کوئی گوشہ ہدایتِ کاملہ کی روشنی کے بغیر نہ رہے۔''

اب یعقوبؑ کی بات آتی ہے کہ تمام اماموں میں سے یا پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر ایسا کیوں ہوا کہ وہ بیٹے کے لئے رویا کرتا تھا، کیا اِس کے پس منظر میں کچھ حکمت ہے یا وہ محض جسمانی طور پر اپنے بیٹے کے لئے روتا تھا۔ میں نے ''سوسوال'' میں تاویل کو اُجاگر کرنے کے لئے یہ کہا ہے کہ اگر باپ اپنے بیٹے کے لئے روتا تھا تو پھر یہ کیا ہدایت

ہوگئی کہ بیٹا جدا ہوگیا تو باپ یعنی پیغمبر رونے لگا، پیغمبر اگر بیٹے کے لئے روتا تو ہم اِس سے زیادہ روئیں گے، اپنے بیٹے کے انتقال پر، اپنے بیٹے کی جدائی پر، اپنے بیٹے کے دُور ہونے پر ہم پیغمبر سے زیادہ روئیں گے ہم زیادہ جسمانی ہیں، بجائے اِس کے کہ وہ ہمارے لئے کوئی نمونۂ ہدایت پیش کرے کیوں بیٹے کے لئے روئے اور بیٹے کے [لئے] رونے کی کیا وجہ ہے آخر کوئی وجہ ہے، تو اِس میں وجہ ہے اور وہ حکمت ہے۔ آپ اِس سوال سے متعلق جو ''سو سوال'' میں بیان ہے اُس کو پڑھیں [سوال نمبر: ۸۹، یُوسف کا کُرتا صفحہ ۱۶۷۔۱۶۹]۔ کہا گیا کہ امام کے مختلف مرتبے اِس لئے ہیں کہ مختلف حالات میں وہ لوگوں کی رہنمائی کرسکیں۔

''(ھ): مذکورۂ بالا حقائق کی روشنی میں اب یہ سمجھ لینا ہمارے لئے بالکل آسان ہوگیا کہ پنجتن پاک صلوات اللہ علیہم کی مثال میں حضرت محمد مصطفیٰؐ ناطق تھے، علیؑ اساس، حسنؑ امامِ مستودع، حسینؑ امامِ مستقر اور فاطمہؑ زہرا پیغمبرِ اکرمؐ کے حجتوں میں سے تھیں، کہ ناطق کے حجّت عظیم ہوا کرتے ہیں، اور خاص کر آنحضرتؐ کے حجّت سب سے عظیم تھے، چنانچہ حضورؐ کا پہلا حجّت (یعنی باب) اساس تھا یعنی علیؑ، دُوسرا حجّت امام حسنؑ، تیسرا امام حسینؑ اور چوتھی حجّت فاطمہؑ زہراؑ۔ اس سے ظاہر ہے کہ حضراتِ پنجتن نور کے مرکز تھے۔''

''(و): امامِ اقدس و اطہر سراپا نورِ ہدایت ہوتا ہے، لہٰذا اُس کی رُوحانی اور جسمانی زندگی کی ہر مثال ہدایت و رہنمائی کی حکمتوں اور مصلحتوں سے بھرپور ہُوا کرتی ہے''۔ یعنی امام کی ہر چیز میں ہر بات میں ہر قول میں اور ہر عمل میں ہدایت ہی ہدایت ہے، اِس سلسلے میں حضرت یعقوبؑ [کی مثال] میں بھی ہدایت ہے۔ ''چنانچہ حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کے قرآنی قصّے میں رُوحانیت اور امام شناسی کی بہت سی حکمتیں پوشیدہ ہیں، سو پہلی حکمت یہ ہے کہ امامِ عالی مقام کے ازلی و ابدی نور کا حقیقت میں نہ تو کوئی باپ ہے اور نہ ہی کوئی بیٹا''، امام کے نورکا نہ تو کوئی باپ ہے اور نہ کوئی بیٹا۔ امام کا ازلی نور حقیقت میں نہ کوئی باپ رکھتا ہے نہ کوئی بیٹا ''لیکن اِس حقیقت کے باوجود نورِ ازل کے ظہوراتِ رُوحانی انتہائی عجیب وغریب اور بڑے حیرت انگیز ہُوا کرتے ہیں''، ابھی ہم رُوحانیت کی باتیں کرتے ہیں، یہ حقیقت ہے کہ نور کا کوئی بیٹا نہیں کوئی باپ نہیں لیکن اِس کے باوجود اِس کے جو ظہورات ہیں جو جلوے ہیں جو تجلیات ہیں وہ بہت عجیب وغریب ہیں۔ ''چنانچہ یہ اِس کے گوناگون جلوؤں میں سے ہے کہ وہ کبھی تو امام کے والدِ بزرگوار کی بے پناہ شفقتوں کی صورت میں اور کبھی اِس کے فرزندِ دلبند کی مسرّت بخش محبّتوں کی شکل میں جلوہ نما ہوجاتا ہے''۔ یعنی امام میں جو نور ہوتا ہے اُس نور کے مختلف رُوپ ہوتے ہیں یا کہ اُس کے مختلف ظہورات ہوتے ہیں، کبھی وہ نور باپ کی حیثیت سے ظاہر ہوتا ہے رُوحانیت میں، کبھی وہ بیٹا بن کے ظاہر ہوتا ہے، کبھی امام کی خودی بن کے ''انا'' بن کے وہ ظاہر ہوتا ہے، کبھی پیغمبر بن کے ظاہر ہوتا ہے اور کبھی خدا بن کے ظاہر ہوتا ہے، سب حقیقتیں اُس میں صحیح ہیں، چونکہ وہ جامع ہے۔

جامع چیز میں یہ سب پہلو ہوتے ہیں۔نگینہ آپ نے دیکھا ہے تراشا ہوا نگینہ یعنی لعل، روبی اور ایسا کوئی ڈائمنڈ، اُس کے مختلف پہلو ہیں، ہر پہلو سے ایک جھلک نظر آتی ہے تو اِس طرح نور کے مختلف پہلو ہیں وہ بہت سی حقیقتوں کو نور (Cover) کرسکتا ہے، وہ کہہ سکتا ہے کہ میں تمہارا باپ ہوں کیونکہ نور باپ سے ہو کر آتا ہے، وہ کہہ سکتا ہے کہ میں تمہارا بیٹا ہوں کیونکہ یہی نور بیٹے میں منتقل ہوتا ہے، وہ بتا سکتا ہے کہ میں تم ہوں کیونکہ یہ نور امام کا ہے، وہ کہہ سکتا ہے میں پیغمبر اور علی کا نور ہوں، خدا کا نور ہوں اِس نور میں، وہ کہہ سکتا ہے کہ میں قرآن کا نور ہوں، وہ کہہ سکتا ہے کہ میں حقیقتِ واحدہ ہوں، وہ کہہ سکتا ہے کہ میں مومنین کا نور ہوں۔آپ کو قرآن میں یہ باتیں ملیں گی، کوئی بات قرآن کے بغیر نہیں ہے مومنین بھی ہیں وہ اُس نور کے اندر، ابھی میں نے کہا کہ حقیقتِ واحدہ کا کیا مطلب ہے؟ امام کہتا ہے کہ تم میرے خیالات میں ہو میری آنکھوں میں ہو مومنین میری آنکھوں میں ہیں، مُرادتم میرے نور میں ہو یعنی تمہاری زندگی کا ایک سرا اِس نور میں ہے جو امام کی پیشانی میں ہے۔دُنیا میں جتنی کرنیں پھیلی ہوئی ہیں اِن کا ایک سنگم ہے جو سورج ہے، دُنیا میں تو کرنیں پھیلی ہوئی ہیں اور جب اُوپر سے اُوپر جائیں گے تو یہ کرنیں ایسے (Close) ہوتی جائیں گی یہاں تک کہ سورج کے سرچشمے میں ایک ہیں۔ابھی میں نے بات کی کہ ہم اُس نور میں ایک ہیں، زندگی کا وہ سرا وہاں ہے تو اِس لئے وہ جو نور ہے وہ بہت سی حقیقتوں کو (Interpret) کرسکتا ہے ترجمانی کرسکتا ہے تو پھر یعنی کیا مشکل ہے کہ نور کہے کہ میں تمہارا باپ ہوں، تیرا بیٹا ہوں میں تو خود ہوں، میں وہی بات کر رہا ہوں۔میں دوبارہ کہتا ہوں ''نور کا نہ تو کوئی باپ ہے نہ کوئی بیٹا لیکن اِس کے باوجود نورِ ازل کے ظہوراتِ رُوحانی انتہائی عجیب وغریب اور بڑے حیرت انگیز ہُوا کرتے ہیں۔چنانچہ یہ اِس کے گوناگون جلوؤں میں سے ہے کہ وہ کبھی تو امام کے والدِ بزرگوار کی بے پناہ شفقتوں کی صورت میں ہے اور کبھی اُس کے فرزندِ دلبند کی مسرّت بخش محبّتوں کی شکل میں جلوہ نما ہو جاتا ہے، چنانچہ شروع ہی سے حضرت یعقوبؑ کو حضرت یوسفؑ سے جو بے پناہ محبّت تھی وہ دراصل دُنیاوی نہیں بلکہ نور کی وجہ سے دینی اور حقیقی محبّت تھی، کیونکہ حضرت یعقوبؑ کی مبارک پیشانی میں'' ماتھے میں ''جو امامت کا مقدّس نور جلوہ گر تھا وہ اپنی معنوی جامعیّت وہمہ گیری کے سلسلے میں جہاں دُوسری بہت سی حقیقتوں کا انکشاف واظہار کرتا تھا، وہاں وہ یہ بھی فرمایا کرتا تھا کہ وہ نور جو پیشانی میں بول رہا ہے خود اُس کا بیٹا یوسفؑ ہے'' اِس نور نے اُس سے کہا تھا کہ میں تمہارا بیٹا یوسفؑ ہوں۔''جس کے نتیجے میں یعقوبؑ اپنے بیٹے یوسفؑ کو ظاہر و باطن میں بے حد چاہتا تھا''۔تو مطلب اِس کا یہ ہوا کہ یعقوبؑ کا یوسفؑ کو چاہنا، امام کو چاہنا نور کو چاہنا تھا، جس طرح ہم پر فرض کیا گیا ہے کہ تم امام سے محبّت کرو اور اِس طرح امام یعنی یعقوبؑ یوسفؑ کو چاہتا تھا چونکہ امامت جو ہے وہ بہت پہلے منتقل ہو چکی تھی بیٹے کی طرف آئی تھی۔

''(ز): دُوسری حکمت یہ ہے کہ اگرچہ امرِ امامت (یعنی اختیار) عام طور پر امامِ سابق کی زندگی کے آخری لمحات

میں منتقل ہو جاتا ہے۔ لیکن کبھی کبھار زمانے کا امام کسی اہم خدائی مصلحت کی بناء پر وقت سے پہلے بھی اپنے بیٹے کو عملی طور پر جانشین بنا سکتا ہے، جس کی ایک نمایاں مثال حضرت یوسفؑ ہے، چنانچہ مرکزِ نور کی اِس منتقلی کے بعد اگرچہ حضرت یعقوبؑ کا باطن کاملاً منوّر اور روشن تھا، تاہم عرصۂ دراز تک امام کا سب سے بڑا دیدار نہیں ہو رہا تھا لیکن مسلسل گریہ وزاری اور پُرکشش مقناطیسی یادوں کے وسیلے سے ایک دن یہ مبارک دیدار بھی حاصل ہو گیا اور اِس عظیم واقعہ میں ایسے تمام مومنین کے لئے نمونۂ عمل اور مکمّل ہدایت موجود ہے، جن کو ابھی تک امامِ زمانؑ کا رُوحانی دیدار نہیں ہُوا ہے یا جنہیں دیدار ہو رہا ہے یا دیدار ہونے کے بعد پھر اِس میں بڑی حد تک کمی واقع ہوئی ہے، کہ وہ دیدارِ باطن کو کوئی معمولی اور آسان کام تصوّر نہ کریں"۔

جہاں یعقوبؑ اپنے بیٹے یوسفؑ کے لئے روتا نظر آتا ہے تو اُس میں مومنین کے لئے، تین قسم کے مومنین کے لئے مثال (Example) ہے۔ (۱): پہلے اُن کے لئے ہے جن کو دیدار نہیں ہوا کہ وہ اِس کو آسان کام نہ سمجھیں۔ (۲): دُوسرا اُن کے لئے مثال ہے جن کو دیدار ہو رہا ہے کہ وہ اِس کو ایسا نہ سمجھیں کہ بس یہ دیدار اُن کے نام پر ہو گیا اور ہمیشہ وہ دیدار کرتے رہیں گے اور (۳): تیسری مثال اُن کے لئے ہے جو کہ دیدار ہونے کے بعد اُن کے دیدار میں کمی واقع ہوئی ہے۔ پہلے گروہ کو زیادہ کوشش کرنے کے لئے، دُوسرے گروہ کو ناشکری نہ کرنے کے لئے اور تیسرے گروہ کو دوبارہ کوشش کرنے کے لئے ہے کہ وہ مایوس نہ ہو جائیں یہ سب مثالیں یعقوبؑ میں ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ امام سے کس طرح اور کس درجے کی، کس حد کی محبّت کرنی چاہئے وہ مثال یعقوبؑ میں ہے اور کتنی اچھی بات ہے جہاں دُوسرے لوگ نہیں سمجھتے ہیں کہتے ہیں کہ اپنے بیٹے کے لئے رویا کرتے تھے، تو بابا! پیغمبر اپنے بیٹے کے لئے اِس قدر روئے تو ہم بچارے کہاں جائیں گے اور ہمارا کیا حشر ہو گا پھر کون ہے جو ہم کو ہدایت کرے؟ پیغمبر اور امام اپنے بیٹے کے ساتھ مصروف رہے تو ہماری ہدایت کون کرے گا اور ہم کو (Example) کون دے گا؟ کتنا بڑا فرق پایا جاتا ہے اُن کے تصوّر میں اور ہمارے تصوّر میں۔" کہ وہ دیدارِ باطن کو کوئی معمولی اور آسان کام تصوّر نہ کریں، نہ دیدار کے بعد سُست اور ناشکر گزار ہو جائیں اور نہ ہی کمی واقع ہونے پر مایوس ہو بیٹھیں یہ مثال ہے۔"

"(ح): تیسری حکمت یہ ہے کہ ہم جیسے عقل کے بیچارے اکثر یہ گمان کئے ہوئے بیٹھے ہیں کہ بس ذرا سی کوشش سے دیدار حاصل ہو گا، لیکن حضرت یعقوبؑ کا یہ پُرحکمت واقعہ زبانِ حال سے ہمارے اِس ناچیز گمان کی بڑی سختی کے ساتھ تردید کرتا ہے اور صورتِ حال کے رمز وکنایہ سے اِس بات کا تاکیدی حکم دیتا ہے کہ اگر تم کو واقعاً امامِ عالی صفات کے دیدارِ باطن کی لاتعداد برکتوں اور سعادتوں سے سرفراز ہو جانا مقصود ہے تو تم اپنے دل میں امامِ زمان علیہ السّلام کی وہ انتہائی شدید اور کامیاب ترین محبّت پیدا کرو، جو حضرت یعقوبؑ کے سینۂ صافی میں موجزن تھی، کیونکہ اُسی پاک و پاکیزہ محبت نے اخلاص وعقیدت اور احترام و ادب سے حضرتِ یوسفؑ کے پاکیزہ دامن دل کو مضبوطی سے تھام لیا۔ کیونکہ اسی

پاک و پاکیزہ محبت نے اخلاص وعقیدت اور احترام و ادب سے حضرت یوسفؑ کے دامن دل کو مضبوطی سے تھام لیا اور نہیں چھوڑا تا آنکہ وہ اُسے کشان کشان یعقوبِ حزین سے ملا دینے میں کامیاب ہوگئی۔''

''(ط): اِس مقام پر اشتیاقِ دیدار کے بھرپور جذبات رکھنے والے مومنین کو خوب سنجیدگی سے سوچنا چاہئے کہ انسانیت، اخلاق اور مذہب کے اِس درجۂ کمال پر عصمت، طہارت اور پاکیزگی کی اِس شان کے ساتھ، اور عظمت، بزرگی، قدر اور منزلت کی اتنی رفعت و بلندی حاصل ہونے کے باوجود یہ کیونکر ضروری ہُوا کہ حضرت یعقوبؑ جیسا ایک انسانِ کامل دیدارِ باطن کے لئے ابرِ نوبہار کی طرح زار زار رویا کرے اور بار بار خونِ جگر کے آنسو بہائے۔ آپ نتیجے کے طور پر یقیناً اِس حقیقت کو قبول کرلیں گے کہ پیغمبر اور امام کی مرتبت کے ایک کامل انسان کی طرف سے انتہائی سخت ریاضت تحلیل نفس اور شوقِ دیدار کا یہ نمونہ پیش کرنا اور وہ بھی کسی اور طریقے سے نہیں بلکہ قرآنِ کریم کے توسّط سے اِس لئے ضروری ہوا کہ سمجھنے والے دیدارِ مقدّس کی قدر و قیمت کا خود بخود اندازہ کریں کہ اِس کے حصول کے لئے کیسی اور کتنی عظیم قربانیوں کی ضرورت ہے، تاکہ وہ اسی معیار کے مطابق علم و عمل کا فریضہ انجام دیں۔'' یہاں پر یہ جوابات ختم ہوجاتے ہیں۔ اب اِس سلسلے میں اگر آپ نے کوئی ضروری بات یا ضروری سوال نوٹ کرلیا ہے تو وہ بتائیں۔

..... ظاہر میں جس (Stage) سے ہم گزرتے ہیں وہ ہمارے سامنے واضح ہے ہم اُس کو جانتے ہیں سمجھتے ہیں، لہٰذا اِس کی مذمّت کرنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن میں نے مثال دی نا! کہ ظاہر میں بھی اگر کوئی بات کو سمجھ نہ لیا جائے، جیسے بچّے کی مثال میں معلوم نہیں شہروں میں کیا ہوتا ہے، بعض دیہاتوں میں مائیں اپنے بچّوں کو دودھ چھڑانے کے لئے طرح طرح کی باتیں کرتیں ہیں۔ مجھے یہاں کی کسی زبان سے کوئی روایتی مثال یاد نہیں ہے، بہرحال بحیثیتِ مجموعی یہ کہ ظاہر ہے کہ عورت اپنے پستان پر کوئی کالک لگاتی ہے اور بعض دفعہ تھوڑی سی ہلکی سی، زیادہ نہیں، ہلکی سی مرچ بھی لگاتی ہوگی یا کوئی کڑوی چیز تو اِس میں یعنی خیر خواہی، بھلائی اور ترقّی مقصود ہوتی ہے اور مذمّت [کا مطلب] ایسا نہیں کہ بنیاد سے اُس چیز کو بُری قرار دی جائے اور دیکھا جائے کہ مذمّت کی قسمیں ہیں اور بُت فارسی لفظ ہے، بُت معشوق کو کہتے ہیں، پیارے کو کہتے ہیں اور دین ہو یا دُنیا بعض چیزیں ایسی ہیں کہ ایک پہلو سے اچھی ہیں پھر دُوسرے پہلو سے بُری ہیں، بُت پرستی مِن کُلِّ الْوُجُوہ بُری چیز نہیں ہے۔ جس پہلو سے بھی بُرا ہونا چاہئے وہ پہلو بھی ایک لحاظ سے اچھا ہے، وہ کیوں؟ مذہب کی تواریخ کو دیکھیں سب سے پہلے بُت پرستی آپ کو ملے گی، بُت پرستی کا تصوّر نہ ہوتا تو پھر خدا پرستی نہ ہوتی۔ یہ غالباً مولانا سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ کی ایک مقدّس کتاب میں ہے [اسلام میرے مورثوں کا مذہب، ص: ۳]، سب سے پہلے دُنیا میں جب اَصنام پرستی نے، بُت پرستی نے جب جنم لیا تو اُس نے انسان کو یہ ایک تصوّر عطا کیا [یعنی] اپنے سے کسی برتر ہستی کو ماننے کے لئے۔ یہ مذہبی تعلیمات کے سلسلے میں قاعدے یا کہ (Primar) کی حیثیت سے تھی بُت پرستی، جس

نے [یعنی] بُت پرستی نے پھر توحید پرستی کو جنم دیا اور توحید پرستی نے، توحید پرستی کے مختلف نظریات کو جنم دیا اور کرتے کرتے اِس میں ایک ارتقاء پیدا ہوگیا پھر ایک شخص کی خدائی کے لئے اقرار کیا گیا، یہاں تک کہ آخری درجے میں مونو ریالزم کا تصوّر آگیا، اِس لئے یہ تو یعنی اپنے مقام پر جہاں کہ اِس کی ضرورت ہے وہاں اِس پہ آپ روشنی ڈالیں گے تو آپ کو اِس سے بہت مفید باتیں [سمجھ میں آئینگی]، میرے خیال میں امامؑ نے اِس پر بُت پرستی پر روشنی ڈالی ہے۔ ''اسلام میرے مورثوں کا مذہب'' جو ایک چھوٹی سی بہت پیاری سی کتاب ہے، جو ''آپ بیتی'' سے الگ کرکے چھاپی گئی ہے، اُس کے اندر مولانا سلطان محمد شاہ صلوات اللہ علیہ توجیہہ کرتے ہیں کہ مذہب کا ارتقاء کس طرح ہوا اور کہاں سے مذہب کا تصوّر ہوا۔

دُوسری بات رُوحانیت کے درجات میں، آپ نے جو فرمایا کہ یہ تو ممکن نہیں ہے کہ ہر شخص بالکل ایک ہی رفتار سے آگے سے آگے بڑھے۔ دیکھئے! اگر ایک مومن کسی ایک مقام کو پہنچا ہے اور اُس کو خدا کا کوئی درجہ قرار دیتا ہے اور اپنی ترقّی کی کوئی منزل قرار دیتا ہے اور اُس کے آگے جانے کے لئے وہ نہیں سمجھتا ہے، نہیں سوچتا ہے تو [یہ] ٹھیک ہے اُس کے نزدیک، تو اُس پر اِس کا اطلاق نہیں ہوتا ہے، اطلاق اُس پر ہوتا ہے جس میں صلاحیت ہے اور جو آگے بڑھ سکتا ہے۔ اچھی سے اچھی غذا اُس کے لئے [یعنی] اُس مہمان کے لئے لائی جاتی ہے جو کہ وہ کھانوں کو نظر میں نہیں لاتا ہے، چونکہ وہ جانتا ہے کہ میزبان کے پاس ایک ایسی چیز ہے جو اِس سے اعلیٰ ہے اب اِس [غذا] کو نہیں کھانا چاہئے اور جس کو خبر نہیں ہے کہ اُس کے آگے کوئی چیز ہے تو اُس کو شکر گزاری کے ساتھ بڑے شوق کے ساتھ کھانا چاہئے، تو جو میزبان ہے دونوں قسم کے مہمانوں کی قدر کرے گا اِس [مہمان] کے لئے اِس لئے قدر کرے گا کہ اِس نے تو سب چیز کو کھالیا یعنی قدر دانی کے ساتھ اور دُوسرے [مہمان] کے لئے اِس لئے قدر کرے گا کہ یہ تو سمجھتا ہے کہ میزبان کی دولت کو اُس کی نعمت کو اور اُس کی قوت کو سمجھتا ہے اور اُس پر بھروسہ رکھتا ہے، تو دونوں جو ہیں وہ لائقِ تحسین ہیں، اچھے ہیں، پر ہونا یہ چاہئے کہ آگے سے آگے جایا جائے۔

اِس بُت پرستی کا اطلاق اُن پر نہیں ہوتا ہے جو ایک درجے کو مانتے ہیں [اور] تسلیم کرتے ہیں اور اُن کو اِس کے ساتھ شکر گزاری ہے لیکن جن کو قوت [ملی] ہے، جن کو صلاحیت [ملی] ہے، کہ واقعاً اُس درجے کو بُت قرار دیں اور پھر یعنی توحید کے لئے آگے جایا جائے تو اُن کے لئے یہ بات مفید ہے اور ہر حال میں ایک خدا کا جو تصوّر ہے اگر اُس کو ہم سامنے رکھتے ہیں اور پھر درجات کو مانتے ہیں تو ٹھیک ہے بُت پرستی ہے لیکن اِس معنی میں نہیں جیسا ہم سمجھتے ہیں، جس طرح کہ میں نے کہا کہ بُت پرستی کی اپنی جگہ پر بڑی اہمیت ہے اور ہونی چاہئے، دن کے ساتھ رات بھی ہونی چاہئے اور توحید پرستی سے پہلے بُت پرستی آنی چاہئے آخر میں بُت پرستی نہیں آنی چاہئے۔ اِس معنی میں [یہ] صحیح ہے۔

آپ اسماعیلی نظریات کو لیں تو جہاں توحید سے انہوں نے (Discuss) کیا ہے اُس میں بھی ایسی باتیں ہیں، ابھی میں نے بات کی [کہ] خدا کو پاک سمجھنا، خدا کو عیب سے پاک سمجھنا، یہ بہت کمزور بات ہے، خدا کو اوصاف کے ساتھ

ماننا یہ بہت کمزور بات ہے، خدا کو اوصاف سے برتر قرار دینا یہ اسماعیلیوں کے نزدیک توحید ہے اور اصلی توحید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ابھی میں مختصر بات کرتا ہوں، بالکل مختصر، اگر توحید سب سے اُوپر ہے تو پھر اِس کے جو نیچے درجات ہیں وہ توحید نہیں کہلائیں گے کیونکہ توحید کا ایک سینٹر ہے، توحید کا ایک (Top) ہے، اور جو توحید نہیں ہوگا تو پھر کیا ہوگا، توحید کا (Opposite) ہوگا، اور جو چیز توحید کا (Opposite) ہو اُس کا نام لازمی طور پر خدا کی زبان میں توحید کی زبان میں، توحید کے قانون میں بُت پرستی ہوگی، ایک بات یہ ختم ہوگئی لیکن مزید ایک وضاحت بھی ہے، بعض مقامات پر دیکھا جائے تو گمراہی کا اطلاق پیغمبر پر بھی ہوتا ہے۔ اِس پر بہت یعنی بحثیں ہوتی ہیں اور اِس میں سوال بھی پیدا ہوا وہ یہ کہ خدا نے قرآن میں فرمایا ہے کہ: وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى اور رستے سے ناواقف دیکھا تو سیدھا رستہ دکھایا (۹۳:۷)۔ اب اِس کو کس طرح سے لیں، یہ گمراہی ایسی نہیں ہے جس طرح ایک جاہل کی ہوتی ہے یا ایک بے دین کی ہوتی ہے، اِس سے مُراد یہ ہے کہ اُس وقت تجھ کو وحی اور نبوّت سے خبر نہیں تھی یہ پیغمبر سے فرمایا جاتا ہے اور تو گمراہ تھا تو خدا نے تجھ کو راستہ بتلایا، یہ ترجمہ بھی اِس طرح سے نہیں ہونا چاہئے [بلکہ یوں ہونا چاہیے] اور تو وحی اور کارِ نبوت سے بے خبر تھا لیکن خدا نے اُس تک تجھ کو پہنچایا۔ اِس کے معنی یوں ہونے چاہئیں اور ظاہر میں دیکھا جائے تو لفظِ گمراہی کا پیغمبر پر اطلاق ہوتا ہے۔ اسی طرح جو اُوپر سے اُوپر بُت پرستی جاتی ہے تو وہ ہلکی سے ہلکی ہوتی جاتی ہے اور جو نیچے سے نیچے آتی ہے تو بالکل ٹھوس اور بہت دُور کی گمراہی ہوتی ہے۔ لفظ میں تبدیلی نہیں ہوتی ہے، لفظ وہی رہتا ہے لیکن معنی میں دیکھیں تو اِس میں بہت فرق ہوتا ہے اِس لئے کہ توحید جو ہے اُس کا ایک خاص اعلیٰ مقام ہے یا کہ اس کی ایک اعلیٰ سطح ہے۔ تو میرے خیال میں ایک طرح سے اِس سوال کا جواب دیا گیا یہی کہنا کافی ہے کہ اگر توحید کے لئے ایک اسپیشل مقام ہے (Unity) کا یعنی [اس کا] اطلاق اُس مقام پر ہوتا ہے۔ تو اِس کے نیچے نیچے جو [مقام] ہیں اُن میں توحید کا لفظ یا تو کمزور سے کمزور تر ہوتا جائے گا یا یہ کہ وہ اُس اُوپر کی جو توحید [ہے] اِس کے ساتھ یہ (Opposite) ہوگا، جو (Opposite) ہوگا تو پھر لازمی طور پر اُن کو بُت پرستی کہا جائے گا لیکن ایسی بُت پرستی نہیں جس کی میں نے تشریح کی کہ گمراہی بھی ایک جیسی نہیں ہے ایک قسم کی گمراہی کا اطلاق پیغمبر پر بھی قرآن نے کیا ہے لیکن وہ گمراہی ایسی نہیں ہے جو عام قسم کی ہے بلکہ اُس پیغمبر کے اپنے مقام کے لحاظ سے ہے۔

ایک اور مزید وضاحت [یہ ہے کہ] کسی چیز کے پرکھنے کے لئے معیار ہوا کرتے ہیں، مثلاً لفظ دُوری اور نزدیکی کو لیجئے اِس کا کوئی تعیّن نہیں ہے، دُوری ہزاروں منزل کی بھی ہوسکتی ہے اور دو قدم کی بھی ہوسکتی ہے اور اِس طرح نزدیکی بھی۔ تو ہر لفظ کے اندر جو معنی ہیں اُن میں (Difference) ہے لیکن الفاظ میں چونکہ گنجائش نہیں ہے، الفاظ میں اتنی مجبوری ہے کہ جس طرح کہ کوئی چاہتا ہے کہ ایک کوزے میں ایک برتن میں، ایک مٹکے میں سب دریا بند کیا جائے تو یہ ناممکن بات ہے، کہ یعنی الفاظ جو ہوتے ہیں معنوں کے مقابلے میں چھوٹے چھوٹے برتن کی مثال پر ہیں، اُن میں سب معنی

آنہیں سکتے ہیں، اِس لئے مطلب اِس کا یہ ہوا کہ بے شک توحید کا ایک ہی مقام ہے اور وہ آخری مقام ہے اور اُس کے نیچے جو ہے وہ بُت پرستی ہے اور پھر دُوسری طرف سے میں نے بُت پرستی کے منظر کو اُس کے فائدے کو بھی میں نے بیان کیا۔ اسی کے ساتھ یہ سوال ختم ہو جائے گا۔

.....یہ بہت اچھا سوال ہے اِس لئے کہ یہ قرآن کا قصّہ ہے، آپ جانتے ہیں کہ قرآن کی جس آیت میں جو ظاہری معنی ہیں اُن کو ایک دم سے عقل آسانی سے قبول نہ کرے اور اُس کی کوئی توجیہہ یا کچھ تحقیق کرنے کے لئے اشارہ پایا جاتا ہو تو ایسی آیت فوراً متشابہ ہوتی ہے اور اُس کے پس منظر میں تاویل ہوتی ہے یہ آیت بھی اُن آیتوں میں سے ہے جو کہ تاویل طلب ہیں جس طرح کہ آپ نے توجیہہ کی، ظاہر میں دیکھا جائے تو یہ بات عجیب سی لگتی ہے کہ حضرت ابراھیمؑ کے باشعور ہونے تک یکا یک ایک ہی دن میں یہ خیال آیا ہو اور اُس عرصے تک کتنی دفعہ انہوں نے ستاروں کو دیکھا ہو گا، چاند کو، سورج کو اُس میں انہوں نے نہیں سوچا، دُوسری بات اِس میں ترتیب پائی جاتی ہے کہ کیوں یہ ضروری ہوا کہ سورج کو اور چاند کو چھوڑ کر سب سے پہلے ستارے پر غور کیا جائے۔ اگر کسی دُنیا کی شئ پر اِس کا شک ہوتا ہے یا توجہ ہوتی ہے کہ یہ خدا ہو سکتا ہے تو سب سے پہلے یہ مسئلہ اور یہ تصوّر سورج سے متعلّق ہونا چاہئے یا چاند سے متعلّق ہونا چاہئے، اِس میں ایک منظّم ترتیب کی بات ہے اور یہ ترتیب ظاہری طور پر دیکھا جائے تو دُرست نہیں ہوتی ہے بلکہ یہ ترتیب رُوحانیت میں صحیح ہے بالکل اِس لئے کہ رُوحانیت میں جو حدود ہیں وہ حدود اسی ترتیب سے سامنے آتے ہیں۔

سب سے پہلے ایک حد آتی ہے یا ایک درجہ آتا ہے جس کی تشبیہہ ستارے سے دی گئی ہے، اِس کے بعد اِس کے اُوپر کی حد آتی ہے جس کی تشبیہہ چاند سے دی گئی ہے، اِس کے بعد اُس کے اُوپر کا درجہ آتا ہے جس کی تشبیہہ سورج سے دی گئی ہے، لہٰذا یہ سورج، یہ چاند اور یہ ستارے رُوحانیت کے درجات ہیں اور اِن درجات سے ابراھیمؑ کے آگے گزر جانے کی بات ہے اور ظاہر میں، ایک پیغمبر کی حیثیت سے، ایک بچّے ہونے کی صورت میں بھی اور ایک نوجوان ہونے کی صورت میں بھی یہ بات زیب نہیں دیتی ہے کہ ابراھیمؑ نے ستارے کو خدا کہا ہو ظاہر میں، یہ بات صحیح ہے کہ یعنی رُوحانیت کے درجات جو عجائبات کے حامل ہیں اُن کو انہوں نے مالک اور صاحبِ قدرت مان لیا ہے یہ بات صحیح بھی ہے۔ تو یہاں پر سوال کا جواب ختم ہوتا ہے کہ اِس کا تعلّق تاویل سے ہے اور تاویل میں حدودِ دین سے آگے گزر جانے کی بات ہے۔

ٹائپنگ: اکبر علی پروف: نسرین اکبر